

میں نے

ظہار  
دوبتے دیگھا

صدیق سالک

مشرقی پاکستان جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جنگِ دیش بن گیا اپنے  
آخری دو برسوں میں پُر آشوب رہا۔ پہلے انتخابی مہم اور عام  
انتخابات کی گھاگھی رہی اور پھر فوجی کارروائی، خانہ جنگی اور  
پاک بھارت جنگ نے تہلکہ مچائے رکھا۔ اُن دنوں ہر  
روز تاریخ ایک نیا موڑ مڑ رہی تھی۔ اور اس کی ہر ساعت  
دل کی دھڑکنوں کو تیز کر رہی تھی۔ دلوں کی یہی دھڑکن  
اور لمحوں کی یہی کردٹ اس کتاب کا خمیر ہے۔ سقوط  
کی اس داستان کو مصنف کی ایمان داری اور بیباکی نے  
بھاری کوتاہیوں کی دستاویز بنا دیا ہے۔

صدیق سالک نے انگریزی ادبیات اور بین الاقوامی تعلقات  
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سرکاری ملازمت کے سلسلے میں  
جنوری ۱۹۷۰ء میں ڈھاکہ گئے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہزاروں ہونٹوں  
سمیت اسیر ہوئے۔ دو سال تک بھارتی قید خانوں میں  
سنگتے رہے۔ واپسی پر اپنی اسیری کی داستان —  
”ہمدردانِ دوزخ“ کے نام سے لکھی جو ادبی حلقوں میں بہت  
مقبول ہوئی۔ یہ کتاب اس ”دوزخ“ کی طرف لے جانے  
والے واقعات اور شخصیات کا مرقع ہے۔ زیب و زینت سے  
عاری حقائق سے مرصع۔

# ترتیب

حرف آغاز

## حصہ اول: سیاسی افق

۹

۱۲

۲۱

۲۵

۲۹

۳۵

۴۱

۵۱

۷۶

۸۱

۸۷

۹۹

۱۰۵

۱۱۵

۱۲۱

۱۳۱

۱۳۹

۱ دو جہان و یک قالب

۲ ریڑھ کا سرطان

۳ مجیب کا عروج

۴ مارشل لا کا مسخر

۵ شیخ صاحب جیت گئے

۶ لاڑکانہ بلان

۷ مجیب کی حکمرانی

۸ بھٹو، مجیب اور سچلی

## حصہ دوم: خانہ جنگی

۹ "آپریشن سرچ لائٹ" I

۱۰ "آپریشن سرچ لائٹ" II

۱۱ جنرل نیازی کی آمد

۱۲ مکتی باہنی

۱۳ ٹکڑا خاں کی واپسی

۱۴ سحران کی دہلیز پر

## حصہ سوم: جنگ

۱۵ شکست کی تیاری

۱۶ یوم الحساب



# حرفِ آغاز

یہ میری انگریزی کتاب کا اردو ایڈیشن ہے۔ جب ہماری شکست کی یہ عینی شہادت ۱۹۷۷ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی، تو کئی حلقوں نے اصرار کیا کہ اس کا اردو ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ اہل وطن کو بھی پتہ چل سکے کہ یہ تند و تیز آزمائشی کھرے آئی کیسے آئی اور کیوں آئی؟

بعض دوستوں نے مجھے خبردار کیا کہ ”ہماریاراں دوزخ“ کے بعد اردو میں کوئی کتاب چھاپنے سے احتیاط کرنا؛ ورنہ تمہارا حال بھی اُن ادبوں جیسا ہوگا جو اپنی پہلی تخلیق سے اپنا نام چمکاتے، مگر دوسری سے گننا لیتے ہیں۔ اس انتباہ کے باوجود یہ کتاب چھاپ گئی کیونکہ ایک طرف قومی ضرورت ہے اور دوسری طرف ذاتی شہرت۔ ظاہر ہے کہ اس تناظر میں ذات ہی کمات ہوئی چاہیے۔ دوستانہ مشورے کو نظر انداز کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میری رائے میں قاری بہت ذہین ہوتا ہے، وہ ادب پالے اور تاریخی مواد میں فرق جانتا ہے۔ وہ کبھی پھولوں کی خوشبو اور اُن کی نہلاتی ساخت کا مقابلہ نہیں کرتا۔

میں نے اس کتاب کو ادب سے دور اور تاریخ کے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں تاریخی واقعات پر ادبی خول چڑھانے بیٹھ جاتا، تو خول تو شاید چمک اُٹھتا، مگر حقائق ماند پڑ جاتے، اس لیے میں نے ساری زوداد سیدھے سادے انداز میں رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں کہیں کوئی ادبی جملہ آگیا ہے، تو اس کی حیثیت میری نظر میں اندھیری رات میں تہنا ستارے جیسی ہے جو چمکتا تو ہے، مگر اس سے تاریکی کم نہیں ہوتی۔

میری انگریزی کتاب کو اردو میں منتقل کرنے میں میر جریٹیمیر جعفری اور فضل عظیم صاحب نے میری مدد کی ہے۔ ان کا طرزِ نگارش اتنا خوبصورت اور منفرد ہے کہ انہوں نے جن جن حصوں کا ترجمہ کیا وہ انہی کے دگ میں رنگا گیا؛ چنانچہ نہیں نے ساری کتاب کو ایک ہی اسلوب میں ڈھالنے کے لیے ان مہربانوں کے لفظوں کی لڑیلوں کو توڑ دیا ہے۔ اس تحریر کو اردو ادبی سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ کتاب اب پہلے صفحے سے لے کر آخر تک سراسر میرے اپنے اسٹائل میں ہے۔

اس کتاب کے چھپنے سے اہل وطن کے اردو دان طبقے کو پہلی دفعہ بعض حقائق کا علم ہوگا، لیکن مجھے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ اس میں الیہ مشرقی پاکستان سے متعلق تمام چٹائیاں سودی گئی ہیں۔ میں نے تو حقیقت کا صرف وہ رخ پیش کیا ہے جو مجھے معلوم ہے۔ اگر کوئی صاحبِ حقیقت کے دوسرے زخموں سے پردہ سرکاسکین تو یہ یقیناً قومی خدمت ہوگی۔

صدیق سالک

راولپنڈی

Witness to Surrender

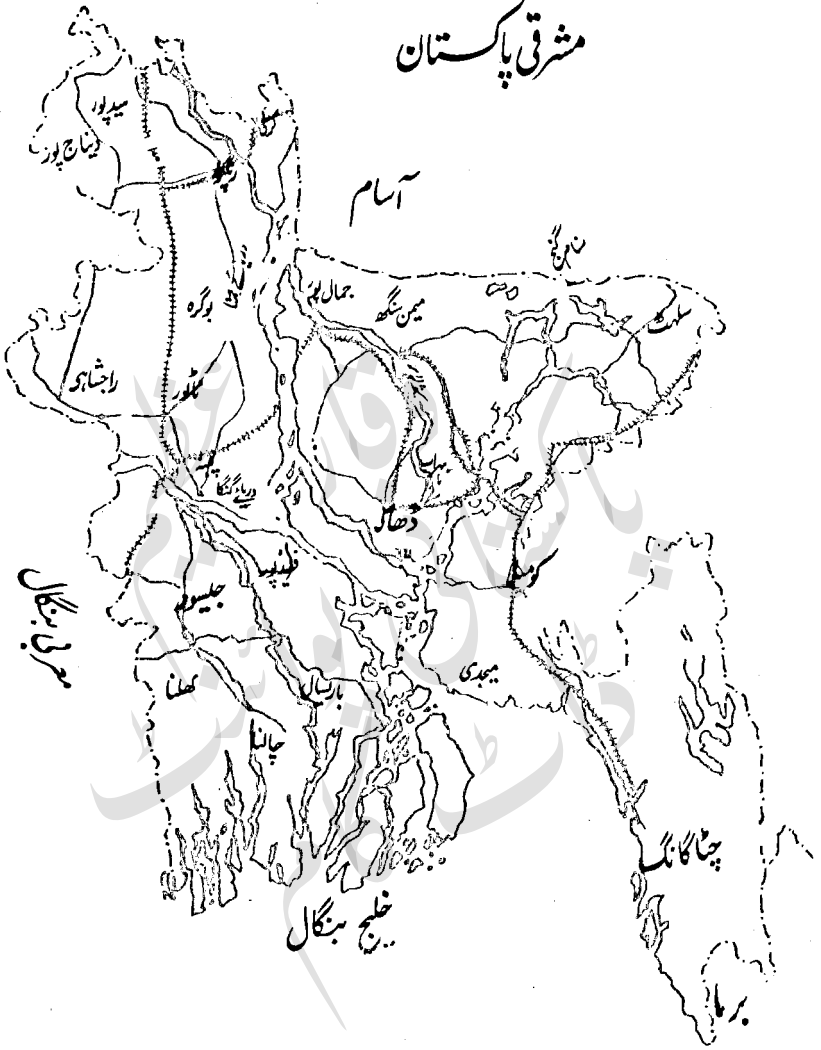


۱۴	جیسور سیکٹر (۹ ڈویژن)
۱۵	نالور سیکٹر (۱۶ ڈویژن)
۱۶	برہمن باڑی سیکٹر (۳۱ ڈویژن)
۱۷	چاند پور سیکٹر (۳۹ ہنگامی ڈویژن)
۱۸	مہین سنگھ سیکٹر (۳۶ ہنگامی ڈویژن)
۱۹	جنرل نیازی کی ہچکیاں
۲۰	۱۰۰۰ اور ڈھاکہ ڈوب گیا
۲۱	ضمیمے
۲۲	اول: تاریخی پس منظر
۲۳	دوئم: چھ نکات
۲۴	سوم: آپریشن سرچ لائٹ
۲۵	چہارم: دستاویز سقوط

حصہ اول  
سیاسی افق



# مشرقی پاکستان



بین الاقوامی سرحد  
 ریلوے  
 دریا

# دوجان یک قالب

پاکستان میں دوسرے ملک گیر بائبل لاء کی پہلی سالگرہ تھی۔ شیخ نجیب الرحمن ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرنے صوبے کے اندرونی علاقے میں جا رہے تھے۔ ان کی کھڑکھڑاتی کار کی پھلی سیٹ پر ان کے ساتھ ایک بنگالی صمائی بیٹھا تھا جو شیخ صاحب کی انتخابی مہم کی خبریں اپنے اخبار کو بھیجتا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں انہیں کسی نازک سیاسی مسئلے پر پھینکا اور چپکے سے اپنا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ بعد میں وہ یہ ٹیپ سنا کہ دو دستوں کی تواضع کیا کرتا تھا۔ اس نے یہ ٹیپ مجھے بھی سنایا۔ عجیب کی جانی پہچانی اور گرجا راز صاف سنائی دے رہی تھی!

”ایوب خاں نے مجھے مقبولیت کی ایسی معراج پر پہنچا دیا ہے کہ اب کوئی شخص میری مرضی کے خلاف نہیں جاسکتا۔ کوئی شخص مجھے نہ نہیں کہہ سکتا، حتیٰ کہ بچپنی خاں بھی میرے مطالبات کو رد نہیں کر سکتا!“

عجیب کے مطالبات اور عزائم کیا تھے؟ اس کی نشاندہی ایک اور ٹیپ سے ہوتی ہے جو بچپنی خاں کے محکمہ سرانجامی نے چوری چھپے تیار کیا تھا۔ اس میں عجیب کی آواز بند تھی۔ موضوع تھا ایل ایف او! یہ قانونی ڈھانچہ عملاً ایک دستوری خاکہ تھا جس میں قومی سلامتی کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس کی دو شقیں جو چھ نکات کی راہ میں حائل ہوتی تھیں، عجیب کو سخت ناپسند تھیں۔ اس دستوری خاکے کے متعلق عجیب نے انجانے میں اپنے قریبی حلقوں میں حسب ذیل رائے کا اظہار کیا تھا:

”میرا مقصد بنگلہ دیش کا قیام ہے۔ انتخابات ختم ہوتے ہی میں ایل ایف او کو پُرزے پُرزے کر دوں گا، کون ہے جو انتخابات کے بعد میرے سامنے ہانک سکے؟“

جب بچپنی خاں نے یہ الفاظ سنے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس کا فوری رد عمل یہ تھا: اگر اس نے مجھے دھوکا دیا تو میں اس کو سیدھا کر دوں گا! عجیب اور بچپنی کے یہ خیالات بعد کی باتیں ہیں، ان کا صحیح پس منظر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بات جنوری ۱۹۷۰ء سے شروع کی جائے جب میں پہلی بار دو سال کے لیے ڈھاکہ گیا۔

میں جب راولپنڈی سے ڈھاکہ روانہ ہوا، تو رخت سفر بڑا مختصر تھا، مگر میرے ذہن میں خیالات کا وزن بہت بھاری تھا۔ یہ خیالات

لے تفصیلات اور سیاسی پس منظر کے لیے دیکھیے ضمیمہ ۱۔

لے ایل ایف او LEGAL FRAME WORK ORDER قانونی ڈھانچہ جو آئین کی عدم موجودگی میں جنرل یحییٰ خاں نے ۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو جاری کیا۔

میں تقریری پر مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ ہندو نصاب سے بھی فائدہ اٹھانے کے چند موقوف حاضر ہیں،

- یہاں علی طور پر پائل لاد کا کوئی وجود نہیں ہے۔
- گھرداری کے لیے ہرگز جاری جاری چیزیں نہ خریدنا، کیا معلوم کب اور کن حالات میں یہاں سے بستر گول کرنا پڑے؟
- اپنا روپیہ پیر شہر کے کرشل بینک کے بجائے چھاونی کے نیشنل بینک میں رکھوانا۔
- اور اس! اپنے پیش رو کے فلیٹ ہی میں ٹکے رہنا یہ صندوق خالیٹ بڑا محفوظ ہے۔ اس میں کوئی شریذ آسانی سے نہیں لڑھکا سکتا۔
- میرے خیال میں یہ سب دہم تھے ورنہ کسی بنگالی کو کیا پڑی ہے کہ میرے گھر میں ہم بچھکے۔ صورت حال خراب سی مگر اتنی تو نہیں کٹھن پانک
- بھرنک انھیں۔

میں نے دوستوں کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے مغربی پاکستان سے ملک یعنی بیوی بچوں کو بٹلانے کے لیے تائیپ دیا۔ چند روز میں وہ پہنچ گئے، تو انہیں اپنے مورچہ خالیٹ میں منتقل کر دیا۔ بچوں کے آتے ہی اگلے روز بنگالیوں کا ایک جرم ہمارے گھر پر ٹوٹ پڑا، مگر وہ شریذ نہ تھے محض محنت مزدوری کرنے والی عورتیں تھیں جو آنا کے طور پر ملازمت کرنے کی خواہش مند تھیں۔ بنگالی عورتیں مغربی پاکستانیوں کے گھروں میں ملازمت کو ترجیح دیتی تھیں جیسے تھیں ہند سے پہلے ہندوستانی ناناسے اور میرے کسی انگریز کے ہاں نوکری کو بستر بھتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن معلوم ہوا کہ میری بیوی نے دو نوکرانیاں ملازم رکھ لی ہیں۔ بظاہر یہ سراسر فضول خرچی تھی مگر جب بیوی سے جواب طلبی کی تو وہ کہنے لگی، انگریز کیجیے ان دونوں کی تنخواہ ہمارے راولپنڈی والے دامد ملازم کی تنخواہ سے کم ہوگی۔ میں نے فکر کرنا چھوڑ دیا۔

گھر آباد کرنے کے لیے برتنوں کی ضرورت پڑی تو میں ڈھاکہ سے ۴۴ کلومیٹر دور نوئی میں پاکستان سرائیک انڈسٹریز گیا۔ راستے میں افلاس اور ناداری کے ایسے ایسے دردناک مناظر دیکھنے میں آئے کہ ملازمت کے لیے طاری ماری پھرتی آیاؤں، کی بے چینی بھریں اٹھ گئی۔ راستے میں جو عورتیں نظر آئیں ان کے پاس ستر پوشی کے لیے چند بیٹریوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ جرم و دکھائی دیے وہ عموماً کوتاہ قامت اور فاقہ زدہ تھے۔ ان کی سیاہ جلد میں منحنی ہوتی پیدائیں ملتی گاڑی سے بھی گئی جاسکتی تھیں۔ بچوں کی حالت بڑوں سے بدتر تھی۔ ان کی ہڈیاں کمرور اور ترسخت تھیں۔ کمزور ٹانگوں کے اوپر ابھری ہوئی ٹوندیں باہر کو اٹھ رہی تھیں۔ بعض بچوں کی کمر کے گرد گندہ سادھا گاندا تھا جس سے ایک گھنٹی تک رہی تھی یہ ان کا والد کھلوتا تھا۔

راستے میں جہاں جہاں رکنا چکٹ ٹنگوں کے غول کے غول مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ بنگال کا عام غریب دی مغربی پاکستان کے انسانی غریب آدمی سے بھی غریب تر ہے۔ مجھے مشرقی پاکستان کی معاشی بد حالی کے بارے میں کئی ہوئی باتوں میں وزن نظر آنے لگا۔ میں اپنے آپ کو فخر محسوس کرنے لگا۔

مجھے خیال ہونے لگا کہ چند روز پہلے میرے دوست شاید ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کہ کیونکہ اگر یہ بھوکے ننگے لوگ اب وہ درانہ متعل جہاں میں تو واقعی بازار ٹوٹ سکتے ہیں چھاونی پر ہڈوں مل سکتے ہیں۔ اور میرے گھر میں ہم بھی پھینک سکتے ہیں۔

فیکٹری کے دروازے پر ایک لمبا توں لگا آدمی ملا۔ وہ کوٹ تھلن پہنے تھا اور وضع قطع سے چٹائی لگا تھا۔ اس نے مجھے میرے خدا مال سے میرے علاقائی تعلق کا اندازہ لگالیا۔ وہ مشرینازی تھا جو فیکٹری میں سیکورٹی اسٹنٹ کا کام کرتا تھا۔ بڑے تپاک اور مہربان انداز میں باتیں کرنے لگا جب میں نے وہاں آنے کا مقصد بتایا تو کہنے لگا میری ملینے تو برتنوں کا آرڈر خود نہ دیجیے، یہاں کے بنگالی مزدور مغربی پاکستان کے انفرسٹ سے کم رکھتے ہیں۔ ان کے آرڈر کے برتن بھی جان بوجھ کر خراب کر دیتے ہیں آپ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجیے۔

ملکی سالمیت سے متعلق تھے مگر اس وقت مجھے اس سلسلے میں ہندوستان کی امکانی جارحیت کی بجائے اندرونی سیاست کے مدوجز کا زیادہ احساس تھا کیونکہ مغربی پاکستان میں جہاں میں نے بیس کچیس سال گزارے تھے، یہاں عام تھا کہ عجیب کے چھ نکات علم کی گڑبڑ ایک کم کا دوسرا نام ہے اور بعض معلقوں میں یہ بات بھی اکثر سننے میں آتی تھی کہ ۱۹۷۸ء کی گرتلا سازش بھی اس ایک کم کو روکنے کا لانے کے لیے عملی اقدام تھا۔ ان باتوں میں کہاں تک صداقت تھی اور کہاں تک تعصب، اس کا مجھے علم نہ تھا، میں نے سوچا کہ بنگالی جانیں سے براہ راست ہٹوں گا، تو صورت حال خود بخود واضح ہو جائے گی۔

ان دنوں مشرقی پاکستان میں کچیس ہزار کے لگ بھگ فوجی تعینات تھے۔ میں سرکاری فرائض کے سلسلے میں انہی میں شامل ہونے جا رہا تھا، مگر ۱۰۰ کلومیٹر میں پہلے ہوئے وسیع ہندوستان علاقے کے اوپر پرواز کرتے ہوئے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر ہندوستان نے ہم پر حملہ کر دیا، تو کیا یہ کچیس ہزار فوجی مؤثر طور پر مشرقی پاکستان کا دفاع کر سکیں گے؟

میں ایک سچے پاکستانی کی طرح ان خیالات سے آنکھیں پھانے کے لیے ماضی کی ان بوسیدہ دلیلوں میں پناہ ڈھونڈنے لگا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکہ ہی میں تو رکھی گئی تھی... قرار داد پاکستان جو ۱۹۴۰ء میں لاہور میں منظور ہوئی ایک بنگالی لیڈر ہی نے تو پیش کی تھی... پھر ڈھاکہ کا؟

انہی خیالات کے جھرمٹ میں میں تیج گاؤں (ڈھاکہ) ایئر پورٹ پر اترا۔ زمین پر سبزے کے قالین سمجھے تھے اور آسمان پر نقلی بادل نکلا رہے تھے۔ بدلیاں تو بہت تھیں، مگر کبھی کبھی۔ ان کی اوٹ اتنی گھنی اور گہری نہ تھی کہ ہنستے ہوئے سورج کا چہرہ مکمل طور پر لکھو سے اوچل ہو جاتا۔ فضا معتدل سی اور ماحول سکون آمیز سا!

میرے ساتھ ہی جہاز سے بعض فوجی افسر اترے جو مارشل لا ردیوئی سے متعلق تھے۔ وہ کسی اور ہی ہوا میں تھے، ورنہ ہونے دی آتی ہی لاؤنچ میں گئے اور گہرے اور دبیز صوفوں میں سستانے لگے۔ باہر بنگالی قلی ہائے کا پٹنے ان کا سامان گورنمنٹ ہاؤس کی تقریبی پیشوں والی گاڑیوں میں لاڈنے لگے۔ آٹا فاناہہ باہر نکلتے اور گاڑیوں میں بیٹھ کر ایئر پورٹ سے نکل گئے۔

میں دوسرے برآمدے میں کھڑا کسی مناسب سواری کا انتظار کرنے لگا (راستے میں جہاز کی خرابی کی وجہ سے میں نے فلائٹ بدل لی تھی مگر اس کی اطلاع ڈھاکہ نہ پہنچا سکا تھا)۔ تھوڑی دیر بعد ایک فوجی جیب میرے قریب آکر رکی۔ حوالدار نے مجھے سمارٹ سائیلنٹ کیا اور پاس سے گزرتے ہوئے ایک بنگالی لڑکے کو ہیک دار لہجے میں حکم دیا: صاب کا پتی کیس جیب میں رکھو!

سے ہوئے لڑکے کو یہ ہیک ناگوار تو گزری مگر اپنے آقا پر ایک احتجاجی نگاہ ڈالتے ہوئے حکم بجالایا۔ اس نے گھور کر میری طرف بھی دیکھا۔ اس کے سیاہ چہرے کے چوکھے میں سفید سفید آنکھیں وحشت کا احساس دیتے ہوئے تھیں۔ میں نے اپنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالا اور چند نکلے اس غریب لڑکے کو دینا چاہے، مگر حوالدار نے پُر زور لہجے میں کہا: سزا، حرامزادوں کی عادت نہ بگاڑیے! میں نے مشورہ مان لیا۔ اور بنگالی لڑکا ایک بار پھر نفرت بھری نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

ایئر پورٹ کی بلند والا عمارت پر پرچم ستارہ و ہلال پوری آب و تاب سے لہرا رہا تھا۔ میں چھاونی روانہ ہو گیا۔

جو دوست مجھے ایئر پورٹ پر لینے نہ پہنچ سکے تھے، شام کو افسر زمیں میں آئے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ اپنی غیر ماضی کی معافی مانگنے لگے۔ مری گنگو کے بعد مشرقی پاکستان کی صورت حال زیر بحث آئی تو انہوں نے اس غیر مناسب موقع پر جبکہ حالات دگرگوں ہو رہے ہیں مشرقی پاکستان



ڈھاکہ واپس پہنچ کر میں نے دن بھر کے تجربات ایک پڑانے پنجابی دوست سے بیان کیے۔ خاص طور پر عزت کے دردناک مناظر کا ذکر بڑے براثر انداز میں کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اُن بنگالیوں کو ان کی کاہلی اور نااہلی کے لیے کوٹنے لگا۔ اس نے نفرت آمیز انداز میں کہا: یہ صرف ایک کام میں ملتا ہیں۔ اور وہ ہے خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں کی بے دریغ خلاف ورزی! ... آپ ان کی عزت کا اتنا اثر نہیں، میں آپ کو تصور کا دوسرا رخ دکھانے کی دہشت (ڈھاکہ) لے چلاں گا!

کیپٹن چودھری واقعی اپنی پہلی فرصت میں مجھے گاڑی پر بٹھا کر شہر لے گیا۔ پہلے ہم شہر کے شاندار علاقوں میں گھومتے رہے جن میں ایسٹ بینک گورنمنٹ ہاؤس، ہائی کورٹ، انجینئرز انشٹیٹیوٹ، ریڈے انشٹیٹیوٹ، یونیورسٹی کیپس، بیت المکرم، انسٹیٹیوٹ، نیما کیٹ اور ایسی ہی بائیس عمارتیں شامل تھیں۔ ان عمارتوں کا چکر لگانے کے بعد کیپٹن صاحب نے اہانت آمیز لہجے میں کہا: "پہلے یہاں کچھ بھی نہیں تھا" یہ سب کچھ ۱۹۴۷ء کے بعد بنا۔ اور وہ بھی سالانہ سیلابوں، سمندری طوفانوں اور قیامت خیز سایکلوں کے باوجود! ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص زرمبادلہ کے آمد و خرچ کے اعداد و شمار جمع کرے اور عجیب کی طرف سے عائد کردہ اقتصادی استحصال کے الزامات کی فلمی کھول دے۔

میں کیپٹن چودھری کی باتیں سن کر سوچنے لگا کہ اگر یہ سب کچھ سچ ہے اور حقائق عجیب کے خلاف ہیں تو پھر دوسرے بات کا؟ اس کے علاوہ عجیب کا تو مولانا عبدالحق جانشانی بھی تو ہیں جو ایک بااثر اور تنوازی جماعت کی قیادت کر رہے ہیں۔ اور ہاں! دائیں بازو کی کئی جماعتیں بھی تو عجیب کے خلاف ہیں جو اکثر و بیشتر ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان اسلامی رشتے پر زور دیتی رہی ہیں۔ جیسا ان حالات میں عجیب کس طرح سن مانی کر سکتا ہے۔ اگر اس کا سب سے بڑا ہتھیار رائے عامہ ہے تو اس کا اندازہ تو انتخابات کے بعد ہی ہو گا۔ دیکھیے انتخابات میں کیا ہوتا ہے۔

انتخابات کے لیے سیاسی سرگرمیوں پر سے کچر جڑی ۱۹۶۰ء سے پابندی اٹھائی گئی۔ سال نو کا غیر مقیم بائیں بازو کے طلبہ کی جماعت نے آدھی رات کو شمل برادر مجلس نکال کر کیا جس میں انہوں نے صرخ انقلاب کے نعرے لگائے۔ ان کی حریف جماعت ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ نے جس کا اہم قائد عوامی لیگ سے تھا، اگلے روز ایک جلسہ عام میں یہ اعلان کیا کہ جاری ہنمات کا راز چھ نکات میں ہے۔ صرف چھ نکات میں۔ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طالب علموں نے اپنا کوئی زور نہ دکھایا۔

سیاسی جماعتوں میں عوامی لیگ، جماعت اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی (جانشانی گروپ) بہت سرگرم تھیں۔ عوامی لیگ نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز ۱۲ جنوری کو پٹن میدان میں ایک عظیم الشان جلسے سے کیا۔ یہ جلسہ تنظیم اور تعداد کے لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔ اخباری اصطلاح میں وہاں لوگوں کا ایک شاخص مانتا ہوا ہزار ہزار تھا۔ تعداد کے علاوہ گفتار و افکار کے لحاظ سے بھی یہ اجتماع یادگار تھا۔ اس سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمن نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ بنگالیوں نے ۱۹۵۶ء کے دستور میں برابری (PARITY) کے اصول کو تسلیم کر کے سخت غلطی کی تھی۔ اس نے وہی دیکھ کر اگر بنگلہ دیش پر یہ اصول دوبارہ ٹھونسنے کی کوشش کی تو اس کی مزامعت کی جائے گی اور عوام کے حقوق کے لیے تحریک چلائی جائے گی!

بعد میں بنگال کے ممتاز سیاست دان مرحوم فضل حسین عرف ہاک میاں کے بہت پر اثر معین عین نے مجھ سے کہا: میرے والد کی لے انگریزی روزنامہ آئزور ڈھاکہ۔ مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۶۰ء  
مشرق پاکستان کے مقبول ترین روزنامہ اتفاقی کے مالک اور مدیر حسین شہید سہروردی کے قریبی رفیق، ہاک میاں کا انتقال ۲۰ مئی ۱۹۹۹ء کو ہوا۔

دہلی میں ۱۹۵۶ء کے آئین کو بنگالیوں کے لیے قابل قبول بنانا ممکن تھا، مگر اب گاڑی چھوٹ چکی ہے! میں نے اس دعوے کی تصدیق بعض بزرگ سیاست دانوں سے چاہی تو انہوں نے اس کی تصدیق کی اور کہا: جی ہاں! حسین شہید سہروردی کی موت کے بعد اگر کسی کا اثر و رسوخ عجیب پر تھا تو وہ ہاک میاں ہی تھے!

ایک ہفتے بعد جماعت اسلامی نے اسی پٹن میدان میں اپنا جلسہ منعقد کیا جہاں عوامی لیگ نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہر کیا تھا۔ جماعت اسلامی نے بھی اپنے اجتماع کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی، مگر یہ جلسہ بڑا بازی کا شکار ہو گیا۔ فزیت مارکٹ کی گلی جس میں دو آدمی ہلاک اور سچاس زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں سے بچپس کی حالت تشویش انگیزی تھی۔ امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جو جلسے سے خطاب کرنے خاص طور پر لاہور سے ڈھاکہ پہنچے تھے تقریر کیے بغیر جلسہ گاہ سے واپس آ گئے۔

اس خون ریز جھڑپ میں جماعت اسلامی ایک مظلوم اور تہمید رسیدہ جماعت بن کر نکلی۔ جماعت نے ٹخن خرابے کی ذمہ داری عوامی لیگ پر ڈالی کیونکہ جلسہ گاہ کے ایک حصے سے جو اسے بگڑا (بگڑاؤ دشمن زندہ باد) کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ عوامی لیگ یہ کہہ کر اس الزام کی بھرپور تردید کرتی تھی کہ قائد اس کے مفاد میں نہیں کیونکہ اس سے انتخابات التوا کا شکار ہو سکتے تھے۔

فریقین میں یہ بحث اپنی جگہ سچا، مگر سوال یہ ہے کہ اس گڑبڑ کو روکنے کے لیے انتظامیہ نے کیا کیا۔ خوں ریز جھڑپوں کے دوران پولیس مکمل تھی، اس نے وقت اور مقررہ مداخلت کر کے امن و امان بحال کیوں نہ کیا؟ میں نے یہ سوال واشل لائن انتظامیہ کے ایک اعلیٰ افسر کے سامنے اٹھائے تو اس نے کہا: حکومت نے جماعت اسلامی کو ضروری تحفظ کی پیش کش کی تھی، مگر جماعت نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہمارے پاس انتظام ہے! اس سے انتظامیہ یہ بھی کر غالباً جماعت یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ اگر عوامی لیگ اپنے بل بوتے پر اٹھنا چاہے تو اسے ہتھیار دے دیں گے! میں نے جب یہ بات جماعت کے ایک ہمدرد سے کہی تو اس نے جواب دیا: "میں یہ سراسر جھوٹ ہے" جماعت نے کوئی پیش کش نہیں ٹھکرائی۔ درحقیقت حکومت اپنی غیر جانبداری قائم رکھنے کے لیے سرہام بیٹھی تھانہ دیتی رہی!

جنوری ۱۹۶۰ء کا تیسرا اہم سیاسی واقعہ شوش میں کسانوں کی ریلی تھی جس کا اہتمام مولانا جانشانی کی نیشنل عوامی پارٹی نے کیا تھا۔ اس میں شرکت کے دعوت نامے ان تمام پارٹیوں کو دیے گئے جو سوشلزم میں اعتقاد رکھتی تھیں۔ حکومت نے اس ریلی کو کامیاب بنانے کے لیے خصوصی گاڑیاں چلائیں اور جلسہ گاہ تک پہنچانے کے انتظامات کیے کیونکہ گورنمنٹ ہاؤس میں بیٹھنے والے بعض سیاسی پتھروں کا خیال تھا کہ عجیب الزعمین کا اثر زائل کرنے کے لیے نیپ (جانشانی) کو کامیاب اور فعال بنانا ضروری ہے۔

اس کے باوجود ریلی ناکام ہو گئی۔ ناکامی کی وجہ کسی حریف جماعت کی دخل اندازی کے بجائے اس کا اپنا اندرونی انتشار تھا۔ کئی دنوں کے شور و شر کے بعد اگر اس تقریب سے کچھ برآمد ہوا تو چند نعرے تھے،

"خون اور آگ — آگ! آگ! آگ!!!"

"پرچی یا گولی — گولی! گولی! گولی!!!"

نیپ (جانشانی) کا انتہا پسند گروپ جس کی قیادت پارٹی کے سیکرٹری جنرل سطر کے ہاتھوں میں تھی، سرے سے انتخابات میں نہیں

لے۔ عجیب الزعمین کے سیاسی گرو اور پاکستان کے سابق وزیر اعظم، ان کا انتقال دسمبر ۱۹۹۳ء میں برودت کے ایک ہوش میں ہوا۔



بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انتخابات سے حکومت تو بدل سکتی ہے، مگر سماجی و اقتصادی تبدیلی نہیں آسکتی جس کا واحد ذریعہ سرخ انقلاب ہے۔

ایک شام ایک اخبار کے دفتر میں میری ملاقات مشرطہ سے ہوگئی وہ نیپ (جھانسی) سے تازہ تازہ الگ ہوئے تھے۔ اپنی عمدگی پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا:

”میں نے پہلے عوامی لیگ کو اس لیے چھوڑا تھا کہ اس میں کوئی انقلابی شملہ باقی نہیں رہا تھا؛ چنانچہ میں نے انقلابی نصب العین حاصل کرنے کے لیے نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھی، مگر اب یہ پارٹی بھی اپنے نصب العین سے ہٹ چکی ہے۔ اب اس میں بھی عوامی لیگ کی طرح کوئی چنگاری باقی نہیں رہی۔ میں اپنا آئندہ کا لائحہ عمل انتخابات کے بعد وضع کروں گا۔“

ان تین سیاسی پارٹیوں کے علاوہ چند اور سیاسی جماعتیں اور گروہ بھی تھے جن میں کرشنک سربراہ پارٹی، پاکستان نیشنل لیگ، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، جمعیت العلماء پاکستان اور مسلم لیگ (تین گروہ) شامل ہیں۔ یہ سب سیاسی اکائیاں اس وقت کے اترے گزشتہات و خیرات ہیں۔ ان میں سے کسی نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہ دیا جس سے سیاسی بلبل مچ سکتی، البتہ ان نسبتاً چھوٹی جماعتوں میں پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر جناب محمد لڑالین کا ذکر ضروری ہے کیونکہ انتہا پسندی کے اس جذباتی ماحول میں انہوں نے اعتدال، ردواری اور انصاف کی آواز بلند کی۔ یہ بہت بڑی بات تھی، کیونکہ تاریک اندھی میں چراغ جلائے شمس کے تنازع کے لحاظ سے بے سود ہونگے جبکہ اس وقت کے اعتبار سے قابل تائید تھی۔

مشرطہ لڑالین کی یہ آواز بے اثر ثابت ہوئی کیونکہ ماحول بدل چکا تھا۔ قدیم رومنی جاری تھی، قومی سالمیت کے منافی نعرہ بازی روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔ اس آندھی کو روکنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ حکومت کی گدی پر بیٹھنے والے اس آندھی سے بے خبر تھے یا بدیدہ دانستہ اسے نظر انداز کر رہے تھے۔

سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد میں اقتصادیات کے دؤیروں اور بنگال کے دانش ورؤں کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ میرے خیال میں یہ دو طبقے کسی ملک کی سیاسی تقدیر بدلنے میں خاموشی مگر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تجارتی طبقوں میں مشرطہ رحمن، مشرطہ احمد، مشرطہ جویاں اور چند دوسرے حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کا زور بیان اس بات پر ڈالتا تھا کہ جناب مغربی پاکستان میں جتنی ترقی ہوئی ہے، مشرقی پاکستان کے پیسے سے ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں وہ عوامی لیگ کی زیر سرپرستی پھینچنے والے لٹریچر کا اکثر حوالہ دیتے جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ پاکستان کی مجموعی آمدنی کا ساٹھ فیصد حصہ مشرقی پاکستان سے حاصل ہوتا ہے، مگر اس پر قومی آمدنی کا صرف بیس فیصد خرچ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان قومی آمدنی کا صرف چالیس فیصد کھاتا ہے، مگر کل آمدنی کا پچھتر فیصد کھاتا ہے۔

اعدا و دشمار کے علاوہ یہ حضرات بعض عملی دشواریوں کا بھی اکثر ذکر کرتے اور روزمرہ زندگی سے ایسی مثالیں دیتے کہ سارا تجارتی نظام مسمخہ نیز نظر آتا۔ مثلاً وہ کہتے کہ ایک جہاز جو مشرقی وسطیٰ سے برآمد ہونے کے بجائے گامگ روانہ ہوتا ہے، پہلے سیدھا کراچی جاتا ہے۔ پھر کراچی سے شپاگانگ آتا ہے جس سے کراچی بڑھتا ہے اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے، اسی طرح فوج کے استعمال میں آنے والی حمل جالیاں (CAMOUFLAGE NETS) عموماً پٹ سن سے بنتی ہیں۔ پٹ سن کی فیٹیڈیاں یہاں ہیں، مگر پہلے یہ تیار شدہ مال رنگائی کے بعد مغربی پاکستان بھیجا جاتا ہے اور پھر واپس منگوا کر یہاں کے یونٹوں کو دیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس وقت تک مشرقی پاکستان کے لیے مناسب نہیں سمجھی جاتی جب تک اس پر مغربی پاکستان کی قبولیت کی ضرورت نہ ہو جائے۔ خواہ یہ تجارتی مال ہو یا سیاست دان ہوں یا انتظامیہ کے افسر۔

ذہنی اور فکری محاذ پر بھی کیفیت تشویش انگیزی تھی۔ چند ذاتی تجربے پیش کرتا ہوں۔ بڑے لکھے لوگوں میں جس شخص سے سب سے پہلے رابطہ قائم ہوا وہ پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کی ڈھاکہ شاخ کے ریڈیٹ ڈائریکٹر تھے۔ وہ میری خواہش پر مجھے سنٹر کی لائبریری دکھانے لگے۔ چلتے چلتے آرٹ کیشن کے سامنے رک گئے۔ شیلف سے ایک اعلیٰ طباعت والی خوبصورت کتاب نکالی اور بنگالی لکھے اور نفرت سے کہنے لگے: ”ڈراما لحظہ ہوراولپنڈی سے ہمارا بیڈ آفس ہمیں کیا بھیج رہا ہے؟ یہ قومی دولت کا سراسر ضیاع نہیں تو کیلئے؟ کیا آپ نے کسی بنگالی شاعر کے بارے میں بھی اس پالیے کی کوئی کتاب شاخ کی ہے؟“ ان کی رہی کا باعث مرقع چٹائی تھا جس میں کیاٹے روزگار شاعر اسد اللہ خاں غالب کے منتخب اشعار کی مصوٰر ترجمانی کی گئی تھی۔

لائبریری کے اس پکڑ میں وہ ایک جگہ اور ر کے اوٹ شیلف کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا: ”یہ سارا شیلف تمہارے قائد اعظم سے متعلق کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔“ زور دہاتے ہوئے پر تھا جس کی جھن جھن محسوس ہوئی اور میں ٹیس کو دل میں سمیٹ کر واپس چلا آیا۔ چند روز بعد مجھے فلم سنسور بورڈ ڈھاکہ کی میٹنگ میں ایک اور یادگار تجربہ ہوا۔ یہ میٹنگ بلانے کا مقصد چوبہ فلموں کی روک تھام تھا جن کا اکثر مواد فلموں اور نادولوں کی شکل میں ملکیت سے آتا۔ اس اجلاس میں ڈھاکہ کی فلمی صنعت کے تمام نمائندے یعنی پروڈیوسر، ڈائریکٹر، فن کار اور فلم کار موجود تھے۔ صدر مجلس نے ابتدائی کلمات میں قومی وقار اور اخلاقی اقدار کے نام پر سرفہ اور تجربہ کی صنعت ختم کرنے پر زور دیا اور تمام حاضرین سے تعاون کی اپیل کی۔ اس پر فلم انڈسٹری کے بااثر ڈائریکٹر جو خود اچھے فلم کار بھی تھے، اپنے ساتھیوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے فرمایا:

”پاکستان کی فلمی صنعت کے بارے میں ایک اعلیٰ سطحی مذاکرہ پہلے بھی یہاں منعقد ہوا تھا جس میں یہاں کی فلمی صنعت کے مفاد میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکومت اس کی نشوونما کے روایتی سرچشموں میں مداخلت نہیں کرے گی۔ میں مارشل لا انتظامیہ کو مشورہ دوں گا کہ وہ حکومت کے اس فیصلے پر قائم رہے اور کی طرف ہمارا دروازہ کھلا رکھے۔ سوچئے تو سوائے آخر ہم اپنے ثقافتی کبے سے کیسے پیٹھ منوڑ سکتے ہیں۔“

جلسے کے بنگالی صدر نے جس کی اپنی وفاداری مشکوک تھی، میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بنگالی دانشور کی نکتہ آفرینی پر اشبات میں سر بلاتے ہوئے اجلاس برخواست کر دیا۔

مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے بنگالی جماعتوں سے رابطہ قائم کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک وسیع ذہنی طبع حامل ہونگی ہے۔ سوال یہ تھا کہ آیا یہ طبع پائی جا سکے گی یا اس کا نتیجہ کچھ اور ہو گا۔ معاشرہ ۲۵ ہزار زویوں کی طرف گیا جن کو مشرقی پاکستان میں قومی سالمیت کی تھی گارنٹی سمجھا جاتا تھا۔

آئیے دیکھیں کہ ان فوجیوں کی ذہنی کیفیت کی تھی؟

# ریڑھ کا سرطان

اگر ۱۹۷۰ء کی ابتدا میں سیاست دان، تاجر اور دانشور مغربی پاکستان سے ذہنی رابطہ توڑ چکے تھے تو کیا بنگالی سپاہی اس وبائے محفوظ تھے؟ کیا کسی اندرونی شورش کو فرو کرنے کے لیے ان پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا؟ کیا ہندوستانی باجیت کی صورت میں ان کا طرز عمل محبت و وطن سپاہیوں جیسا ہوگا؟ دوسرے لفظوں میں کیا وہ ذہنی اور جذباتی طور پر باقی فوج سے ہم آہنگ تھے؟

میں پہلا شخص نہ تھا جس کے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہے تھے۔ مجھ سے پہلے بھی کئی افراد اس تشویش کا شکار بن چکے تھے۔ ان میں سے ایک میجر جنرل خادم حسین راجہ تھے جو مشرقی پاکستان میں متعین واحد ڈویژن (۱۴۱) کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے۔ زیرکمان سپاہیوں کی نفسیاتی الجھنوں سے باخبر رہنا ان کا سرکاری فرض بھی تھا۔ ان کے دل میں شبہات کا کیرا اس وقت پیدا ہوا جب ۱۹۶۹ء کے آخر میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان لڑائی جھگڑے شروع ہوئے اور بنگالی سپاہیوں کو اسے فرو کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس نازک موقع پر بنگالی سپاہیوں کا نظم و ضبط بظاہر قائم رہا، مگر انہوں نے مؤثر کارروائی کرنے سے گریز کیا۔ یوں پتہ چلتا تھا کہ وہ متذبذب کا شکار ہیں۔ خطرے کو جانپتے ہوئے جنرل راجہ نے انہی دلوں جنرل ہیڈ کوارٹرز (جی۔ ایچ کیو) کو ایک چٹھی لکھی جس میں مقامی صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد سفارش کی گئی کہ علیحدہ علیحدہ بنگالی اور غیر بنگالی یونٹوں کا فرق ختم کیا جائے اور بنگالی فہری کو غیر بنگالی یونٹوں میں ضم کر دیا جائے۔ انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ مشرقی پاکستان کی نازک صورت حال کے پیش نظر وہاں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے یونٹوں کی تعداد بڑھائی جائے۔

جنرل راجہ کی تجاویز صدر پر پاکستان جنرل یحییٰ خاں کی اس تقریر کی روح سے متصادم تھیں جو انہوں نے ۲۸ جولائی ۱۹۶۹ء کو قوم کے نام نشر کی تھی۔ انہوں نے اعلان کیا تھا کہ افواج پاکستان میں بنگالیوں کی تعداد دگنی کر دی جائے گی۔ اور یہ کارروائی بنگالیوں کی شکایات دود کرنے کی طرف پہلا قدم ہوگا۔

صدر پاکستان نے جو فوج کے کمانڈر انچیف بھی تھے یہ فیصلہ کرتے وقت مشرقی پاکستان کی صورت حال کو کیوں پیش نظر نہ رکھا؟ اس کی دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو انہیں بنگالی سپاہیوں کی نفسیاتی کیفیت کا احساس نہ تھا اور یا وہ کسی سیاسی مصلحت کے تحت اس سے پہلو ہٹ کر رہے تھے۔

صدر پاکستان اور جنرل راجہ کی سوچ میں اس تضاد کے باوجود مؤخر الذکر کو اپنی تجاویز کی صحت اور افادیت پر اتنا یقین تھا کہ انہوں نے ہمت نہ ہاری اور جی ایچ کیو پر متواتر زور دیتے رہے۔ کچھ عرصے بعد ایک سہانی صبح کو جی ایچ کیو سے ایک خفیہ خط موصول ہوا۔ جنرل صاحب سمجھے کہ ان کی امیدوں کی کلی کھلنے لگی ہے۔ انہوں نے پر اشتیاق بے تابانی سے خاکی لفاظی کھولا۔ لفافے کے اندر ایک اور

لفافہ تھا۔ اسے چاک کیا۔ خط کا متن پڑھا تو اس میں کچھ اور ہی نکلا۔ اس خط کے ذریعے جنرل راجہ کوکناٹڈ راجپوت کا یہ حکم پہنچا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں دو مزید (خالص) بنگالی پلٹنیں کھڑی کی جائیں۔ پہلے سے موجود بنگالی پلٹنوں کی تعداد سات تھی جن میں سے چار مشرقی پاکستان میں موجود تھیں گویا اب اس صوبے میں خالص بنگالی پلٹنوں کی تعداد چھ ہو جائے گی۔ (یاد رہے ان دونوں مشرقی پاکستان میں غیر بنگالی پلٹنوں کی تعداد آٹھ تھی)

جی اوسی کے لیے یہ حکم توثیق کا باعث ہوا۔ انہوں نے اس مسئلے پر مزید سوچا اور طے کیا کہ اس سلسلے میں مزید خط و کتابت لینے ہوگی، اس لیے خود جاکر اس حکم کے خطرناک مضمرات سے جی انج کی کو آگاہ کرنا ضروری ہے؛ چنانچہ وہ راولپنڈی پہنچے اور متعلقہ حکام کو بتایا، "اگر آپ کا مقصد ایک الگ بنگالی آرمی کھڑی کرنا ہے تو بیشک نئی سے نئی بنگالی پلٹنیں کھڑی کرتے جائیں، لیکن اگر آپ فوج اور ملک کو متاثر رکھنا چاہتے ہیں تو آزاد راہ مہربانی موجودہ بنگالی پلٹنوں کو باقی فوج میں ضم کر دیجیے۔"

جب یہ نقطہ نظر صدر پاکستان کو پیش کیا گیا، تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ایک طرف سیاسی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ فوج میں بنگالی نمائندگی کو بڑھایا جائے اور دوسری طرف مقامی کمانڈر مشورہ دے رہا تھا کہ موجودہ بنگالی پلٹنوں کا وجود بھی ختم کر دیا جائے۔ فیصلے کی اس مشکل ساعت میں جنرل یحییٰ نے وہی کیا جو تذبذب کے شکار کمانڈر عموماً کیا کرتے ہیں۔ جنرل یحییٰ نے ایک بین بین راستہ تلاش کیا اور فیصلہ دیا کہ نئی پلٹنیں قائم کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ بنگالی پلٹنوں کو غیر بنگالی پلٹنوں میں ضم کرنے کی کارروائی کا آغاز کیا جائے۔

اس کی ابتداء ۱۹ جون ۱۹۶۹ء ایف ایف میں بنگالی سپاہیوں کی ایک کمپنی شامل کر دی گئی، بعد میں ۲۵ پنجاب میں ایک بنگالی کمپنی ضم کرنے کا پروگرام تھا۔ خیال تھا کہ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا، تو ضم کرنے کی اس سکیم کو آگے بڑھایا جائے گا۔ ۱۹ ایف ایف میں بنگالی نفزی کی شمولیت کے موقع پر ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو فورٹریس اسٹیڈیم ڈھاکہ میں ایک تقریب پر ریڈیو بی بی سی پر بھیجی ہوئی مناجات پائی، البتہ جی اوسی کے ذہن میں یہ کانٹا براہ رکھتا رہا کہ اگر ۱۹ ایف ایف میں ضم شدہ بنگالیوں نے کسی ہائے دشمنی ہم گندم کی بجائے چاول کھائیں گے، شورش برپا کر دی، تو یہ تجربہ ہنگامہ پر گرا جائے گا۔

جی اوسی کا اندیشہ بنیاداً ثابت ہوا۔ ۱۹ ایف ایف بنگالی نفزی سمیت مشرقی پاکستان میں اپنے فرائض انجام دیتی رہی اور بعد ازاں اپنی باری پر مغربی پاکستان منتقل ہو گئی۔ بغیر گشت!

اس کامیاب تجربے کے باوجود ضم کرنے کی سکیم "آگے نہ بڑھ سکی کیونکہ اس ہائے میں صدر مملکت نے زبانی "آہستہ روئی کا حکم دے رکھا تھا۔"

یہ تو جی اوسی کا اندیشہ ہی نہیں تھا بلکہ اس کی پالیسی کی، اب ذرا بنگالی نفزی کو دنگا کرنے کے حکم کا حال بھی سن لیجیے۔ اس حکم پر بڑے زور شور سے کارروائی شروع ہوئی۔ ابلاغ خاتمرہ کے ذرائع کو اس کی تشریح کے لیے خصوصی احکام جاری ہوئے۔ لڑکتے لڑکتے ایک حکم مجھ تک پہنچا، کیونکہ میں بھی اشتہاری مشینری کا ایک اوٹی سپر رہ تھا۔ حکم ہوا اس مہم کو متروک بنانے کے لیے ایک اخباری مضمون لکھو۔

میں اس حکم کو پختہ ہاندے چٹا گنگ پہنچا جہاں ایسٹ بنگال رجمنٹ کا سنٹر تھا۔ ضروری کو الٹ دیکھیں سے بل سکتے تھے۔ وہاں بچا سنٹر کمانڈنٹ اپنے دفتر کے باہر بارہا جینٹلمن میں دھوپ بینک رہے تھے جن کو اپنی بنگالی قومیت کا احساس اور عجیب اثر میں کے

لے پیش کی منظورش و نفزی تقریباً آٹھ سو ہوئی ہے جن میں سے چھ سو کے قریب لڑائی میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔



ذاتی قرب پر بہت فخر تھا۔ وہ لان میں بار بار بچوں کے بل کھڑے ہو کر اپنے آپ کو اوپر کی طرف کھینچتے۔ بظاہر یہ جسمانی ورزش کی عمدہ عادت تھی، لیکن شاید اس کے پیچھے کوئی نفسیاتی الجھن تھی جو میری موجودگی (۶ فٹ قد) میں اور شدید ہو گئی تھی۔

سرکل صاحب نے میری آمد کا مقصد جانتے ہی دو ٹوک کہا: بنگالیوں کا کوٹہ دنگا کرنے کا کیا دھندہ راپٹنا چاہتے ہو؟ چھوڑو اس کو! کیونکہ اگر صدر کے حکم پر سو فیصد عمل ہو جائے تو جی اوز پاکستان میں بنگالیوں کی تعداد مشکل پندرہ فیصد ہو جائے گی، حالانکہ وہ قومی آبادی کا ۵۶ فی صد ہیں۔

سرکل صاحب نے کوئی اور پون گھنڈا بصیرت حاصل کرنے کے بعد میں ان کے دفتر سے نکلا اور ایک اور (مغربی پاکستانی) دوست کے ہاں گیا۔ دوپہر کے کھانے پر میزبان نے سنٹر کمانڈنٹ کا از خود ذکر چھڑا دیا کہ چند ماہ پہلے بنگالی رگروٹوں کا ایک دستہ سنٹر میں اپنی تربیت مکمل کرنے کے بعد کراچی روانہ ہونے لگا تو سرکل صاحب نے اسے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، تم اب خود اور بنگالی سپاہی ہو تم وہاں پنجابی افروں کے ٹوٹ پالش کرنے نہیں جا رہے۔ وقت آنے والا ہے کہ وہ تمہارے جوتے پالش کیا کریں گے۔

سرکل صاحب بنگالی سپاہیوں کے واحد سرپرست اور بی خواہ نہیں تھے۔ انہیں ایک حاضر نوکری والے بنگالی ایفینٹ جنرل اور ریٹائرڈ کرنل کی اعانت بھی حاصل تھی۔ میں ان دونوں سے ملا ہوں۔

خود ہی میں ڈھاکہ کے شمال میں جو دیوب پور کے مقام پر ایک تقریب ہونے والی تھی، اس کے مہمان خصوصی ایفینٹ جنرل وحی الدین تھے۔ انہیں وہاں ایسٹ بنگال رجمنٹ کی دوسری ٹیالین (جو نیز بائیکرز) کو رجمنٹل کلر عطا کرنا تھا۔ جنرل وحی الدین اس رجمنٹ کے کرنل کمانڈنٹ (اعزازی سرپرست) تھے، لیکن اس کے اصل سرپرست کرنل ایم اے جی عثمانی تھے جو فوج سے ریٹائر ہو کر مولوی لیگ کی سیاست میں سرگرم حصہ لیتے تھے۔ (بعد میں وہ عوامی لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور محجب کی کابینہ میں وزیر بنے) جنرل وحی الدین اس تقریب کے سلسلے میں مغربی پاکستان سے ڈھاکہ پہنچے تو ۱۴ ڈیڑھ بجے کے آفیسر میس میں ٹھہرے۔ انہوں نے مجھے طلب فرمایا کہ کرنل عثمانی بھی موجود تھے۔ جنرل صاحب نے اپنی تقریر کا مسودہ مجھے دیا تاکہ تقریب سے پہلے اس کی نقلیں بنوائی جائیں۔ میں تقریر لے کر واپس آ گیا۔ اگلے روز چھپ کر نکلا گیا اور اس بار ایک نئی تقریر میرے حوالے کی گئی۔ حکم ہوا کہ پہلی تقریر سنو، نئی تقریر طبع کرانی جائے۔ میں نے دونوں تقریروں کا موازنہ کیا، پتہ چلا کہ دوسری تقریر میں کرنل عثمانی کی خدمات کو زیادہ صراحت سے سراہا گیا ہے اور تمام بنگالی سپاہیوں سے کہا گیا ہے کہ آٹھ وقت میں ان کی رہنمائی پر بھروسہ کریں۔ تقریب کے بعد اس تقریر کی کچھ ہوئی نقلیں ملک کے دونوں بازوؤں میں تمام بنگالی فوجیوں میں تقسیم کی گئیں۔

کرنل عثمانی منحنی جسم، پست قامت، سن خوردہ شخص تھے۔ ان کے سیاہ چہرے پر سفیدی کا ذرا اندیشہ تھا جو ان کے سٹارڈ کے غالب ہونے پر بچھڑا ہوا تھا۔ سرکل صاحب کے درمیان دوست مذاق سے کہا کہ ان کے کوٹھنوں سے لٹکا ہوا شخص دیکھنا بڑا عثمانی کو دیکھ لو۔ (جنرل میں کرنل عثمانی کے کردار کے ہائے میں مفصل ذکر آگے آئے گا)۔

کرنل (ریٹائرڈ عثمانی) کرنل موجد اور جنرل وحی الدین بنگالی سپاہیوں اور افسروں میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ میرے جنرل خاں راجہ اس صورت حال سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بنگالی سپاہی اب ایسی ذہنی کیفیت میں ہیں کہ وہ اپنے گروڈیش کے سیاسی حالات نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جنرل صاحب کے سامنے یہ مثال موجود تھی کہ تحریک پاکستان کے دوران متحدہ ہندوستان میں مسلمان فوجی قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ ہندو بائیکاٹ رکھتے تھے اور ان کی ہمدردی آزادی کے پروانوں کے ساتھ تھیں۔ اگر اس سیاسی احساس کے باوجود آزادی ملنے تک



ان کا دہلیشن قائم رہا۔ تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سیاسی مدوجزر کے باوجود بنگالی سپاہیوں کا نظم و ضبط غیر معتبر عرصے تک قائم رہ سکے گا۔ جنرل راجہ کے انڈیشن کی ایک بنیاد مگر تلا سازش تھی جس میں ایک فوجی پلان بھی شامل تھا۔ جنرل راجہ کے مطابق اس پلان کے تین حصے تھے۔ تمام یونٹوں کے اسلحہ خانے (KOTES) کو ٹٹنا — غیر بنگالی فوجیوں کو غیر مسلح کرنا — اور چھائیوں پر قبضہ کرنا۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے جنرل راجہ نے کسی سرکاری کام کے بہانے اپنے بریگیڈ کمانڈروں کو (جو اتفاق سے غیر بنگالی تھے) ڈھاکہ طلب کیا۔ انہیں اسکاٹی نظریے کے بارے میں اعتماد میں لیا اور ہدایت کی کہ وہ احتیاطاً اپنی یونٹوں کا کچھ اسلحہ بیروں میں رکھیں تاکہ آئے وقت کام آسکے۔ جنرل راجہ نے مجھے بتایا: یہ مسئلہ اتنا نازک تھا کہ میں اسے اساطیر تحریر میں نہ لاسکا۔

جی اسی کے ان خدشات میں حقیقت کا کوئی عنصر تھا یا وہ محض ایک بچائی جرنیل کے دماغ کا فوٹو تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جنرل صاحب کے دل میں پیدا ہونے والے دوسرے خدشات کو جنم دے رہے تھے؟ کیونکہ ہم حالات کے لیے بھروسہ نہیں کر سکتے تھے جو بڑے تھے جہاں احمات کا منطقی تجربہ شکل تھا۔ مثلاً ایک دن یونٹی میں اپنے دفتر سے نکلا اور شہر میں ایک بنگالی افسر کے دفتر چلا گیا، وہاں ایک اور بنگالی بیٹھا تھا۔ دونوں جو گفتگو تھے، مگر مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو گئے۔ خاموشی کے چند ناگوار لمحے انتظار کرنے کے بعد میں نے کہا،

”کیسے جناب کیا ہو رہا ہے؟“

میزبان بولا

”... دراصل... دراصل ہم اگلے اتوار کو پھلی کے شکار کا پروگرام بنائے تھے۔“

”تو کیا میں بھی چلوں؟“

”... نہیں، نہیں... میرا مطلب ہے ابھی پروگرام فائنل نہیں ہوا۔“

بات ختم ہو گئی، مگر جالوں کے انداز سے مجھے شک گزرا کہ وہ درحقیقت عجیب کے بنگلہ دیش کی باتیں کر رہے تھے اور مجھے دیکھ کر پھلی کا ذکر لے بیٹھے، حالانکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی شکار کا پروگرام بنا رہے ہوں۔ حقیقت اور ہم کو جڈ کرنا واقعی ناممکن تھا۔

اس اندھیرے میں بصیرت حاصل کرنے کے لیے میں نے لینڈنگ جنرل صاحب اور دیوتوب علی خاں سے ملاقات کی اور اس خدشے کا اظہار کیا کہ شاید بنگالی اور غیر بنگالی افسروں کے درمیان اعتماد کا پھل ٹوٹ چکا ہے۔ جنرل یعقوب جو مجھ سے زیادہ باخبر اور دانشمند تھے اپنے رد عمل کو پی گئے۔ انہوں نے مجھے بتایا اور ایک پرنسپل فلسفیانہ نقطے سے میری توضیح کی۔ میں اپنے دوسرے لیے واپس چلا آیا۔

شاید جنرل یعقوب اور میں فوجی افسروں کے دو طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ مجھ جیسے جنرل افسروں کو اپنے کم تجربے اور محدود معلومات کی بنا پر رانی بھی پھاڑ نظر آتی تھی اور جنرل صاحب جیسے ذہین رسا رکھنے والوں کو پھاڑ بھی رانی لگتا۔ حقیقت یہ کہ پہنچنے میں ایک ڈشوری یہ بھی تھی کہ ہر چیز نظر ابھرنے کے بجائے غل میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ غل ابھی قائم تھا۔ اس میں شکاف ڈالنے کے لیے عوامی لیگ کے پاس انتخابی سرگرمیوں کے آٹھ مہینے باقی تھے۔

## باب ۳

# عجیب کا عروج

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگالی قومیت کی دبا تیز ہوتی جا رہی تھی اور فوجی طبقے اس کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ اس کو مزید بڑھانے کے لیے عوامی لیگ بڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ وہ ہر اس تقریب سے سر دھری اور بنگالی برتتی تھی سے قومی یکجہتی کو تقویت ملتی تھی اور ہر اس موقع کو اہمیت دیتی جس سے صوبائی عصیت کو فروغ حاصل ہوتا، مثلاً جب بھی یوم پاکستان (۲۳ مارچ)، یوم آزادی (۱۴ اگست)، یوم دفاع (۱۶ ستمبر) اور قائد اعظم کا یوم ولادت (۲۵ دسمبر) یا یوم وفات (۱۱ ستمبر) آیا، عوامی لیگ نے کوئی لپچی نہ لی، لیکن اس کے برعکس سارجنٹ ظہور الحق کی بری، لسانی فسادات کے شدید دل کا یاد اور اربند رنا تھ نیور کی جنم اشٹی کو ہمیشہ دھوم دھڑکتے سے منایا۔

سارجنٹ ظہور الحق ۱۹۶۸ء کی گرتلا سازش میں عجیب کے ساتھ ماخوذ تھا۔ وہ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں فوجی حراست میں ہلاک ہو گیا۔ ۱۵ فروری کو اس کی پہلی بری شرقی پاکستان کے انیس میں سے سترہ اضلاع میں شان و شوکت سے منائی گئی۔ ان تقریبات میں عوامی لیگ پیش پیش تھی۔ اس کے علاوہ ڈھاکہ کے اہم روزناموں نے سارجنٹ کی تصویریں اور حالات زندگی کو صلی سرخیوں کے ساتھ پہلے صفحات کی زینت بنایا۔ کئی مقامات پر مختلف جلسوں میں ظہور الحق کے جذبہ قربانی کو فراخ دلہ خراج پیش کیا گیا اور اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ مرحوم کا خون رائیگاں نہیں جائے دیا جائے گا۔ خود شیخ مجیب الرحمن نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: سارجنٹ ظہور الحق کا نام ہمیشہ تیر میر اور سر سبزین جیسے عظیم محبت وطنوں کے ساتھ لیا جائے گا۔

اگلے مئی ۱۹۶۲ء کے لسانی فسادات میں شدید ہونے والوں کی بری تھی۔ یرون بنگالیوں کے لیے بالعموم اور عوامی لیگ کے لیے بالخصوص جذباتی اہمیت رکھتا تھا۔ اس روز سب نے پناہ دلو لے اور جوش کا مظاہرہ کیا گیا۔ اخبارات نے خاص مہر چاپ کر تشدد کو نڈر اندھیت پیش کیا۔ سارا دن عظیم پورہ قبرستان میں شہداء کی قبروں پر لوگوں کا تانہ بندھا رہا۔ فنون لطیفہ کے کالج کے طلبہ و طالبات نے مرکزی شہید مینار سے عظیم پورہ قبرستان تک ساری سڑک کو مصوراہ نقش و نگار سے آراستہ کیا اور خود شیخ مجیب الرحمن نے آدھی رات کو شہید مینار پر حاضر ہو کر فانی طور پر خراج عقیدت پیش کیا۔ اسی روز ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب نے مطالبہ کیا: حکومت کے تمام دفاتر اور اداروں میں برسط پر بنگلہ زبان رائج کی جائے۔

لے پاکستان آرزو۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۶۰ء

لے مارنگ نیوز۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۶۰ء

لے مارنگ نیوز۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۶۰ء

پھر ہر بڑی کوشش زبان کے شاعر بنگور کا ایک سونو لہجہ میں دن تھا بنگور کے بیکار خیالات کی بنا پر حکومت نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اس کی شاعری کی نشر و اشاعت پر پابندی لگا دی تھی، مگر حکومت کے اس فیصلے کا بنگالیوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز سمجھتے تھے، چنانچہ اخبارات نے اس کے قلم پر اس کی بڑی بڑی تصویریں اس کی عظمت کے بارے میں مضامین اور اس کی نظموں کے تراجم (انگریزی اخبارات میں) نمایاں طور پر شائع کیے۔ بنگالی لوگوں اور لکھنؤ کے ٹیگور کی نظموں کا انیس اور اس کے گیتوں پر مبنی نگیٹ سجاد کا اہتمام کیا۔ خود عجیب جملوت و نوت میں ٹیگور کے شعرا دوسرے لکھنؤ کے تھے۔

بنگالی قومیت کو فروغ دینے اور بین الصوبائی رابطوں کو کھولنے کے لیے عوامی لیگ کی جمہوریت ایک اور مثال دودری کتابیں ہیں۔ ایک کتاب تھی "ویسٹ وکسٹری" (دھرتی اور لوگ) حکومت نے یہ کتاب ثانوی درجے کے نصاب میں شامل کر دی تاکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نظریاتی رشتوں کو اجاگر کیا جاسکے۔ یہی بات عوامی لیگ کی "انگوں کے خلاف تھی، چنانچہ اس کے ایما پر طلبہ نے اس کتاب کو نصاب سے خارج کرنے کے لیے زبردست مہم چلائی اور سہا بنایا کہ اس کے الفاظ جو بھل ہیں اور طلبہ کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلامی رشتے کا ذکر ان کو بوجھل لگتا تھا اور اسے مضحکہ منہ کرنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ اس کے برعکس قرآن میں کتاب "سوشل ہسٹری" (سماجی تاریخ) تھی جس میں مشرقی پاکستان کا ثقافتی رشتہ لکھتے سے ملایا گیا۔ اس پر حکومت نے پابندی لگا دی تھی، مگر طلبہ نے اس پابندی کے خلاف ایک پُر زور تحریک چلائی اور صوبے کے ممتاز شاعروں ادیبوں اور دانشوروں کو اپنے ساتھ لایا۔ خود عجیب نے اس کی حمایت میں یہ بیان دیا: "بنگالی زبان کے لیے ۱۹۵۲ء کی تحریک کو کچلا نہ جاسکا۔ ہم اب بھی بنگالیوں کے تہذیبی ورثے پر اس ختمے کی پُر زور مزاحمت کریں گے۔"

دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ عوامی لیگ کے رویے کی بنیادی قدر بھی یہی تھی کہ آیا وہ دونوں صوبوں کے درمیان یگانگت پسینا ہی یا منافرت! جنوری میں اس نے جماعت اسلامی کے جلسے کو مبینہ طور پر اس لیے درہم برہم کیا تھا کہ یہ دونوں صوبوں کے درمیان اسلامی رشتے پر زور دیتی تھی۔ اس ابتدائی قدم سے عوامی لیگ نے جماعت پر ایسی کٹھنی ڈالی کہ آئندہ انتخابات میں اس کے دوران بھی اس نے اپنا غلبہ قائم رکھا اور جماعت دب کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ عوامی لیگ نے پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی) کے جلسوں میں یکم فروری، ۲۸ فروری اور ۴ مارچ کو بالترتیب ڈھاکہ، چٹاگانگ اور سید پور میں گزرتی اور ۱۰ مارچ، ۱۵ مارچ اور ۱۲ اپریل کو کوئٹہ، پاریسال اور ڈھاکہ میں کنونشن مسلم لیگ کے جلسوں کو ناکام بنایا۔ اسی طرح کئی اور مقامات پر اس نے اپنے سیاسی حریفوں کے قدم چھنے نہ دیے۔

عجیب کے بڑے بڑے حریف مثلاً فضل القادر چودھری، خاں عبدالصبور خاں، مشرور الدین، پروفیسر غلام عظیم اور مولوی فہید احمد خیرم سیاسی دنگل میں عجیب کو براہ راست چیلنج کرنے کی سست نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اپنے اپنے حلقے میں اثر و رسوخ تھا، مگر صوبائی سطح پر عجیب سے ٹکرائیں ان کے بس میں نہ تھا، البتہ مولانا عبدالعزیز جاناں اس پوزیشن میں تھے کہ پیش میدان میں نکلے عام عجیب کی کسی گنج کے ساتھ چنگھاڑ سکتے تھے۔ وہ کئی بار ملنے آئے، خوب گرجے برے مگر پھر مطلع صاف کیونکہ مولانا کسی سیاسی مقصد کے لیے کوئی مملوٹا، سلسل یا تنظیم مہم چلانے کا لکھ نہ رکھتے تھے۔ وہ ایک بار گرجے پھر دم چڑھاتے۔ ایک دفعہ آگے بڑھتے پھر پیچھے ہٹ جاتے اور جب پہلے پناہ مرقف



بسمانی تبدیل کر لیتے۔ مثلاً انہوں نے عوام کے مسائل حل کرانے کے لیے یکم اگست کو عوامی تحریک چلانے کا اعلان کیا، یکم اگست قریب آنے لگا تو اسے ۸ ستمبر تک ملتوی کر دیا۔ جب نئی تاریخ قریب پہنچی تو ۲۰ اکتوبر بتادی اور آخر میں کچھ بھی نہ ہوا۔ "نہیں نہیں نش!" ایسی حرکتوں سے مشرقی پاکستان کی سیاست میں ان کی اہمیت بتدریج کم ہوتی گئی۔

مشرقی پاکستان کی سیاست کا یہ عروج و زوال — یعنی عروج عجیب کا اور زوال اس کے حریفوں کا — دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں آنے والے دھندلے دور کی تصویر واضح ہوتی آئی اور ہمیں احساس ہونے لگا کہ آئندہ انتخابات میں عوامی لیگ کے چھ نکاتی پروگرام کو اکثریت کی حمایت حاصل ہو جائے گی مگر سوال یہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو پاکستان کا کیا بنے گا؟ اس سوال کو روکنے کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے؟

یہ مسئلہ ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس میں بھی اٹھایا گیا جس کی صدارت خود جنرل یحییٰ خاں کر رہے تھے۔ یہ کانفرنس راولپنڈی میں منعقد ہوئی تھی اور تمام صوبوں کے گورنروں اور مارشل لاء اینڈ منسٹر شروں نے شرکت کی تھی۔ وائس ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن (گورنر مشرقی پاکستان)، کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس کانفرنس میں یہ نکتہ اٹھایا تھا: مزید بحث کرنے سے پہلے میں اس بات کی وضاحت چاہتا ہوں کہ آیا چھ نکات کا پرچار کرنا مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۹ کی خلاف ورزی ہے جو قومی سالمیت کے خلاف کوئی بات کہنے کی ممانعت کرتا ہے؟ — ایڈمرل احسن کا ارشاد ہے کہ انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا "آپ غلط کریں۔"

البتہ ملک میں ایسے بے شمار لوگ تھے جو اس بارے میں ٹکوند تھے۔ غالباً انہی کے خدشات دودر کرنے کے لیے جنرل یحییٰ خاں نے ۳۰ مارچ، ۱۹۷۰ء کو اپنی گونا گوں مصروفیات سے وقت نکال کر نشریاتی اداروں کے ذریعے قوم کو یقین دلایا تھا: "میں ایسی کوئی بات قبول نہیں کروں گا جو جاری قومی سالمیت کے منافی ہو۔" ان یقین دہانی کے اگلے روز قانونی ڈھانچا ایل ایف اے میں جاری ہو گیا جس کی بنیادی شقیں دو تھیں یعنی مملکت کا اسلامی کردار اور قومی سالمیت کی گارنٹی۔ مجھے یہ دونوں خصوصیات پڑھ کر بہت اطمینان ہوا، کیونکہ اس سے عوامی لیگ کے سیاسی موقف کی نفی ہوتی تھی جس کے ذریعے ایک طرف ملک میں یکو لفظ نظر پھیلایا جا رہا تھا اور دوسری طرف علما و صوبائی و صدقوں کے لیے راہ ہموار کی جا رہی تھی۔

یہ قانونی ڈھانچہ عجیب کو بہت ناگوار گزرا، خاص کر اس کی دفعات ۲۵ اور ۲۷ جن میں یہ شرط لگائی گئی تھی کہ کوئی "آئین اس وقت تک قابلِ نفاذ نہیں ہوگا جب تک کہ اس پر (صدر مملکت کی) مہر تصدیق ثبت نہیں ہو جاتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر عجیب الزمن قومی اسمبلی میں (جو ابتدائی ۹۰ دنوں کے لیے قانون ساز اسمبلی تھی) اکثریت حاصل کر بھی لیتے تو بھی چھ نکات پر مبنی آئین کو نافذ نہیں کیا جاسکتا تھا تا آنکہ یہی خاں اس پر صاف دیکھیں۔ اسی قدر ان سے مشتعل ہو کر عجیب الزمن نے کہا تھا: "میں انتخابات ختم ہونے ہی ایل ایف اے کے پُرزے کر دوں گا۔"

گویا جنرل یحییٰ خاں راولپنڈی میں بیٹھے کچھ اور علان کر رہے تھے اور عجیب الزمن مشرقی پاکستان میں کچھ اور کرنے کے درپے تھے۔ یہ تضاد دودر کرنے اور حالات کا خود جائزہ لینے کے لیے صدر مملکت ڈھاکہ تشریف لائے اور ۸ اپریل کو عجیب کو طلب فرمایا۔ جب ٹیپ ہاں پہنچے تو میں بھی موجود تھا۔ صدر یحییٰ خاں نے بڑی گرجو جی سے ان کا خیر مقدم کیا، جب وہ مسائل سے دست و گریباں ہونے لگے تو میں باہر نکل آیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے ڈھونڈ کر ایک "دست کے گھر سے بلوایا گیا، کیونکہ کینڈن ڈویژن کی جانب سے ایک ٹکری کا ایمر



جاری کرنا تھا جس کے ذریعے ایل ایف او کی قابل اعتراض دفعات (۲۵ اور ۲۷) میں ترمیم مقصود تھی۔ میں نے مسودہ تیار کر کے دے دیا اور چلا آیا۔ خوش قسمتی سے یہ اعلامیہ روک لیا گیا، کیونکہ دریں اثنا کسی نے یہ بھی خال کو مشورہ دیا تھا، حضور سیاست دانوں کے سامنے اپنے آپ کو یوں بے دست و پا نہ کیجیے؟

۱۰ اپریل کو یہی خال مغربی پاکستان روانہ ہوئے۔ ڈھاکہ ایئر پورٹ پر اخبار نویسوں نے انہیں گھیر لیا اور ایل ایف او کی نزاعی دفعات کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ ایک صحافی نے صدر کی طبعی تصدیق سے متعلق دفتر پر عوامی لیگ کے اعتراض کی طرف توجہ دلائی، یہ بھی خال نے کہا: یہ تو محض ضابطے کی غلط فہمی ہے، ورنہ میں ان اختیارات کو استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ یہ سن کر عوامی لیگ کے حامی ایک صحافی نے میرے کان میں کہا: صدر نے مجیب کو یقین دلایا ہے کہ یہ اختیارات استعمال کے لیے نہیں ہیں ان کی حیثیت برطانوی آئین کے تحت ملکہ یا بادشاہ کے اختیارات سے زیادہ نہیں؟

مجھے اندازہ نہیں اس یقین دہانی کے بدلے یہی خال کو کیا ملا؛ البتہ مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس سے مجیب کا یہ عقیدہ اور پختہ ہو گیا کہ وہ واقعی ہر دعوے پر جی نہیں سہا کرتا۔ اس مرحلے پر جہاں یہی خال بھی اس کی خواہشوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

یہی خال اور مجیب کی مخالفت کو مشکل دو مہینے گزرنے ہوں گے کہ جناب مجیب نے پھر پھر بڑے نکالنا شروع کر دیے۔ انہوں نے ہم جن کو اعلان کیا: میری پارٹی آئندہ انتخابات کو چھ نکات پر ریفرنڈم سمجھتی ہے۔ یہ ایک خطرناک اعلان تھا جس کا مسٹر نورالامین نے فوراً نوٹس لیا اور کہا: اگر آئندہ انتخابات کو چھ نکات پر دو گرام پر ریفرنڈم تسلیم کر لیا گیا اور مغربی پاکستان نے اس کی حمایت نہ کی تو دونوں صوبے الگ ہو جائیں گے۔ اس پر مجیب اور برہم ہوئے اور پیپس کے انداز میں پورے ہم نے گاندھی، نہرو اور ان کے انگریز سرپرستوں کی مخالفت کے باوجود ۱۹۴۴ء کا ریفرنڈم جیت لیا تھا اور اس مرتبہ بھی نورالامین اور ان کے سرپرستوں (مغربی پاکستان) کی مخالفت کے باوجود فتح ہماری ہو گئی۔

یہ مثال کوئی نیک شگون نہ تھی، کیونکہ بانی پاکستان نے ۱۹۴۴ء کے ریفرنڈم کو قیام پاکستان کی تہیہ بنایا تھا۔ کیا مجیب الزمن بھی کوئی نئی مملکت بنانے کے درپے تھے؟ یہی خال کے ایک مہتمم نے ڈھاکہ میں مجیب سے اس کی وضاحت چاہی، تو وہ صاف مگر گئے۔ کہنے لگے: نہیں نہیں میرا تو ایسا کوئی منشا نہیں۔ یہ مجیب کی پہلی قلابازی تھی نہ آخری۔ یہ دراصل ان کے کردار کا لازمی جزو تھا۔ مجھے کئی ایسے واقعات یاد ہیں جب وہ سرعام شہر کی طرح گرجتے، مگر اندر خانے منکھام کے سامنے بیٹھ جاتے۔ اس دعوے کا فائدہ یہ تھا کہ ایک طرف عوامی لیگ کی طرف کھینچتے تھے اور دوسری طرف منکھام بھی ناراض نہیں ہوتے تھے۔ اسی مکتب عملی کے ذریعے وہ سیاست کے اور بنیادوں کی طرف مائل ہوا رہے۔

# مارشل لا کا تمسخر

حکومت اس سیاسی مذہب کا متناشا دیکھتی رہی۔ ”مذہبی“ عوامی لیگ کا اور جزر اس کے حریفوں کا۔ بھول یا فوجی انتظام نے اقلیت کے ہاؤس میں کوئی مداخلت نہ کی اور اگر اس نے چند اقدام کیے بھی تو ان کا فائدہ عجیب ہی کو پہنچا۔ وہ انتخابی مہم کے دوران بتدریج عوام کی خاموش اکثریت کو خوف زدہ کر کے اپنی حمایت پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شاید صوبائی حکومت یہی خیال کے نرم رویے کی یہی توضیح سمجھتی تھی۔

جنرل یحییٰ خاں نے عجیب کی طرف نرم رویہ کیوں اختیار کیا؟ آخر ایک ڈکٹیٹر کو کیا پڑی تھی کہ ایک سیاسی لیڈر کے مطالبات پر مطالبات ماننا جائے (مثلاً ایک آدمی ایک ووٹ کا اصول، ون پونٹ کی تسخیر) اور وہ بھی ایسے شخص کے جس پر اس کے پیش رو (فیلڈ) مارشل ایوب خاں) نے قداری کے الزام میں مقدمہ چلایا تھا۔ عام قیاس یہ تھا کہ یحییٰ خاں، مارشل لا اٹھ جانے کے بعد بھی ملک کا صدر رہنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسی خواہش تھی جس کی تکمیل عجیب الزخم کی تائید کے بغیر ممکن نہ تھی۔ پتہ نہیں اس قیاس میں حقیقت کتنی تھی۔ میں نے تو جنرل یحییٰ کی زبانی اس نرمی کی وجہ یہی سنی: ”مجھے پاکستان کے آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑے صوبے کو سمجھنے لے کر چلنا ہے۔ اگر عجیب اس کی نمائندگی نہیں کرتا، تو کون کرتا ہے؟“

امور مملکت کو بیشک خسرواں ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ یحییٰ خاں کی مجبوریاں بھی انہی کو معلوم ہوں گی۔ مجھے تو اتنا علم ہے کہ عوامی لیگ نے اس نرم پالیسی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا اور وہ اس میں کامیاب ہوئی۔ گورنمنٹ ہاؤس یا مارشل لا ہیڈ کوارٹر نے اس مذہب زور گھوڑے کو گام دینے کی کوئی کوشش کی نہ دوسرے سیاسی گھوڑوں کو ریس جیتنے کے لیے تھکی دی۔ وہ غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھے سر پر نام کھڑے متناشا دیکھتے رہے۔

یکم ستمبر ۱۹۹۹ء کو جب وائس ایڈمرل ایس ایم احسن مشرقی پاکستان کے گورنر بنے، صوبائی نظم و نسق کی ذمہ داری یوں تقسیم کی گئی کہ اس وادان قائم رکھنا بھول انتظامیہ کا کام ہو گا اور مارشل لا مشینری جس کے سربراہ ایڈیشنٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خاں تھے اسی وقت حرکت میں آئے گی جب بھول انتظامیہ بے دست و پا ہو جائے یا حالات اسے بے اثر کر دیں۔ ایڈمرل احسن اور جنرل یعقوب دونوں ہی اپنے اپنے شعبوں کے حاکم اعلیٰ تھے۔ ایک دوسرے کے آگے جواب دہ نہ تھا۔ دونوں براہ راست جنرل یحییٰ کے ماتحت تھے جو جب تک چارہمدول پر فائز تھے۔ صدر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، افواج پاکستان کے سپریم کمانڈر اور بری فوج کے کمانڈر انچیف۔

جنرل یعقوب اپنے منکرانہ ذہن، ملائم طبیعت اور شائستہ اخلاق کے لیے مشہور تھے۔ وہ مسائل کو سمجھنے اور آنے والے طوفان کا قبل از وقت



جنرل آغا محمد یحییٰ خاں  
صدر پاکستان







# شیخ صاحب جیت گئے

عوامی لیگ درحقیقت پولنگ سے پہلے ہی انتخابات جیت چکی تھی، مگر ممبر اس کی رسی تو تین کاون تھا۔ اس کا احساس تقریباً سب لوگوں کو پہنچا تھا اور انہوں نے الیکشن سے پہلے ہی چڑھتے سٹونج کی پرستش شروع کر دی تھی، دھاکہ ٹیل ورژن کے بنگالی جنرل میجر نے یکم دسمبر کو مجھ سے کہا: مجھے شیخ صاحب کے پاس جا کر اس بات کی معذرت کر لینی چاہیے کہ ہم دور افتادہ علاقوں میں ان کے جلسوں کی تشہیر نہ کر سکے، کیونکہ ہیڈ کوارٹر (راولپنڈی) سے حکم آیا تھا کہ صرف بڑے بڑے شہروں میں اپنی کیرئیر میں جیسے شیخ صاحب یقیناً اس پر خفا ہوں گے۔ وہ برسرِ اقتدار اگر ممکن ہے آپ (بادردی) لوگوں کو کچھ نہ کہیں، لیکن مجھے ہرگز نہیں بخشیں گے۔“

دھاکہ کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایسے ہی خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: میں نے ۲۲ مئی کو پوسٹو گولڈ میں عجیب کے حامی مزدوروں پر لاکھی چارج کروایا تھا۔ مزدوروں نے ضرور میرا نام شیخ صاحب کو بتا دیا ہو گا اور ان کو یہ واقعہ اب بھی یاد ہو گا، دوجھے نہیں بخشیں گے۔“

عام شہری کے احساسات کی ترجمانی میرے ایک دوست رحمن نے یوں کی: ”ملک بلامنی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اگر عوامی لیگ انتخابات جیت گئی، تو وہ حریفوں کی زندگی امیر کرے گی اور اگر نہ جیت سکی، تو تشدد پر اُتر آئے گی تاکہ کوئی اور اقتدار میں نہ آ سکے۔ وہ ہر قیمت پر اپنا تسلط قائم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔“

فوجی حلقوں سے ملنے والی خبریں جس کے ایک افسر نے کہا: حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے پر اگر شیخ صاحب نے اگر کڑا سا دیش کیس کے کاغذات طلب کیئے تو ان کو کئی مقامات پر فدی کا نام نظر آئے گا اور وہ اتنے باظرف اور شادہ دل انسان نہیں کہ کسی کو معاف کر دیں یا ان باتوں کو نظر انداز کر دیں۔“ فوج کے کئی سینئر افسروں نے نظائر عجیب کو ناراض کرنے والی کوئی حرکت نہیں کی تھی، وہ بھی اس کی حمایت میں زور بیان صرف کر رہے تھے، وہ بلند بانگ چھ نکات کے گن گاتے اور عوامی لیگ کے منشور کی برکات گناتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یوں مستقبل کے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کر سکیں گے۔

جب کہ فوجی اور غیر فوجی حلقوں کو عوامی لیگ کی فتح یقینی نظر آ رہی تھی، خود عوامی لیگ عجب ذہنی کیفیت کا شکار تھی۔ اس کی حالت اس تحلیل سے طبعی ملتی تھی جس نے دور چیتنے کی پوری تیاری کر رکھی ہو، لیکن اُسے یقین نہ ہو کہ دوڑ ہوگی بھی یا نہیں اور اگر ہوئی، تو اس کو اپنی محنت کا فربہ ملے گا یا نہیں۔ عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے کئی افراد نے مجھ سے اور دوسرے حضرات سے اس بات کی تصدیق کرنا چاہی کہ واقعی ممبر کو حسبِ وعدہ الیکشن ہوں گے؟ اس تشویش کا باعث یہ افواہ تھی کہ بری فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل حمید نے جنرل کینی سے اقتدار چھین لیا ہے۔ بچی خاں بے بس ہیں اور حمید کسی وقت انتخابات منسوخ کر کے ایک نئے باب کا آغاز کرنے والے ہیں۔ اتفاق

(ج) سپاہیوں کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا جائے تاکہ وہ اشتعال کا باعث نہ بنیں،

(د) صرف بولے کو فزونی کے لیے کارروائی کی جائے۔

ان ہدایات کی روشنی میں انتخابات کی نگرانی کرنے کے لیے مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں ایک آپریشن روم قائم کیا گیا۔ دسمبر کا سونچ پوری آب و تاب سے طوع ہوا۔ متعلقہ افسروں نے آپریشن روم میں اپنے فرائض نبھائے اور جنرل یحیٰی بک کا پٹر کے ذریعے پولنگ اسٹیشنوں کا فضا کی جائزہ لینے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم نے اوپر سے لوگوں کے ٹھٹھہ دیکھے۔ مگر منظم اور پرانے جنرل صاحب یہ منظر دیکھ بہت خوش ہوئے۔

واپس آکر میں آپریشن روم میں بیٹھ گیا، کیونکہ مجھے معلومات کا یہی مرکز تھا۔ دن کے ابتدائی حصے میں وہاں مشتعل فوجی افسر چپ اور کسی حد تک تباہ کا شکار تھے، مگر جب دوپہر تک کسی ناخوشگوار واقعے کی خبر نہ پہنچی، تو وہ بیڑیج نارمل ہونے لگے۔ ماحول میں ملائمت اور ان کے چہروں پر اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد گپ شپ کا ماحول عموماً کیا ہم گپ شپ لگاتے تھے اور ایک صاحب دائیں اور ٹیلیفون سے سنتے رہے، جو کوئی ان سے پوچھتا تو اس کو پرامن انتخابات کا مزہ منادیتے۔ ایک دوبار راولپنڈی سے بھی فون آیا، انہیں بھی سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دے دی گئی۔

پولنگ اسٹیشنوں پر حالت مختلف تھی، عوامی لیگ کے غنڈوں نے اکثر مقامات پر دہریہ جھارکھا تھا، وہ مرضی سے ووٹ ڈال رہے تھے۔ پولنگ افسروں اور ریڈیو لنگ افسروں نے اپنے مستقبل کے حکمرانوں کو نمانی کرنے کی چھٹی دے رکھی تھی۔ حریف جماعتوں کو دادرسی کے لیے فوجی افسروں کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا، مگر وہ اس وقت تک مداخلت کرنے کے مجاز نہ تھے جب تک کہ امن عامر میں خلل نہ پڑے۔ مثال کے طور پر دو واقعات درج کرتا ہوں:

ضلع ٹانک میں چوہدرانی کے مقام پر ایک بارہ سالہ لڑکا بیگلہ کوش زندہ باؤ کے نرے لگاتا پولنگ بوتھ میں ووٹ ڈالنے آیا۔ عوامی لیگ کا مخالف اُمیدوار اس بچے کو پکڑ کر کیپشن چودھری کے پاس لے گیا جو اپنی پلاٹن سمیت ساتھ والی عمارت میں چھپے بیٹھ تھے۔ اُمیدوار نے شکایت کی کہ اول تو یہ لڑکا عمر کے لحاظ سے ووٹ دینے کا اہل نہیں، دوم یہ پولنگ بوتھ میں نرے لگاتا تو ان کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ کیپشن صاحب نے عرضداشت ہمدردی سے سنی مگر یہ کہہ کر کسی قسم کی کارروائی کرنے سے مندرت کر لی کہ میں اس کا مجاز نہیں آپ ریڈیو لنگ افسر سے شکایت ہے۔

دوسرا واقعہ ٹنڈیل سے متعلق ہے جہاں زمین نامی شخص کو میجر خان کے سامنے پیش کیا گیا، کیونکہ وہ پولنگ افسر کی ملی بھگت سے پانچویں مرتبہ اپنی پرچی ڈالنے جا رہا تھا۔ میجر صاحب نے شکایت سننے کے بعد فرمایا: بندہ نواز! آپ کا ارشاد درست، مگر میرا دور دسمبر نہیں کو کہ کتنی مرتبہ ووٹ ڈالتا ہے۔ مجھے یہ بتائیے کہ کوئی خون خرابہ ہوا ہے یا نہیں؟

سارا دن یہ تماشہ دیکھنے کے بعد جب دسمبر کا سونچ مغربی افقی میں اپنا منہ چھپانے لگا، تو جنرل یعقوب، میجر جنرل رائوفران علی کے دفتر میں (جو سول معاملات کے پانچ تھے) داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر طمانیت اور خیر کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے داخل ہوتے ہی کامرانی کے انداز میں کہا: مجھے خوشی ہے حالات پُر سکون رہے اور انتخابات منعقد اور آواز دہراؤ ماحول میں منعقد ہو گئے۔ جنرل فران نے کہا: بیشک۔ آزاد۔۔۔ کیسے آزاد!

چار روز بعد (۱۱ دسمبر) جنرل یحیٰی خاں نے عساکر پاکستان کے تمام افسروں اور جوائن کو دادرستی کا یہ پیغام بھیجا: پرامن انتخابات

سے یہ دونوں جنرل ان دنوں ڈھاکہ میں مقیم تھے۔

۳ دسمبر کو جنرل یحیٰی خاں مغربی پاکستان روانہ ہونے کے لیے ڈھاکہ ایئر پورٹ پر پہنچے تو ایک غیر ملکی صحافی نے خود ان سے پوچھ لیا: مسٹر پریذیڈنٹ! کیا اب بھی ملک کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں ہے؟ صدر نے کہا: ہاں ہاں بالکل بالکل، صحافی بولا: مگر یہاں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ....؟ یحیٰی خاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: سر! سر! کلاس...! نعو! انہوں نے جھنجھلاہٹ میں بائیں جانب گردن موڑی (جہاں میں اور چند افسر کھڑے تھے) اور اپنی بھاری ہلکیس تیز تیز جھکتے ہوئے کہا: کون ہے جو میرے اختیارات میں شریک ہے؟ کون ہے؟... جب تک میں نہ چاہوں یہاں کوئی پرنسپل مار سکتا، یہ کہتے ہی وہ ہونٹ بھینچنے، ڈنڈا گھماتے پولنگ میں سوار ہو گئے۔

انتخابات کی تاریخ قریب پہنچی تو کوئی ایک سو غیر ملکی صحافی ڈھاکہ پہنچ گئے۔ میں نے اس سے پہلے صحافیوں کی اتنی بڑی تعداد وہاں کبھی نہ دیکھی تھی، حالانکہ ہم سیلاب اور سائیکلون جیسے قومی سانحوں سے گزر چکے تھے۔ وزارت اطلاعات و نشریات نے ان صحافیوں کے اعزاز میں دسمبر کو پوربانی ہوٹل میں مشاعرہ و اجلاس میں بھی مدعو تھا۔ کھانے کی میز پر میرے ساتھ تین غیر ملکی صحافی تھے۔ گفتگو کا موضوع اگلے روز کے الیکشن تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا:

”میرے یہ بتاؤ تم اپنا ووٹ کس کو دو گے؟“

میں نے جواب دیا:

”صرف ایک ہی تو پارٹی ہے۔ عوامی لیگ۔“

وہ اس جملے کو چندہ جواب سمجھا اور صاف اپنا سر ہلانے لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں مارشل لا ہیڈ کوارٹر گیا جو صوبائی اسمبلی کی عمارت میں واقع تھا۔ وہاں چند افسر بیٹھے غیر رسمی طور پر اس مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ آیا نظم و ضبط رکھنے کے لیے دفعہ ۴۴۴ لگادی جائے جس کے تحت چار پارٹ سے زائد افراد کے اجتماع اور اسلحہ رکھنے کی ممانعت ہو رہی ہے۔ جو افسر یہ پابندی لگانے کی حمایت کر رہے تھے ان کا خیال تھا کہ اس کے بغیر امن و امان بھال رکھنا ناممکن ہوگا اور جو اس کے مخالف تھے ان کا استدلال یہ تھا کہ الیکشن کے دن یہ تجربہ ناقابل عمل ہوگی۔

مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک صاحب بلند آواز میں بولے: ”یہیے ہمارا رائے عامر کا ماہر“ آگیا اس سے پوچھتے ہیں:

میں نے اپنے اوپر ہارنر بنیدگی طاری کرتے ہوئے کہا:

”میں رائے عامر کے متعلق اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ اس موقع پر یہ پابندی موزوں نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ کشیدہ ماحول میں یہ جلتی پرتیل کا کام کرے گی۔ عوامی لیگ کی حیثیت یقینی ہے۔ وہ اپنے مفاد میں امن و امان بھی بھال رکھے گی، تعجب کی بات کہ میرے انداز فکر کو واقعی ہارنر رائے سمجھ کر تسلیم کر لیا گیا۔ میں اس سے بہت محظوظ ہوا۔“

الیکشن سے چار روز پہلے عساکر پاکستان (زیادہ تر ترقی فوج) کو انتخابات کی نگرانی سونپی گئی تھی، مگر ان کا دائرہ کار مشتعل کر دیا گیا تھا۔ راولپنڈی سے موصول ہونے والی ہدایات کا پکڑنا تھا:

(۱) پولنگ میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

(ب) صرف نازک مقامات (ٹیلیفون ایجنس، تار گھر، بینک، ریڈیو اسٹیشن وغیرہ) پر نگاہ رکھی جائے۔



منعقد کرنے میں عساکر پاکستان کے تمام افسروں نے جس غیر جانبداری، فرض شناسی اور ضبط کا مظاہرہ کیا ہے وہ داد اور تحسین کا مستحق ہے۔ یہ اس پُر امن ماحول کا نتیجہ نہ بلکہ دوستوں کے سوا ساری پیشین سواری کی جھولی میں جا پڑیں۔ غیر سرکاری گنتی مکمل ہوتے ہی اس غیر ملکی صحافی نے جس کے ساتھ میں ۴۰ دسمبر کو ایک ہی میز پر کھانا کھایا تھا، اپنے ہوٹل سے مجھے فون کیا: ممبر! بہت بہت مبارکباد! آپ کی پادری جاری اکثریت سے جیت گئی۔ بلکہ اس نے گویا جھارو ہی پھیر دیا۔ میرے لیے یہ مبارکباد فہم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر جیتنے والے گھوڑے کو کون نہیں اپناتا!

عوامی لیگ نے الیکشن تو جیت لیا، اب دیکھنے کی بات یہ تھی کہ اس بھرپور کامیابی سے اس کے رویے میں فرائض آتی ہے یا اس کا سر غرور سے اُردا کر جاتا ہے۔ اس کا کوئی جواب دستیاب نہ تھا۔ مجھے وہ کہ شیخ مجیب کے آئینی مشیر ڈاکٹر کمال حسین (جو بعد میں بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ بنے) سے اپنی ملاقات یاد آ رہی تھی جو ایک ماہ قبل ڈھاکہ انٹر کانٹری نیشنل کے سیمینار میں جہنمی تھی۔ اس ملاقات کے دوران میں نے عوامی لیگ کی یقینی کامیابی کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ شیخ مجیب الرحمن کو صوبائی لیڈر کے بجائے قومی قائد کے طور پر پیش کریں اور اگر ممکن ہو تو مغربی پاکستان کا بھی دورہ کر لیں تاکہ پورے پاکستان کے وزیر اعظم کے طور پر قابل قبول ہو سکیں۔ انہوں نے میری تجویز کو سراہتے ہوئے کہا تھا: اس پر ہم انتخابات کے بعد ہی عمل کر سکیں گے، کیونکہ ہم آئندہ انتخابات چھ نکات اور بنگالی قومیت کی بنیاد پر لڑ رہے ہیں۔ اگر ہم نے اس وقت پیڑ تو بدلا، تو کوئی عجیب نہیں یہاں بھی الیکشن بار جائیں۔ ایک مرتبہ ہم عوام کی حمایت حاصل کر لیں تو چھ نکات میں ایسی ترمیم کر دیں گے کہ وہ مغربی پاکستان کے لیے بھی قابل قبول ہو سکیں۔

میں الیکشن کے بعد ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لیے بے تاب تھا تاکہ اندازہ کر سکوں کہ وہ کہاں تک اپنی بات پر قائم ہیں۔ دسمبر کے وسط میں ان سے پھر ملاقات ہوئی، میں نے سابقہ ملاقات کا حوالہ دیا، مگر وہ مشرقی پاکستان کے متلون مزاج موسم کی طرح بدل چکے تھے انہوں نے فرمایا: اب چھ نکات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ قوم کی امانت ہیں، ان سے کسی قسم کا انحراف لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہو گا۔

اسی نقطہ نظر کا اعلان خود پارٹی کے صدر شیخ مجیب الرحمن نے الیکشن کے دو روز بعد ان الفاظ میں کر دیا تھا: بنگلہ دیش کے عوام نے یہ انتخاب چھ نکات، گیارہ نکات اور صوبائی خود مختاری پر ریفرنڈم کی حیثیت سے جیتے ہیں؛ لہذا چھ نکات پر مبنی ایسے دستور کی تشکیل از بس ضروری ہے جس میں مکمل خود مختاری کی پوری پوری ضمانت دی گئی ہو۔

اگر مجیب الرحمن اس موقف پر سختی سے قائم رہتے ہیں اور اپنی اکثریت کے زور پر چھ نکات پر مبنی آئین پاکستان پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا راستہ کون روک سکتا ہے؟ ایسی صورت میں افواج پاکستان کا کردار کیا ہو گا؟ کیا وہ باعزت طریقے سے اقتدار سے الگ ہو کر ملک کی قسمت عوامی لیگ کو سونپ دیں گی؟ اس کا جواب ہمیں ڈھاکہ میں نظر نہیں آتا تھا؛ البتہ جنرل یحییٰ کے ایک متحد جنرل..... دسمبر کے آخر میں وہاں پہنچے اور گورنمنٹ ہاؤس میں ایک مصیافت کے بعد اربابِ عمل و عمل کی سوچ سے اتنا پروردہ اٹھایا، آپ ٹھکر کریں ہم ان کالے حرامیوں کو اپنے آپ پر ہرگز حکومت نہیں کرنے دیں گے۔

۱۔ رفقا، پاکستان آج بروز، ڈھاکہ - ۱۲ دسمبر، ۱۹۷۰ء

۲۔ روزنامہ پاکستان آج بروز، ڈھاکہ - ۱۰ دسمبر، ۱۹۷۰ء

۱۔ پاکستان آج بروز، ڈھاکہ - ۳۰ جنوری، ۱۹۷۱ء



# لاڑکانہ پلان

عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں ۱۹۲۲ میں سے ۱۹۰ نشستیں جیت کر زبردست متحرک مارا، مگر مغربی پاکستان میں ایک سیٹ بھی حاصل نہ کر سکی۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں ۱۳۸ میں سے ۱۸ نشستیں جیت کر پورے مغربی باندوں اکثریت حاصل کر لی مگر مشرقی باندوں میں ایک امیدوار بھی کھڑا نہ کر سکی۔ اس سے ایک دلچسپ، مگر نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔

میں پہلے باب میں الیکشن کے فدا بعد شیخ مجیب الرحمن اور ان کے رفقاء کے سخت رویے کا ذکر کر چکا ہوں۔ جہاں تک بھٹو کا تعلق ہے وہ بھی پنجاب اور سندھ میں اپنی جیت سے خوب بھولے بیٹھے تھے۔ ۲۰ دسمبر کو انہوں نے لاہور میں کہا: ہمیری جماعت کے تعاون کے بغیر نہ کوئی دستور بنایا جاسکتا ہے اور نہ مرکز میں کوئی حکومت چلائی جاسکتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پنجاب اور سندھ طاقت کے سرچشمے ہیں جن میں ان کی پارٹی کو اکثریت حاصل ہے اس لیے مرکز میں قائم ہونے والی کسی بھی حکومت کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ انہوں نے لوگوں کو یقین دلایا کہ پی پی پی اپنے اغراض و مقاصد سے سب سے موافق نہیں کرے گی اور وہ اگر برسر اقتدار آئی۔ اور جب بھی آئی۔ اپنے پروگرام کی ایک ایک شق کو عملی جامہ پہنائے گی۔

ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری مشرانج الدین نے مشر بھٹو کے اس بیان کا تکیہ بڑی کی جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ عوامی لیگ ملک کا دستور بنانے اور مرکز میں حکومت چلانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم کسی دوسری پارٹی کے تعاون سے۔ اور اس کے بغیر بھی۔ یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ پنجاب اور سندھ اب طاقت کا سرچشمہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم بہتر مستقبل کے خواہشمند ہیں تو ہمیں اس قسم کے دعوؤں سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ اس سے غیر ضروری اور نقصان دہ بحث چھڑ سکتی ہے۔

دو دنوں مضبوطی کے درمیان یہ ٹوٹو ٹیس میں یقیناً تشویش کا باعث بنی ہیں۔ اس پر بہت سے نوجوان فوجی افسروں کو بھی مشکوک کیا، حالانکہ وہ سیاسی الجھائو سے عموماً دور ہی رہتے ہیں۔ ان میں سے وہ جوان دو دنوں مشر بھٹو کو اپنی آرزوؤں کا مظہر سمجھتے تھے، اکثر کہتے: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک صوبہ سائے ملک پر سواری کرنے لگے؟ اس کے برعکس دوسرے لوگ جو مقامی حالات کا پورا پورا ادراک رکھتے تھے، کہتے: ”ہم گزشتہ ۲۳ برسوں سے جنگالیوں پر سواری کر رہے ہیں۔ اب ان کی باری ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم ہمیشہ ان پر کاٹھی ڈالے کریں۔“ یہ احساسات وجہ بات جن میں میں بھی سانس لے رہا تھا، اس سطح سے کہیں نیچے تھے جہاں ملک کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

۱۔ پاکستان آئیندہ ڈھاکہ۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۰ء

۲۔ پاکستان آئیندہ ڈھاکہ۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۰ء



اور اُوچی سٹیں عونا برف پوش تہتی ہیں۔ ان دنوں بھی اُوچی سٹ پر برف پڑی ہوئی تھی اور مصالحت کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ۱۹۷۱ء کے ابتدا میں برف پگھلنے کی ایک صورت پیدا ہوئی۔ دونوں صوبوں میں راہ دوسم کی کچھ ابتدا ہوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے غلامیگ سے مذاکرات کی خواہش ظاہر کی اور اس کے لیے راہ ہموار کرنے کی غرض سے اپنا خصوصی ایلچی ڈھاکہ بھیجا۔ ایلچی کی روانگی سے چند روز قبل فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے مٹر بھٹونے کہا، ہم مشرقی پاکستان کی اکثریت کا خیر مقدم کرتے ہیں، ہمیں ان پر اعتماد ہے۔<sup>۱۰</sup>

۱۔ روزنامہ ڈان کراچی - ۲۸ دسمبر ۱۹۷۰ء

یہ ان کے انداز فکر کو سمجھنا مشکل ہے، اب تو ہم بہتر دلوں کی توقع کرنے ہی پر قناعت کر سکتے ہیں۔

جنرل یحییٰ خاں اس ذہنی تلاطم میں ۱۴ جنوری کو ڈھاکہ سے روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل ایروپورٹ پر صحافیوں نے انہیں گھیر لیا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ جنرل یحییٰ خاں زیادہ پُر اعتماد نظر نہیں آتے تھے، لیکن ان کے کسی جواب، تبصرے یا اشارے سے ان کے آئندہ عزائم کی جھلک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ مستقبل کا انحصار عجیب الرحمن کے فیصلوں پر ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا: "اُن (عجیب) سے پوچھو، وہ ملک کے آئندہ وزیر اعظم ہیں... جب وہ ملک کی باگ ڈور سنبھالیں گے تو میں یہاں نہیں ہوں گا۔"

جنرل یحییٰ خاں کی روانگی کے بعد ایک بنگالی اخبار نویس نے مجھ سے کہا کہ صدر کے بیان میں کلیدی جملہ یہ تھا کہ... تو میں یہاں نہیں ہوں گا۔ اس صحافی کے مطابق عوامی لیگ نے جمہوری نظام میں یحییٰ خاں کو صدر بنانے سے انکار کر دیا تھا تاہم وہ عوامی لیگ کے آئینی مسودے کی تصدیق پر تیار نہیں ہوتے۔

جنرل یحییٰ خاں ایک دن کراچی میں سستانے کے بعد سید سے لاڑکانہ پہنچے جہاں ذوالفقار علی کے ممان بنے۔ مجتو یحییٰ خاں کے دورہ ڈھاکہ پر کڑی نظر رکھتے ہوئے تھے۔ وہ کسی ایسی مصالحت کے حامی نہ تھے جس میں انہیں اور ان کی پارٹی کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ مجتو نے یحییٰ خاں اور ان کے ساتھیوں کی بڑی آؤ جھلکت کی۔ مرنغابی کا شکار کھلایا۔ اس ممان فوازی میں چیف آف اشاف (آرمی) جنرل عیوب محمد بھی شامل ہوئے۔ ان کی موجودگی نے ڈھاکہ میں یک سخت شکوک و شبہات پیدا کر دیے۔ عوامی لیگ نے یہ تاثر بھیجا کہ شروع کر دیا کہ عجیب نے یحییٰ خاں سے جو سخت رویہ اختیار کیا ہے اسے اس کی سزا دینے کے لیے لاڑکانہ میں سازش کی جا رہی ہے اور اظہار ہے کہ کوئی سازش (بقول عوامی لیگ) اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اسے فوج کی اشیاء باوجود حاصل نہ ہو۔

انہی دنوں ڈھاکہ کے اخبارات میں صفحہ اول پر ایک تصویر چھپی جس میں جنرل یحییٰ خاں اور مسٹر مجتو کو المرقضے کے وسیع اور خوبصورت سبزوار میں چل تھمی کرتے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر نے ڈھاکہ میں پیدا ہونے والے شبہات کو تقویت بخشی۔ اکثر بنگالیوں نے اس سے تاثر لیا کہ مجتو اور یحییٰ کی دوستی اور بنگالیوں کی پاکستان کے لیے اچھی علامت نہیں۔ ایک بنگالی دوست نے مجھ سے کہا: "فراس (یحییٰ) کو دیکھو عجیب یہاں آتا ہے تو اپنے کسی اشاف افسر کے ذریعے (اکثر یحییٰ پارٹی کے سربراہ) عجیب الرحمن کو ایوان صدر میں طلب کرتا ہے اور جب وہاں جاتا ہے تو درحقیقت یحییٰ پارٹی کے سربراہ، مجتو کے پاس ہتھ پڑتا ہے۔ کیا فوج، جمہوریت کے لیے یہی جذبہ احترام رکھتی ہے؟"

لاڑکانہ کی ملاقات کے متعلق کئی باتیں سننے میں آئیں۔ کسی نے کہا کہ وہاں مجتو اور یحییٰ خاں کے درمیان باہمی تعاون کا خفیہ سمجھوتہ طے پایا ہے۔ کسی نے کہا کہ یحییٰ خاں نے صدر کی کرسی سے چھٹے رہنے کے لیے مجتو کو استعمال کیا اور کسی نے کہا کہ مجتو نے عجیب کو راستے سے ہٹانے کے لیے یحییٰ کو آدھ دیا۔ میں ان خبروں کی تائید یا تصدیق کے قابل نہیں ہوں کیونکہ یہ واقعات ڈھاکہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار کلومیٹر دور ہوئے تھے۔ میں ان کا شائبہ نہیں۔ ان واقعات کا ایک ہی ریکارڈ دستیاب ہے جو مسٹر مجتو کی لکھی ہوئی کتاب "گریٹ ٹریجڈی" (عظیم المیہ) میں ہے اس میں وہ لکھتے ہیں: (صفحہ ۲۰)

"صدر نے عجیب سے اپنی گفتگو کے بارے میں مجھے آگاہ کیا اور بتایا کہ انہوں نے عجیب سے کہہ دیا ہے کہ اس کے سامنے میں راستے میں (۱)

۱۳ جنوری ۱۹۷۱ء

وہ تباہی مٹانی سے چلے (۲) پی پی پی سے تعاون کرے (۳) پی پی پی کو نظر انداز کر کے مغربی پاکستان کی چھوٹی چھوٹی شکست خوردہ پارٹیوں کی حمایت حاصل کرے۔ اس ضمن میں صدر نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ملک کی دواں اکثریتی پارٹیوں میں مخابہت کو ترجیح دیں گے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے صدر کو چھ نکات کے مضمرات سے آگاہ کیا اور ان کے بارے میں اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا، تاہم ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ہم کوئی قابل عمل راستہ تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور عفریب ڈھاکہ جاکر عوامی لیگ سے بات چیت کریں گے۔"

لاڑکانہ میں مرنغابیوں کا شکار کھیلنے کے بعد صدر اور ان کے ساتھی راولپنڈی سدھائے اور چند روز بعد (۲۶ جنوری) مسٹر مجتو اپنے فقار سمیت ڈھاکہ چلے گئے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے لاڑکانہ سازش کے میس سائے ڈھاکہ پہنچ چکے تھے۔ مجھے جیسے افراد جن کا تعلق براہ راست عوامی لیگ سے تھا نہ پی پی پی سے، یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسٹر مجتو یحییٰ خاں کی میزبانی کا شرف حاصل کے بغیر ڈھاکہ تشریف لے جاتے تو فضا اتنی مکدر نہ ہوتی۔ اس میزبانی کے جواہرات ڈھاکہ میں مرتب ہوئے تھے ان کا یا تو مسٹر مجتو کو طم نہ تھا یا وہ جان بوجھ کر ایسی فضا قائم کرنا چاہتے تھے جس میں انہم تفہیم کے بجائے شکوک و شبہات کو زیادہ دخل حاصل ہو۔

میرے ایک بنگالی دوست کا کہنا ہے کہ مجتو کی آمد کو قابل قبول بنانے کے لیے عوامی لیگ کو بہت محنت کرنا پڑی۔ اس کی انتظامی کمیٹی کے بعض ارکان اس دورے کے سراسر مخالف تھے، البتہ کچھ ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ اگر یحییٰ خاں ان کی بات نہیں مانتا تو انہیں مجتو کا تعاون حاصل کرنا چاہیے تاکہ دونوں اکثریتی پارٹیوں کے مشترکہ مطالبے کو جنرل یحییٰ خاں نظر انداز نہ کر سکے۔ اس ضمن میں غور طلب بات یہ تھی کہ عوامی لیگ کی تعداد از شہرت کے باوجود اگر مسٹر مجتو نے اس سے تعاون کیا، تو مغربی پاکستان میں ان کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔

ان حالات میں مسٹر مجتو اور ان کے رفقاء ڈھاکہ پہنچے۔ انہوں نے عوامی لیگ کی قیادت سے ملاقات کی جس کی تفصیلات سمیٹہ راز میں رکھی گئیں۔ اس کی زوداد بعد میں عوامی لیگ کے ایک ترجمان شرمین بھان کی زبانی ملتی ہے: "وہ ایک غیر ملکی انگریزی جید سے میں لکھتے ہیں، مسٹر مجتو جنوری کے آخری ہفتے میں ڈھاکہ آئے۔ انہوں نے پہلے عجیب الرحمن سے ملاقات کی اور پھر دونوں پارٹیوں کے آئینی ماہرین نے آپس میں مذاکرات کیے۔ گفتگو جوں جوں آگے بڑھتی رہی یہ بات واضح ہوتی گئی کہ پی پی پی نے ابھی تک کوئی دستوری خاک تیار نہیں کیا۔ وہ بھی سرودت یحییٰ خاں کی طرح چھ نکات کے مضمرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس صورت حال میں مذاکرات کا جاری رہنا لامحالہ تھا، کیونکہ مذاکرات کی غایت یہ ہوتی ہے کہ دو متبادل جہتہ تجاویز کو سامنے رکھ کر ان میں مخابہت کی صورت تلاش کی جائے۔"

یہ زوداد مذاکرات کے کوئی چھ ماہ بعد منظر عام پر آئی، مگر عوامی لیگ کے ذرائع سے ایک تبصرہ جو فوری طور پر مجھے دستیاب ہوا یہ تھا کہ مسٹر مجتو نے دستوری مسائل میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ تمام وقت اقتدار میں شرکت اور قلمدانوں کی تقسیم پر بات کرتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے پیش نظر اقتدار کے سوا کوئی چیز نہیں۔"

پروفیسر جی۔ ڈبلیو جوهری (جن کا ذکر اوپر آیا ہے) اس بارے میں مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسٹر مجتو اپنے ساتھیوں سمیت ۲۶ جنوری کو ڈھاکہ پہنچے۔ میں بھی مذاکرات کے رُخ کا جائزہ لینے کے لیے ڈھاکہ میں موجود تھا۔ بات چیت تین روزہ جاری رہی، مگر عدم اعتماد کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مختلف ذرائع سے ملنے والی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ عجیب نے مجتو سے صاف



صاف کہہ دیتا تھا کہ ہم چھ نکات میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کریں گے۔ جو اب مسٹر بھٹو نے بھی اتنی ہی صفائی سے بتا دیا تھا کہ ہم ملحد کی اس درپردہ ایکٹیم کو بھی تسلیم نہیں کریں گے۔

اسی دنوں ڈھاکہ میں ہم نے یہ سنا کہ بھٹو نے چھریں سے ساڑھے پانچ نکات منظور کر لیے ہیں۔ صرف آدھے نکتے پر اتفاق رائے باقی ہے۔ عوامی لیگ کے محققوں نے مجھے بتایا کہ درحقیقت انہوں نے سارے نکات مان لیے تھے، مگر انہوں نے ان کے لیے مغربی پاکستان میں رائے عامہ ہمارا کرنے اور دوسرے سیاست دانوں سے بات چیت کرنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ عوامی لیگ نے انہیں وقت دینے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

اسی شام (۲۹ جنوری) کو رات آٹھ بجے کی خبروں میں ریڈیو پاکستان نے مسٹر بھٹو کا بیان نشر کیا کہ میں اپنی پارٹی اور مغربی پاکستان کے لیڈروں سے مزید مشورہ کروں گا اور (عوامی لیگ) مذاکرات جاری رکھوں گا۔ پی پی پی کے سربراہ چاروڑہ قیام کے بعد ایسے مغربی پاکستان آئے کہ یہاں آکر انہوں نے نقشہ ہی بدل دیا۔ اب ان کی قوت کا مرکز عجیب نہیں کیجی خاں تھے جن سے ان کے منقول مذاکرات لاؤ کا نہ میں ہو چکے تھے، لیکن قبل اس کے کہ کچھ خاں کے ساتھ ان کی ملی جلتی کا تذکرہ کیا جائے چند درمیان کیوں کا سلسلہ بھی ملا لیا جائے۔ ڈھاکہ میں مسٹر بھٹو کی آمد پر جتنی امیدیں بندھی تھیں ۳۰ جنوری کو ان کی روانگی سے صرف ختم ہو گئیں، بلکہ دونوں صوبوں کے درمیان بعد پہلے سے بڑھ چکا تھا۔ اس خلیج کو وسیع تر کرنے میں ہندوستان نے بھی اہم کردار ادا کیا، بطور دو کشمیری نوجوان ۳۰ جنوری کو ہندوستان کا ایک فوجیہ راہروں کے لاجور لے آئے۔ بعد کی علاقائی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ فوجیہ راہروں کی گمری سازش تھی۔ اس نے اس واقعے کو بہانہ بنا کر ہندوستان کے اوپر سے جانے والی پی آئی کے کی پروازیں بند کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں صوبوں کے درمیان جو فاصلہ پہلے دو گھنٹوں میں طے ہوتا تھا اب اس کو (براہ راست سری لنکا) چھ گھنٹے لگتے تھے۔ میرے پاس اس کی کوئی شہادت تو نہیں مگر میرا تاثر یہ ہے کہ اس کا یہ یکم ہندوستان نے بہت پہلے تیار کی تھی، مگر اس پر عمل درآمد نہ ہوا اور عجیب کے مذاکرات ناکام ہوئے پر کیا۔ میرے اس تناظر کی تصدیق بعد کے حالات سے بھی ہوتی ہے جب ہندوستان نے کلمہ مکمل مشرقی پاکستان میں مداخلت شروع کر دی۔

جنوری ۱۷ء کے آخر تک عوامی لیگ کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور میرے خیال میں کچھ اور بھٹو کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کہاں تک اپنے اپنے عناصر میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ عجیب کا اصرار تھا کہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ فروری تک قومی اسمبلی کا اجلاس چلانا چاہیے، جبکہ مسٹر بھٹو اسمبلی سے باہر کسی بھگوتے کے لیے مزید وقت چاہتے تھے کچھ خاں اور ان کے میسر اپنا الگ لائحہ عمل بنانے بیٹھے تھے۔ سیاسی ٹکون۔ بیکینی، عجیب، بھٹو۔ روز بروز پیچیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ روشنی کی کوئی کرن کہیں نظر نہ آتی تھی۔

اس اتحاد تاریکی میں میں مشینٹ جنرل یعقوب علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور چکی بھر بصیرت مانگی۔ انہوں نے فرمایا: میری تربیت سپاہ گری کی ہے سیاست کی نہیں۔ فوجی نقل و حرکت پر میرا ذہن بہت چلتا ہے، مگر سیاسی چالوں کے متعلق میرے قواعد زیادہ حساس نہیں۔ مثلاً جب ہندوستان کشمیر سے ایک پہاڑی ڈوٹروں مغربی بنگال میں انتخابات کی لڑائی کے لیے بھیجتا ہے تو میں فوراً جھانپ جاتا ہوں اس کا اصل مقصد کیا ہے؟ کیا یہ ڈوٹروں واقعی انتخابات کے لیے آیا ہے یا اس کا مقصد کچھ اور ہے؟ یہ اپنا سارا جنگی سامان ساتھ لایا ہے یا صرف ہلکے ہتھیاروں سے لیس ہے؟ اس کو صوبے کے اندر رکھا گیا ہے یا اس کا مرکز سرحدوں کی طرف ہے؟۔ لیکن جب مجھے الزم کوئی سیاسی چال چلتا ہے تو کچھ مجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ وہ مجھ سے ایک بات کرتا ہے اور ڈوٹروں کو کچھ اور بتاتا ہے، میں نہیں جانتا کہ اس کی کس بات کا اعتبار کروں؟

اسی وجہ غامضی میں دس دن گزر گئے۔

پھر یکایک مغربی اپنی پرکھ حرکت شروع ہوئی جیسے دس دنوں کی غامضی اپنا اثر دکھانے لگی۔ اور مختلف واقعات دو دو دن کے مقررہ وقفے کے بعد رونما ہونے لگے جیسے کوئی نام نہان جیل ملے کہ اس کو مکمل شکل دی جاتی ہے۔ ۱۱ فروری کو مسٹر بھٹو نے راولپنڈی میں صدر مملکت سے طویل ملاقات کی۔ دو روز بعد حکومت نے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ۳ مارچ کو ڈھاکہ میں ہوگا۔ دو روز بعد مسٹر بھٹو نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر پی پی پی کو نظر انداز کیا گیا، تو تیسرے کراچی تک طوفان کو ہوا کر دے گا۔

بھٹو کے اعلان کے بعد صدر یحییٰ نے کاغذ کو برخواست کر دیا اور ملک بھر میں طوفان مارشل لا کی گرفت میں آ گیا۔ دو روز بعد صدر نے فوجی گورنر اور اسٹیشن لا اینڈ مسٹر ٹیڈل کا اجلاس ۲۲ فروری کو طلب کر لیا۔ مشرقی پاکستان سے ٹیڈنٹ جنرل یعقوب اور وائس ایڈمرل احسن کو اس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔ راولپنڈی روانہ ہونے سے دو روز قبل (۱۹ فروری) جنرل یعقوب نے مجھے بلایا اور حالات حاضرہ پر بات کرنا شروع کی (یہ غایت وہ پہلے بھی مجھ پر کرتے رہتے تھے) انہوں نے اس ملاقات میں دو باتوں کا بالخصوص ذکر کیا۔ ایک کا تعلق بھٹو سے تھا اور دوسری کا کچھ خیال سے۔ مسٹر بھٹو کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے موقع میں اتنی لچک رکھی ہے کہ اگر صدر یا عجیب ان کو اس بات کا یقین دلا دیں کہ ان کے خیالات کو اہمیت دی جائے گی تو وہ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت پر تیار ہو جائیں گے اور صدر کے پاس قانونی ڈھچکا پتھر (ایل الٹ او) کے تحت اتنے اختیارات ہیں کہ وہ اپنی بات (عجیب سے) منوائیں۔ صدر کچھ خاں کے بارے میں انہوں نے اپنی دور رس نگاہوں سے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تعطل جاری رہا اور نتیجہ قومی کارروائی ناگزیر ہوئی تو یہ تباہ کن ہوگا۔ کچھ خیال ملحدگی کے عمل میں تاخیر کرنے کے لیے یہ کارروائی کریں گے تو اس سے ملحدگی کا عمل تیز تر ہو جائے گا۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ ہم صرف غرضوں کی بات کر رہے ہیں، پوچھا کہ اگر حالات ایسا رخ اختیار کریں کہ قومی کارروائی ناگزیر ہو جائے تو تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر ایسی صورت حال کا سامنا ہو تو میرے خیال میں کارروائی مختصر اور تیز ہونی چاہیے، سرجن کے فشر کی طرح اور اس جڑی کے فوراً بعد زمنوں کو مندل کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر سیاسی اور اقتصادی مرمہ پھی ہونی چاہیے۔

راولپنڈی روانہ ہونے سے قبل جنرل یعقوب اور ایڈمرل احسن شیخ مجیب الزمئن سے ملے۔ شیخ صاحب نے حالات کو کروٹ بدلتے ہوئے دیکھ کر انہیں یقین دلایا کہ چھ نکات میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ یہ رہی ایک اور تلا بازی۔ غالباً بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنا موقف بدلنے ہی کا نام سیاست ہے۔ بیشک اس کام میں عجیب الزمئن بہت طاق تھے۔

راولپنڈی میں اعلیٰ سطحی کانفرنس ۲۲ فروری کو منعقد ہوئی۔ اس میں کیا فیصلے ہوئے اور نئے حالات سے سنپٹنے کے لیے کیا مشربی وضع کی گئی، اہم نکات سینئر ارازمین ہے، البتہ اس کی گونج ہم تک ڈھاکہ میں پہنچی وہ بھی کہ عجیب الزمئن کو اپنی نیک نیتی اور صحت لاطنی کا ثبوت دینے کے لیے ایک اور موقع دیا جائے گا اور اگر وہ راہ راست پر نہ آیا، تو مارشل لا اپنے اصل اور وایتی انداز میں (دوبارہ) نافذ کیا جائے گا۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد دونوں معاونوں پر فوراً کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ سیاسی طے پر ایڈمرل احسن نے شیخ مجیب سے ابتدا کی مذاکرات شروع کیے اور بھکات کو مغربی پاکستان کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے ان میں ضروری ترمیم پر زور دیا۔ عجیب الزمئن نے ترمیم والی بات تو زمانہ البتہ

یہ وعدہ کیا کہ وہ مغربی پاکستان میں چھ نکاتی پروگرام کے نفاذ پر زور نہیں دیں گے۔ شیخ صاحب نے چند روز بعد اس منہم کا اعلان کر کے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

جیڈ کوآرڈینیشن کمانڈ میں ایک پلان پہلے سے تیار پڑا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر اندرونی طور پر حالات خراب ہو جائیں تو کیا کارروائی کی جائے گی۔ اس پلان کا نام بلیٹز (BLITZ) تھا۔ جنرل یعقوب نے راولپنڈی سے واپسی پر اس پلان کی لوک پاک درست کرنے اور اسے تازہ صورت حال سے ہم آہنگ کرنے کے احکامات دیے۔ ان کا شافٹ فوراً تعمیل میں لگ گیا۔ اس پلان میں صوبائی سطح پر سنسر شپ لگنے کا منصوبہ بھی تھا جس کی تفصیلات طے کرنے کے لیے مجھے کہا گیا۔ بریگیڈیئر جی نے اس بارے میں مجھے تاکید کیا کہ ایسا لائحہ عمل تیار کر دجیں جو اشارہ ملتے ہی نافذ کیا جاسکے۔ اس وقت سوال جواب کا وقت نہیں ہوگا۔ عرض کیا: اگر اب وقت ہوتا تو ایک سوال پوچھنے کی جرات کر سکتا ہوں؟ انہوں نے ارزاؤں فرما کر یہ اجازت عنایت فرمائی تو پوچھا: ذرا یہ بتا دیجیے کہ اس منصب کے کیا بنیاد (PREMISE) کیا ہوگی؟ لیٹننٹ کاپٹن بنگالیوں کو اپنی طرف بھول جانے کا مقابل کی طرف۔ یہ سوال میرے لیے بول اہم ہے کہ سنسر شپ نافذ کرنے کے لیے سولین انفازمیشن افسروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔۔۔ انہوں نے میری بات کاتے ہوئے سختی سے کہا: میں نہیں جانتا یہ تیار مسئلہ ہے اس کا حل بھی تم ہی ڈھونڈو!۔۔۔ مگر کیونکہ اس (منصوبے) کو ٹائپ برگزڈ کرنا۔ اپنے ہاتھ سے لکھنا اور میرے حوالے کر دینا۔ آج ہی!

ادھر یہ منصوبہ تیار ہوا اور ادھر مزید فوجی مغربی پاکستان سے پہنچنا شروع ہو گئے۔ ۲۶ فروری سے یکم مارچ تک دوپٹیں (۲۲ بلوچ اور ۱۳ ایف ایف، بی آئی اے) سے ڈھاکہ پہنچ گئیں۔ اس اضافی فوجی کو بلیٹز (BLITZ) میں ضم کرنے کے لیے ڈھاکہ میں مقیم، ہرگیڈ کو ذمہ داری سونپی گئی۔ ہرگیڈ کا کمانڈر تھے تازہ فوجی کو ذخیرہ رکھنے کے لیے پلٹے بنگالی ہرگیڈ میجر کو بائیں علمہ رکھا تاکہ فضا مزید مضرب ہو جائے مگر یہ راز راز نہ رکھا کیونکہ جب ایک جیسی وضع قطع رکھنے والے ہزار دیگر ہزار افراد میاؤں سے اترے تو ایئر پورٹ پر بنگالی ملازمین کو صاف پتہ چل گیا کہ یہ شکار فیس اور جناح کیپ پہننے ہوئے سولین ورجنٹ فوجی ہیں۔ انہوں نے بات عوامی لیگ تک پہنچائی اور خود ہسپتال کر دی۔ تمام پروانوں کی آمدورفت پاکستان ایئر فورس کے عملے کو سنبھالنا پڑی۔

عوامی لیگ جو ایک ماہ پہلے فرعون بنی ہوئی تھی، فوجی نفل و حرکت سے سوچ میں پڑ گئی۔ خود عجیب الزم نے بھولانک تباہی کے امکانات دیکھے تو ہاتھ پیر باز شروع کر دیے۔ وہ شاید قتل و غارت کے بجائے پراس طریقوں سے اپنے نصب العین تک پہنچنا چاہتے تھے یا شاید ان کے غیر ملکی آقا ابھی جنگ وجدل کے لیے تیار نہ تھے یا خود عوامی لیگ کو مدافعت کی تیاری کے لیے مزید وقت درکار تھا، بھلانک جب کچھ بھی سہی عجیب الزم نے عوامی لیگ میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے کچھ خاں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے سر توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ فروری کے آخر میں ایک بااثر بنگالی روزنامے کے ایڈیٹر نے مجھے فون کیا اور فردا ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں جانتا تھا کہ وہ علی کی اعلیٰ قیادت کے بہت قریب ہے اور اس جلد ملاقات کی وجہ تازہ صورت حال ہی ہو سکتی ہے۔ میں صبح اخبار کے دفتر گیا۔ ایڈیٹر کے پاس دو اور حضرات بیٹھے تھے جن کا مجھ سے تعارف نہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے ایک مجلس عاملہ کے رکن بن گئے۔ انہوں نے کہا کہ صدر کی مخالفت کو فوراً ڈھاکہ آنا چاہیے کیونکہ حالات بڑے نازک ہیں۔ میں نے عرض کیا: مجھے افسوس ہے کہ صدر ملک کی نفل و حرکت پر مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں۔ انہوں نے اصرار سے کہا: انہیں آپ ضرور جاری بات اور پہنچا سکتے ہیں۔ کچھ خاں کو فوراً آنا چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر جنرل کچھ خاں تشریف لے آئیں تو عوامی لیگ ان کے احترام میں چھ نکات میں ایسی ترمیم کر دے گی کہ وہ مغربی پاکستان کے لیے

قابل قبول ہوں گے۔ انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ بظاہر عوامی لیگ اپنے موقف پر قائم رہے گی مگر اپنے پروگرام کے ہر نکتے میں ایسی شیخ کا اضافہ کر دے گی کہ اس کا قابل اعتراض حصہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ مثلاً:

(الف) میری تجارت صوبائی دفتر داری ہوگی اور تجارتی وفد متعلقہ صوبے ہی بھیجیں گے اور تجارتی مابذوں کے لیے غیر عوامی سے مذاکرات بھی وہی کریں گے، لیکن مرکز کی توثیق کے بغیر کوئی معاہدہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

(ب) ایک صوبے کی آمدنی خزانہ وہ اندرونی وسائل سے حاصل ہو یا میری ذرائع سے صوبائی ریزرو بینک میں جمع ہوگی مگر یہ رقم صرف مرکزی رابطہ کمیٹی کی منظوری سے خرچ کی جاسکے گی جس میں تمام صوبوں کو برابر کی نمائندگی حاصل ہوگی۔

(ج) محصولات جمع کرنا صوبائی ذمہ داری ہوگی، لیکن اگر مرکز یہ کام اپنے دفتر لینا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

(د) ہم علمہ کرنسی یا موجودہ کرنسی کے علمہ نظام کے مطالبے پر اصرار نہیں کرتے۔

انہوں نے کہا کہ ہم ان باتوں کو تحریری طور پر دینے کے لیے تیار ہیں۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کی اتحادی کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ وہ عجیب الزم کی منظوری سے یہ ساری باتیں کہہ رہے ہیں۔

میں نے ان کی بات حکام اعلیٰ تک پہنچانے کا وعدہ کیا، لیکن ساتھ ہی مشورہ دیا کہ اگر عجیب الزم اب بھی مغربی پاکستان جو آئیں تو اس سے یقیناً فائدہ پہنچے گا۔ وضاحت کرتے ہوئے میں نے عرض کیا: میرے پاس کسی کی کوئی اتحادی نہیں، لیکن اس نمک کے ایک شری کی حیثیت سے میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر شیخ صاحب مغربی پاکستان کا دورہ کر لیں تو قومی سلامتی کے لیے مفید ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہم دوپہر کے کھانے پر شیخ صاحب سے بات کریں گے اور پچھلے پر آپ کو ان کے رد عمل سے آگاہ کریں گے۔

سہ پہر کو پھر اسی دفتر میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ عجیب الزم سے بات ہوئی ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ حال ہی میں ایڈمرل احسن سے ان کی دو تین منٹ ملاقاتیں ہوئی ہیں انہوں نے ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ صدر ملک راولپنڈی میں میری موجودگی ضروری سمجھتے ہیں۔ میں ایک دور دراز زمین مختہ ہونے والی پارٹی کنونشن کے سلسلے میں بے حد مصروف ہوں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ واقعی کوئی تازہ صورت حال پیدا ہوئی ہے جس پر گفتگو کرنا ضروری ہے، میں یہاں سے نہیں نکل سکتا۔

شام کو جنرل یعقوب سے میری ملاقات ہوئی، تو میں نے انہیں عوامی لیگ کی خواہش سے حسب وعدہ آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھے ایک طویل تار کی نفل دکھائی جو انہوں نے صدر ملک کو اسی روز بھیجا تھا اور انہیں جلد از جلد ڈھاکہ پہنچنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ عوامی لیگ مختلف ذرائع سے وہی بات اور پہنچا رہی تھی۔

ہم امید بیگم کی حالت میں صدر کی آمد کا انتظار کرنے لگے کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ اب بھی صورت حال کو سنبھالا جاسکتا ہے۔ سننے میں آیا کہ صدر کچھ خاں تشریف لارہے ہیں، بعض جوئیر افسران کی آمد سے متعلق حفاظتی اقدامات کی جزئیات طے کرنے لگ گئے تھے۔ اگر وہ غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق آج ہی آئیں تو ذرا باقی انتظامات میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

صدر ملک تو تشریف لائے، لیکن ان کی جگہ ایک اور شخص ڈھاکہ میں نازل ہوئی۔ بھلاہو جیسے تو وہ کیا تھی؟

# محیب کی حکمرانی

۲۸ فروری کو یہ محسوس خبر ڈھاکہ پہنچی کہ سارا مارچ کو ہونے والا اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ راولپنڈی سے یہ خبر دینے والے صدیقی خاں کے پرنسپل شات آفیسر لیفٹیننٹ جنرل ایس جی۔ ایم پر زیادہ متھے۔ انہوں نے اس کا جواز پیش کیا کہ اس سے اسمبلی سے باہر کسی ایسی بھڑکتے کے لیے سیاسی جماعتوں کو مزید قتل جانے کا فیصلہ بھی خفیہ تھا۔ گورنر احسن کو قبل از وقت اعتماد میں اس لیے لیا گیا کہ وہ محیب الرحمن کو اس سے آگاہ کریں اور ان کے ممکنہ ردِ عمل سے راولپنڈی کو مطلع فرمائیں، چنانچہ اسی شام محیب کو گورنمنٹ ہاؤس طلب کیا گیا اور ایڈمرل احسن نے طویل مہمید کے بعد یہ خبر انہیں سنائی۔ مہمید کا مقصد ان کے ردِ عمل کی متوقع شدت کو کم کرنا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ احسن نے بات کہی اور محیب نے سن لی۔ وہ ذرا بھی برا لگے بغیر نہ ہوئے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا اور وہ بھی نہایت معقولیت سے کہ میں التوا کو ہمانہ بنا کر شور نہیں مچاؤں گا، البتہ اتنا ضرور کروں گا کہ اگر التوا کے ساتھ ساتھ اجلاس کی نئی تاریخ کا بھی اعلان ہو جائے تو مجھے جماعت کے انتہا پسند عناصر کو کنٹرول کرنے میں سہولت ہوگی۔ اگر آئندہ تاریخ مارچ میں ہی ہو تو آسانی رہے گی۔ اگر اپریل میں ہو تو مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور اگر اپریل کے بھی بعد ہو تو میرے لیے حالات پر قابو رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔“

محیب الرحمن یہ ردِ عمل بنا کر چلنے لگے تو مہجر جنرل راؤ فرمان علی سے کہہ گئے: ”آپ مجھے گرفتاریوں نہیں کر لیتے، آپ صرف ایک بار مجھے ٹیلیفون کر دیجیے اور میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ محیب نے اپنی امکانی گرفتاری کا اندازہ کرنے کے لیے خوب دانہ پھینکا، مگر جنرل فرمان خاموش رہے۔

تھوڑی دیر بعد محیب کی گفتگو کا ٹپ لباب راولپنڈی پہنچا دیا گیا اور محیب کی تجویز پہنچانے کے علاوہ یہ سفارش بھی کی گئی کہ التوا کے اعلان کے ساتھ نئی تاریخ کا اعلان ضرور کیا جائے۔ راولپنڈی سے جواب ملا: ”آپ کا سپینام پوری طرح سمجھ لیا گیا ہے،“ اس مختصر جواب کی ڈھاکہ میں یہ توضیح کی گئی کہ راولپنڈی نے تجویز کو شرف قبولیت بخش دیا ہے، چنانچہ بڑے پُر امید انداز میں اگلے روز کے اعلان کا انتظار ہونے لگا۔ یہ اعلان مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق یکم مارچ کو ایک بج کر پانچ منٹ پر نشر ہوا۔ ہم اس کی اہمیت کے پیش نظر ریڈیو سٹیٹوں سے کان لگاٹے بیٹھے تھے۔ میں عام ریڈیو سٹیٹ سے ہٹ کر خصوصی شعبے (MONITORING SECTION) میں چلا گیا تاکہ نشریے کا کوئی لفظ شور کی نذر نہ ہو جائے مختصر سا اعلان تھا، چند منٹوں میں ختم ہو گیا، مگر سارے فسانے میں اس بات کا ذکر نہ تھا جس کا ہمیں بتانی سے انتظار تھا۔ نئی تاریخ کا ذکر نہ

کر میری آنکھوں کے سامنے وحشت ناک مناظر ناچنے لگے۔

اعلان میں ایک اور قابل غور بات یہ تھی کہ صدر کی آواز جو کئی غیر اہم موقعوں پر ہماری سماعت کا بار بار امتحان لے چکی تھی آج سُنانی نہ دی۔ ریڈیو کے کسی کارندے نے قوم کی قسمت کا یہ پروانہ کاغذ سے اٹھا کر ہوا میں کبھیر دیا۔ لیکن کیوں؟ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ صدی بھئی کی مرضی کے خلاف یا اُن کی اجازت کے بغیر ان کے ”انتہا پسند“ (HAWKS) جرنیلوں نے یہ اعلان نشر کر دیا تھا؟ پروفیسر جی۔ ڈبلیو چودھری نے جن کا اُپر ذکر آچکا ہے، اس بارے میں یہ پُر معنی فقرہ لکھا ہے کہ ”بھئی خاں نے تو اس اعلان پر محض دستخط کیے تھے“ اگر یہ جملہ تاریخی لحاظ سے درست ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اصل مصنف کون تھا؟ بعض لوگوں نے اس کا الزام بھٹو پر دھرا ہے اور بعض نے بھٹو کے حامی جرنیلوں پر۔ اصل چہروں سے پردہ اٹھنا ابھی باقی ہے۔

میں اس منظر سے ہزار میل دُور ہونے کی وجہ سے اصل ”مجرموں“ کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہوں، البتہ سقوطِ ڈھاکہ کی پیچیدہ لڑائیوں کو ملاتے وقت جب التوا کے بارے میں اس سُنکتے کے متعلق میں نے بعد میں جنرل الف سے پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا بتایا کہ ”اُن دنوں صدر کراچی میں تھے ہم سب نجی منزل میں تھے اور وہ اوپ۔ میجر جنرل ”ح“ اور میجر جنرل ”ع“ (جو بھٹو کے ذاتی دوست تھے) بار بار سیڑھیاں چڑھ اُتر رہے تھے۔ انہوں نے اوپر جا کر حالات کا ایسا نقشہ کھینچا کہ صدر کو پہلے سے تیار کر دے سوئے پر دستخط کرنے پڑے“ کیا اس وضاحت کو جنرل بھئی خاں کی مصیبت کا ناقابلِ یقین ثبوت مان لیا جائے؟ میرے خیال میں مستقبل کے مؤرخ کو یہ نازک تکنیکی سنبھالنے کے لیے بڑی محنت کرنا ہوگی۔

اگر بھئی خاں پر اپنے ”انتہا پسند“ (HAWK) جرنیلوں کا زور تھا، مجیب پر اپنے ”انتہا پسند“ رفقاء کے کار کا دباؤ تھا اور بھٹو مغربی پاکستان کی رائے عامہ کا غلام تھا۔ تو ان تینوں میں سے کون تھا جو صحیح معنوں میں لیڈر کہلانے کا مستحق تھا میرے خیال میں لیڈر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ نازک سے نازک موقع پر بھی اپنے عمل کی آزادی کسی نہ کسی حد تک اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔

التوا کے اعلان کا ڈھاکہ میں فوری ردِ عمل ہوا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ مجیب کو ایک روز پہلے اس کی اطلاع مل گئی تھی اور اُس نے اس بات کا اہتمام کر لیا تھا کہ اگر اجلاس کی نئی تاریخ کا اعلان نہ کیا جائے تو اس کی ناپسندیدگی کا بھرپور اظہار ہو سکے، چنانچہ اعلان کے کوئی آدھ گھنٹے بعد لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ پھر سے ہونے عوام، گروہ درگروہ ہانس کی لاسٹیاں اور لوہے کی سلاخیں اٹھائے نعرے لگانے لگے۔ اُن کے الفاظ میں نفرت اور انداز میں وحشت تھی۔ اُن کے دُشنام آمیز نعرے سُن کر یوں لگتا تھا کہ دُراثر غصے سے کانپ رہا ہے مشتعل ہجوم نے دکانیں (جن میں سے زیادہ تر غیر بنگالیوں کی تھیں) ٹوٹ لیں، گاڑیوں کو نقصان پہنچایا اور ہر وہ چیز جو سامنے آئی، اُسے تہس نہس کر دیا جیسی کہ ٹیڈیم میں ہونے والے بین الاقوامی کرکٹ میچ کو بھی درہم برہم کر دیا کھلاڑیوں کو پھر سے ہونے ہجوم کے نرنے سے شکل بچا کر ایم۔ این۔ اے ہوٹل پہنچایا گیا۔ ا۔ سڑکوں اور بازاروں میں اپنا ردِ عمل یوں ظاہر کرنے کے بعد عوامی لیگ کی پیرامانی پارٹی نے شام کو ایک مقامی ہوٹل میں اپنا اجلاس منعقد کیا جس کے بعد مجیب الرحمن نے ایک پُر ہجوم پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ”ہم اس

صورت حال کو چیلنج کیے بغیر نہیں رہ سکتے، اسی موقع پر انہوں نے اعلان کیا کہ ۲ مارچ کو ڈھاکہ میں اور ۳ مارچ کو سکر  
صوبے میں مکمل ہڑتال کی جائے گی اور حکومت کو غور و خوض کے لیے تین دن کی مہلت دینے کے بعد ۷ مارچ کو آئندہ  
لائسنس عمل کا اعلان کیا جائے گا۔

یہ بڑی زوردار پریس کانفرنس تھی اور دندناتے ولے عجیب کے ایج کے عین مطابق — مگر عجیب کی شخصیت کا ایک  
دوسرا رخ بھی تھا جو انہیں اسی شام گورنمنٹ ہاؤس میں لے آیا وہاں انہوں نے اعلیٰ فوجی حکام کے سامنے نہایت عاجزانہ  
انداز میں اپیل کی: ”حضور، اب بھی وقت ہے، مجھے اجلاس کی نئی تاریخ لے دیجیے، میں اب بھی صورت حال پر قابو پا  
لوں گا، البتہ اگر غیر معینہ عرصے کے لیے تاخیر ہوگئی تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

عجیب کے جانے کے بعد مشرقی پاکستان کے محکمہ بالا سر جوڑ کر بیٹھ گئے عجیب کی باتوں میں انہیں مصالحت اور  
حب الوطنی کی بو آئی۔ انہوں نے نئی تاریخ لینے کے لیے ٹیلیفون پر جنرل یحییٰ خاں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، مگر  
صرف لیفٹیننٹ جنرل ایس۔ جی۔ ایم پیرزادہ تک پہنچ سکے۔ پیرزادہ نے بات کو وہ اہمیت نہ دی جو ڈھاکہ میں محسوس کی جا رہی  
تھی۔ پیرزادہ سے مایوس ہونے کے بعد انہوں نے جنرل عبدالحمید سے بات کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کے ذریعے جنرل یحییٰ  
خاں کو نئی تاریخ مقرر کرنے پر آمادہ کیا جاسکے۔ جنرل حمید بھی نہ مل سکے، کیونکہ وہ اُس رات سیالکوٹ چھاؤنی میں تھے۔ وہاں  
کال ملائی گئی اور اُن سے بات ہوگئی۔ وہ ویسے بھی بولتے کم اور سنتے زیادہ تھے۔ انہوں نے بڑے تحمل سے بات سنی اور  
جنرل یحییٰ خاں سے بات کرنے کی حامی بھری جس سے ڈھاکہ کی انتظامیہ نے اطمینان کا سانس لیا، مگر یہ وعدہ، وعدہ  
دلبرانہ سے بہتر ثابت نہ ہوا۔

وائس ایڈمرل احسن، لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب اور میجر جنرل راؤ فرمان علی گورنمنٹ ہاؤس ہی میں تھے کہ رات گئے  
جنرل پیرزادہ نے راولپنڈی سے خود ٹیلیفون کیا۔ ایڈمرل احسن نے ریسورٹ اٹھایا۔ پیرزادہ نے پوچھا: ”جنرل یعقوب ہیں؟“  
”جی ہاں، بیٹھے ہیں۔“ ”فون انہیں دیجیے“ جنرل یعقوب نے فون سلجھا لا تو پیرزادہ نے کہا: ”آپ فوراً احسن سے چابج  
لے لیں، ٹیلیفون بند کر کے جنرل یعقوب نے ایڈمرل احسن کو تازہ احکام۔ سے آگاہ کیا اور یوں ایڈمرل احسن کی گورنری  
یکایک اختتام کو پہنچی۔“

یکم مارچ ۱۹۷۱ء ہمارے لینے کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس روز نئی تاریخ کے بغیر اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا گیا۔ اسی روز  
عوامی لیگ نے اپنا عوامی رد عمل دکھایا، اسی روز عجیب نے گورنمنٹ ہاؤس میں نرم رویے کا اظہار کیا اور اسی روز راولپنڈی  
اور سیالکوٹ ٹیلیفون کرنے کے بعد مشرقی پاکستان کے گورنر کو بٹایا گیا۔

میرے خیال میں یہ عجیب کے رویے میں بھی ایک اہم موڑ تھا۔ اُس نے یہ کوشش ناکام ہوتے دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ  
ڈھاکہ کی انتظامیہ کا رویہ بہتر نہ ہو، لیکن راولپنڈی میں بیٹھے ہوئے لوگ جو کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں، اُس کی ایک  
نہیں سنتے۔ شاید وہ ”لاڑکانہ پلان“ کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں کر رہے ہیں؟ شاید مصالحت کا وقت گزر چکا ہے،

ملہ پاکستان، رور، ڈھاکہ ۲ مارچ ۱۹۷۱ء



وائس ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن  
گورنر مشرقی پاکستان

چنانچہ اس نے مذاکرات کا راستہ چھوڑ کر عدم تعاون کی "پرامن" تحریک کا آغاز کر دیا اور حکم کھلا محاذ آرائی کے راستے پر سفر شروع ہوا۔

عدم تعاون کی ابتدا دھاکہ ایئر پورٹ پر پی آئی اے کے بنگالی عملے کے بائیکاٹ سے ہوئی۔ انہوں نے یکم مارچ کو اُس وقت کام کرنے سے انکار کر دیا جب بوئنگ طیارے فوجی جوانوں سے لے رہے ہوئے اتر رہے تھے۔ دو بنگالی جوانوں نے تو ایک طیارے کو تباہ کرنے کی بھی کوشش کی مگر پاکستانی فضائیہ کے عملے نے اسے ناکام بنا دیا۔

فوجی جوانوں کی آمد سے عجیب الرحمن بہت بھرے۔ انہوں نے پُر زور احتجاج کیا کہ جن بوئنگ طیاروں میں ارکان اسمبلی کو آنا چاہیے تھا، اُن میں بنگالی عوام کی آرزوؤں کا کلا گھونٹنے کے لیے فوجی جوان لائے جا رہے ہیں۔ عجیب کے اس احتجاج اور عوام کے پُر آشوب مزاج کو سمجھانے ہوئے جنرل یعقوب نے جی ایچ کیو سے درخواست کی "لنڈ فوجی جوانوں کی مزید روانگی روک لو؛ ورنہ اُلٹا نقصان ہوگا۔"

عجیب اب شعلے اُگل رہے تھے۔ اُن کے الفاظ نفرت کے گولے بن کر پھٹ رہے تھے اور ہم دھاکہ چھاؤنی میں فکرمند بیٹھے تھے کہ پتہ نہیں کب یہ آگ پورے صوبے یا ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

مقامی مارشل لا انتظامیہ نے اُن شعلوں پر قابو پانے کی ایک ترکیب سوچی اور مارشل لا آرڈر عطا جاری کر دیا جس میں ملکی سالمیت اور حاکمیت کے منافی خبریں اور تصویروں چھاپنے کی ممانعت کی گئی، مگر ماحول میں حدت اتنی بڑھ چکی تھی کہ اس آرڈر کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ حکم کاغذی پروانہ بن کر رہ گیا، کیونکہ اس کی زد میں جو مواد آتا تھا وہ زیادہ تر عوامی لیگ ہی جاری کر رہی تھی اور شری پاکستان سے چھپنے والے کسی اخبار میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ عوامی لیگ کی خبریں ملے آؤٹ کر سکے۔ عوامی لیگ کے غنڈے ہر طرف دندناتے پھرتے تھے اور جو کوئی عوامی لیگ سے تعاون نہیں کرتا تھا، اسے ٹھکانے لگا دیتے تھے۔ حکومت کے وسائل اجازت نہ دیتے تھے کہ وہ محبوب صحافیوں یا دوسرے شہریوں کو فرداً فرداً محفوظ بنایا کر سکے۔ مثلاً وہ کس کس اخبار کے سامنے اور کس کس صحافی کے گھر پر ہمدرد کھڑے کرتی۔ نتیجتاً اس مارشل لا آرڈر کے باوجود عوامی لیگ کا پلاٹا بھاری رہا اور عملی طور پر زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی جس پر گزشتہ چند دنوں سے چل رہی تھی۔

یہ صورت حال چیف سیکرٹری شفیق الاعظم کے لیے بہت زرخیز تھی۔ انہوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ایک سوچی سمجھی حکیم کے تحت (سول امور کے انچارج ایجر جنرل راؤ فرمان علی کو فون کیا: "حالات بدستور بگڑتے جا رہے ہیں آپ فوج کو بلائیے۔" جنرل فرمان نے جواب دیا: "فوج کو طلب کرنا اتنا آسان نہیں، اس میں کئی پیچیدگیاں ہیں، بہتر ہوگا آپ خالوں نافذ کرنے والے رسول اداروں (پولیس، ایسٹ بنگال رائفلز) کو کام پر لگائیں، چیف سیکرٹری نے اصرار کرتے ہوئے کہا: "نہیں جنرل صاحب، ان اداروں کے بس کی بات نہیں رہی، فوج کو تو آنا ہی پڑے گا۔"

شفیق الاعظم کے علاوہ صوبائی ہوم سیکرٹری اور ایسٹ بنگال پولیس نے بھی مارشل لا کا کام کو اسی نوعیت کے ٹیلیفون کیے اور فوج بلائے پر زور دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک طرف بنگالیوں کو فوج سے اتنی نفرت ہے اور دوسری طرف اس کو بلانے پر اتنا اصرار ہے۔ آخر کیوں؟

مختصر ڈی ریکرڈ شفیق الاعظم نے پھر جنرل فرمان کو فون کیا اور اپنی درخواست پر زور دیا۔ جنرل صاحب نے پوچھا:

"آپ فوج، فوج کرتے ہیں، شاید آپ کو اس کی پیچیدگیوں کا احساس نہیں آپ پہلے شیخ صاحب (عجیب) سے تو بات کر لیں، چیف سیکرٹری نے جواب دیا: "میں ان کی منظوری کے بعد ہی آپ سے عرض کر رہا ہوں۔"

مارشل لا انتظامیہ نے یہ درخواست قبول کر لی اور یوں ایک دام میں جا اُلجھی۔ ادھر ۲ مارچ کی شام کو کرنیو لنگانے کا اعلان ہوا اور فوج اسے نافذ کرنے کے لیے شہر میں داخل ہوئی اور ادھر عوامی لیگ نے کرنیو کی خلاف ورزی کرنے کے لیے اپنے کارکن بھیج دیے۔ ضرورت حال گھمبیر ہو گئی۔ اسی رات ۳۲ پنجاب رجمنٹ کی ایک پلاٹون کو میلبی کا پٹر کے ذریعے چھاؤنی سے گورنمنٹ ہاؤس پہنچایا گیا تاکہ اقتدار کی اس علامت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

فوجیوں کو حکم تھا کہ کرنیو نافذ کرنا ہے مگر گولی نہیں چلائی۔ ادھر عوامی لیگ کے کارکنوں کو یہ ہدایت تھی کہ کرنیو توڑنا ہے خواہ اس میں جان ہی چلی جائے۔ یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ فوجیوں نے ابتدائی چند گھنٹے بڑے ضبط سے گراے اور متواتر اشتعال کے باوجود گولی نہ چلائی۔ ٹھکانے میں کرنیو نافذ کرنے کے انچارج بریگیڈیر ارباب نے سپاہیوں کو اُن کے متعلقہ افراد کی کمان میں چھوڑا اور خود رات گئے مارشل لا ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ وہ خاصے برہم نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے داخل ہوتے ہی احتجاج کیا کہ "آپ نے میرے ہاتھ باندھ کر مجھے آگ میں دھکیل دیا ہے۔ فوجی جوانوں کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، انہیں گالیاں دی جا رہی ہیں اور ادھر آپ کا حکم ہے کہ گولی ہرگز نہ چلانا۔ ابھی تک سپاہی اس حکم کے پابند ہیں مگر پتہ نہیں کب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے، میں بریگیڈیر ارباب کو ۱۹۴۵ء کی جنگ سے جانتا ہوں، وہ عین لڑائی میں بھی بھی استے مضطرب نہ ہوئے جتنے آج دکھائی دے رہے تھے۔"

آزمائش کے چند گھنٹے اور گزرے۔ پُر اشتعال ہجوم کی اشتعال انگیزیاں اور بڑھیں سپاہیوں کا صبر اور گھٹا اور اقدام ہو کر رہا۔ ہجوم نے پتھر اور اینٹیں پھینکیں اور سپاہیوں نے حکم کے مطابق گولیوں سے جواب دیا۔ پھر بنگالی ڈھیر ہو گئے جن میں سے تین وہ تھے جنہوں نے گورنمنٹ ہاؤس پر بلہ لواتھا۔ ایک رات میں چھ لاشیں، یہ سراسر شفیق الاعظم اور اُن کے اتاروں کی جیت تھی۔ فوج کی پوزیشن اور پیچیدہ ہو گئی۔ عوامی لیگ کی تحریک کو نیا ٹانگ مل گیا۔

اگلے روز عوامی لیگ نے ان چھ لاشوں کا جلوس نکالا۔ شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر نعرے لگائے۔ فوج پریس طعن کی اور لوگوں کے جذبات اُبھارے۔ خود عجیب نے ان لاشوں کو سامنے رکھ کر اپنی خطبہانہ صلاحیتوں کا خوب مظاہرہ کیا اور اشتعال انگیزی کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اسی شام عجیب نے چار صفحات کا ایک تند و تیز اخباری بیان جاری کیا جس میں سرکاری ملازموں سمیت معاشرے کے تمام طبقوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اس "غیر قانونی حکومت" کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور صرف "عوامی نمائندوں" کو طاقت اور اختیارات کا جعلی اور قانونی منبع تصور کریں۔

۲ اور ۳ مارچ کی درمیانی رات کو یہ اخباری بیان مجھے گیارہ سو گیارہ بجے ملا۔ میں یہ بات فوراً افسران بالا کے نوٹس میں لایا جس پر عقل کے ایک اجارہ دار جھٹ بولے: "تمت چھپنے دو، اخبار والوں سے کہہ دو، یہ مارشل لا کا حکم ہے۔" عرض کیا: "مگر توں سکتا ہوں، مگر اس کے نتائج کا فائدہ دار کون ہوگا۔ عوامی لیگ کے ہتھیار بند کارکن ایسے اخبار والوں کی زندگی اجیرن کر دیں گے اور عجیب اور زیادہ مشتعل ہو کر کل مارشل لا انتظامیہ پر اور زور سے برسے گا۔ سوچ لیجیے۔"

ساتھ والے دفتر میں جنرل یعقوب نے مجھے بلایا اور پوچھا: "یہ اخباری معاملہ ہے، تمہارا کیا مشورہ ہے؟ میں نے جنرل

یعقوب اور مجیب الرحمن کے خوشگوار مراسم کے پیش نظر تجویز کیا: آپ مجیب سے بات کر لیں، اگر وہ بیان واپس لے لے لے یا اسے نرم کر دے تو مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا: ”بیٹھو“ میں ان کی چمکدار ریز کے دوسری جانب جنرل صاحب کے سامنے بیٹھ گیا۔ انہوں نے لے ڈی سی سے کہا: ”مجھے مجیب الرحمن ملاؤ“ چند لمحے بعد وہ مجیب سے محو گفتگو ہو گئے۔ میں بیٹھا سنتا رہا۔ انہوں نے شیخ مجیب سے ساڑھے گیارہ بجے سے بارہ بج کر دس منٹ تک بات کی اور انہیں قائل کرنے کے لیے ہر حربہ آزما یا، کبھی مدبرانہ انداز اختیار کیا اور کبھی مصالحتانہ کبھی ایک دلیل دی کبھی دوسری، مگر ہر وار بے اثر رہا مثلاً انہوں نے مجیب سے کہا: شیخ صاحب! آپ خود میاں میں، آپ کو پتہ نہ ہے کہ حالات کتنے کشیدہ ہیں، آپ کے بیان سے صورت حال اور گھمبیر ہو جائے گی“ مجیب نے جواباً کہا: ”جی نہیں، اس میں تو کوئی اشتغال انگیز بات نہیں یہ تو شخص ایک سیاسی بیان ہے“ جنرل یعقوب نے ٹیلیفون بند کر دیا اور کہا: ”وہ کہہ رہا تھا میں بیان کو نرم نہیں کر سکتا۔ مجھ پر بہت دباؤ ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ مجھے گرفتار کر لیں، اس سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں کہنے والا تھا کہ اس سے تمہارا مسئلہ تو حل ہو جائے گا، مگر میرا حل نہیں ہو گا، مگر میں نے سوچا یہ جملہ بازی کا موقع نہیں۔۔۔۔۔ بہر حال یہ تو رہا تمہاری تجویز کا حشر! اب بتاؤ اگلا راستہ کدھر کو نکلتا ہے۔“ میں خاموش رہا، کیونکہ اخباری معاملہ ختم تھا اور فوجی معاملہ شروع ہو چکا تھا۔

اس کے فوراً بعد جنرل یعقوب نے تین سینئر افسروں کی میٹنگ بلائی جسے انہوں نے ہلکے پھلکے مٹوکس ”مینی وار کونسل“ (نصفی مٹی جنگی مجلس مشاورت) قرار دیا۔ اس میں میر جنرل خادم حسین راجہ، میر جنرل راولفرمان علی اور بریگیڈیئر غلام جیلانی شامل تھے۔ مجھے بھی ساتھ بٹھالیا گیا۔ صورت حال پر از سر نو غور کیا گیا اور مجیب الرحمن کے سخت رویے کے پیش نظر لائحہ عمل وضع کرنے کے لیے مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ فیصلہ اس بات پر ہوا کہ صوبہ بھر میں متعین افواج کو پیشگی اطلاع دی جائے کہ یہ بیان چھپنے والا ہے جس کے ردِ عمل سے نشپٹنے کے لیے وہ تیار رہیں۔ راتوں رات یہ احکام تمام چھاننیوں میں پہنچا دیے گئے۔

اگلی صبح جنرل یعقوب نے راولپنڈی فون کیا اور متعلقہ افسروں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ حالات روز بروز بگڑ رہے ہیں، صورتِ اعمال سے نشپٹنے کے لیے فوری اور حتمی فیصلہ کیا جائے یا ایسا کرنے کا مجھے اختیار دیا جائے۔ صدر کئی احوال کی طرف سے جواب آیا: ”مجھے آپ کی صائب رائے پر پورا اعتماد ہے۔ اگر کسی موقع پر ڈھاکہ اور راولپنڈی کے درمیان مواصلاتی رابطہ منقطع ہو گیا، تو اپنی صوابدید کے مطابق ایشن لیں“۔ درحقیقت ڈھاکہ اور راولپنڈی کے درمیان رابطہ پہلے ہی منقطع ہو چکا تھا صرف تار اور ریڈیو جیسے مادی ذرائع باقی رہ گئے تھے۔

راولپنڈی میں کسی کے کان پر ٹون نہ رہی۔ وہ اپنی مصروفیات میں غور ہے۔ عوامی لیگ اپنی تحریک کو تیز تر کرنے کے لیے سرٹو کو کشش کرتی رہی نتیجتاً جگہ جگہ مشتعل ہجوم اور سرکاری عمارتوں (فوج، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس) کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں۔ خون بہتا رہا، جاں نثاریاں ہوتی رہی اور حالات میں کشیدگی بڑھتی رہی۔ تصادم اور ہلاکت کی خبریں ڈھاکہ کے علاوہ چٹاگانگ، جیسور، کھٹنا، کومیلا، سلہٹ اور رنگ پور سے بھی موصول ہو رہی تھیں جہاں تصادم کے لیے بنگالیوں کو فوج نظر نہیں آتی تھی، وہ غیر بنگالیوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ان میں سے ان گنت افراد بنگالی ملاوٹیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے، کئی گھروں کے چراغ گلیں ہوئے اور کئی خاندانوں کی آبرو خاک میں ملی۔

صورت حال سے مدد سچی خاں کو متواتر باجبر رکھا گیا، لیکن ہر نئے تار کے جواب میں خاموشی — محیب اور ناقابل برداشت خاموشی! وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کس وقت کا انتظار ہو رہا ہے۔ چند روز بعد جب جنرل سچی خاں کو اظہارِ عقیدت ہو گیا کہ اب صورت حال ناقابلِ تلافی حد تک بگڑ چکی ہے، تو انہوں نے مار مار کر کوڑھاکہ میں تمام سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا اعلان کرنے سے پہلے انہوں نے اپنے نائبین کو ڈھاکہ میں حکم دیا کہ وہ محیب کو اس فیصلے سے قبل اذ وقت آگاہ کریں اور ردِ عمل انہیں بتائیں۔

جناب محیب کو جب اطلاع دی گئی تو انہوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ حکام نے فوراً رضامندی، "کاتار اولینڈی" روانہ کر دیا۔ صدر نے اگلے روز اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ اس پر فوراً محیب الرحمن چنگھاڑے: "اب کوئی گول میرے کانفرنس نہیں ہوگی، اب یہ مذاق نہیں چلے گا۔" محیب الرحمن جب گرج برس چکے، تو ڈھاکہ کے ایک حاکم اعلیٰ نے ان سے اس قلابازی کی وجہ پوچھی، تو وہ بولے: "میں نے کسی گول میرے کانفرنس کی تجویز سے کبھی اتفاق نہیں کیا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ سچی خاں ڈھاکہ میں فرداً فرداً یا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں سیاستدانوں سے ملنا چاہتے ہیں، کیا تم لوگ ایک ہی مین پر مجھے اس بھٹو کے ساتھ بٹھانا چاہتے ہو جو میرے لوگوں کا قاتل ہے؟" محیب الرحمن کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں جو کشت و خون ہو رہا ہے، یہ سب بھٹو کے ایما پر ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

گوئیوں کا نشانہ بننے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ سہ ماہیج کو ڈھاکہ میڈیکل کالج ہسپتال اور مرفورڈ ہسپتال میں ایک سو پچیس زخمی داخل ہوئے۔ اگلے روز آٹھ ماے گئے۔ چار موقع پر اور چار ہسپتال میں محیب الرحمن خود زخمیوں کی خبر گیری کرنے ہسپتال گئے اور خون کے عطیات کے لیے اپیل کی۔

شفیع الاعظم کی درخواست پر — اور محیب الرحمن کی رضا سے — فوج کو شہر میں داخل ہوئے، بشکل دودن اور تین راتیں گزری تھیں کہ عوامی لیگ نے اس کی موجودگی کو "عوام کے لیے باعثِ اشتعال" قرار دے کر فوج کو واپس ہیرکوں میں بھیجے کا مطالبہ کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا محیب صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ عوامی تحریک کو کچلنے میں فوج کتنی مؤثر (یا غیر مؤثر) ہو سکتی ہے، مگر سوال یہ تھا کہ اگر فوج کو واپس چھوڑ دیا جائے تو شہر میں امن و امان کون بجال رکھے گا؟ اور عوامی لیگ سے اختلاف رکھنے والے اور دوسرے غیر ہنگالیوں کا کیا بنے گا، ان کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کا ذمہ کون لے گا؟ محیب نے کہا: "یہ سب مجھ پر چھوڑ دو، میں اپنے رضا کاروں کی مدد سے امن و امان بجال رکھوں گا۔ اگر ضرورت پیش آئی تو انصار سے کام لوں گا۔ اگر بات آگے بڑھی، تو پولیس کو استعمال کروں گا، مگر آپ فوج کو واپس لے جائیے۔ اس کی موجودگی میں امن بجال نہیں ہو سکتا۔"

محیب کی اس "پیشکش" پر مارشل لا ایڈیٹر کو اور میں سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ اس میٹنگ میں یہ اتفاق رہا کہ امن و امان پر قرار رکھنے کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ محیب کا تعاون حاصل نہ ہو۔ لیکن محیب کی تجویز



یونیٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب خاں  
کمانڈر ایئر کمانڈ

لے یہ اشارہ صدر ایوب خاں کی گول میرے کانفرنس کی طرف تھا جو ۱۵ مارچ ۱۹۶۹ء راولپنڈی میں ہوئی تھی۔  
علیہ غیر فوجی تنظیم جو پولیس کی طرح صوبائی حکومت کے ماتحت تھی اور اس میں زیادہ تر ہنگالی نفری تھی۔



پر مقامی سطح پر فیصلہ کرنے کے بجائے راولپنڈی کو تازہ صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔ وہاں سے حکم آیا عجیب الرحمن کی پیشکش قبول کر لی جائے اور فوج کو واپس بیرکوں میں بھیج دیا جائے۔

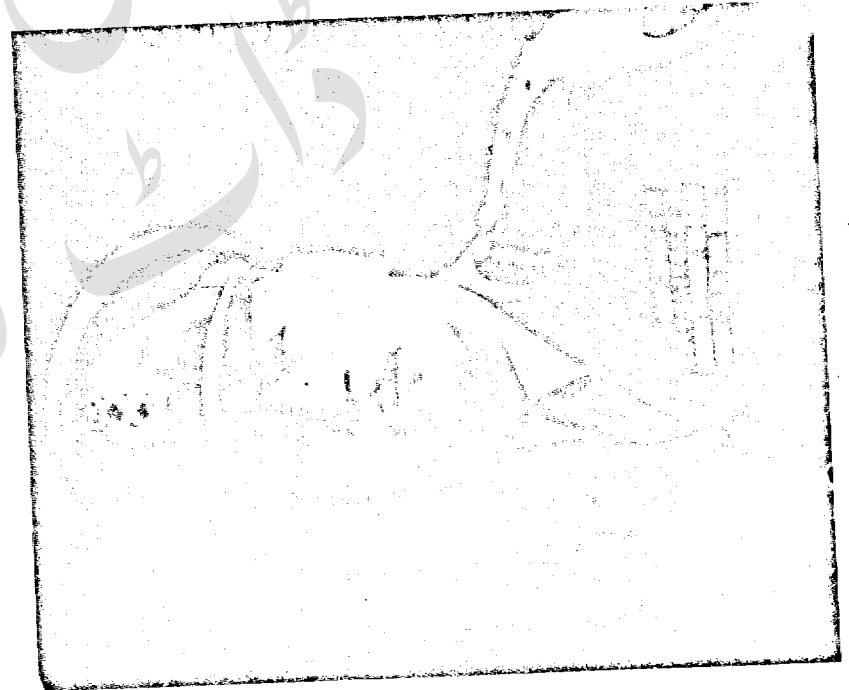
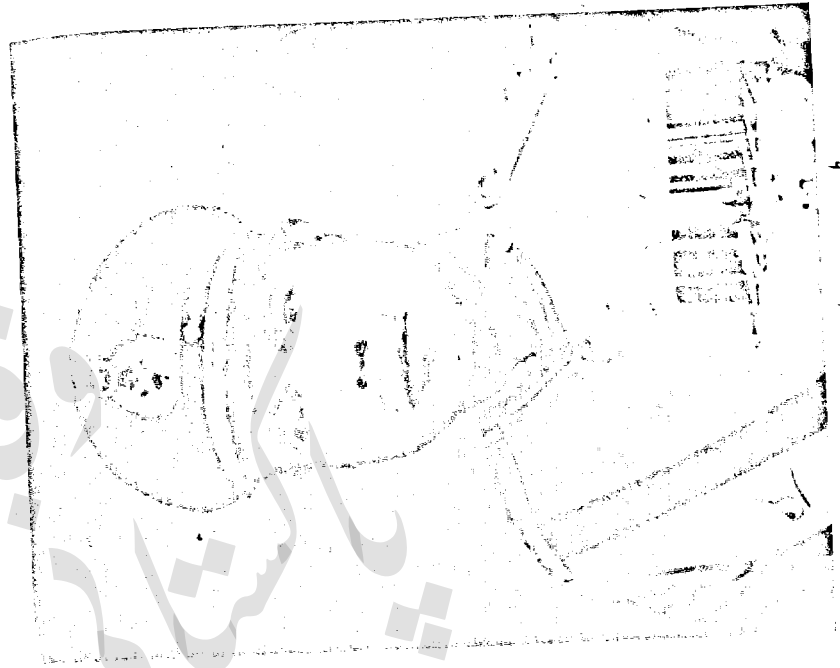
اس طرح حکومت نے رضا کارانہ طور پر عجیب الرحمن کو صوبے میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری منتقل کر دی اور فوج واپس چھاؤنی بھیج دی۔ اس سے شرقی پاکستان پر عجیب کی گرفت اور مضبوط ہو گئی جس کا ایک شاخسانہ یہ تھا کہ عجیب کے اس دور میں غیر ہنگامیوں کا تازہ ننگ ہو گیا۔ وہ ظلم و ستم سے تنگ آکر اپنے گھر چھوڑنے اور چھاپوں میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ ڈھاکہ چھاؤنی میں شاید یہی کوئی ایسا گھر ہو گا جس میں پانچ سے لے کر پچاس افراد پناہ گزین نہ ہوں۔ یہ لوگ برآمدوں میں، معنوں میں، گیلیوں میں، حتیٰ کہ باورچی خانوں میں سمیٹے بیٹھے تھے۔ جو لوگ سلامتی کا ٹکٹ خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے وہ مغربی پاکستان پر وادہ کر گئے، جو بے کس اور بے مایہ تھے، وہیں وار سستے رہے۔

جنرل یعقوب ایک پڑھے لکھے انسان تھے، انسانی آلام کے بارے میں گہری تشویش رکھتے تھے۔ انہوں نے ۴ مارچ کو جنرل ایس۔ جی۔ ایم۔ پیرزادہ کو فون کیا اور کہا کہ صدر یحییٰ خاں کو بلا تاخیر ڈھاکہ پہنچنا چاہیے، کیونکہ ہر لمحہ ہمیں مسئلے کے حل سے دُور لیے جا رہے ہیں۔ جنرل پیرزادہ نے یحییٰ خاں سے بات چیت کرنے کے بعد بتایا کہ صدر جلد ہی ڈھاکہ آئیں گے، البتہ قطعی تاریخ کا تعین اس وقت مشکل ہے۔ یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ ابھی ٹیلیفون پر عجیب سے بات کریں گے اور اُن سے کہیں گے کہ وہ حالات کو مزید خراب نہ ہونے دیں۔ اس کے بعد یحییٰ خاں کو عجیب الرحمن کے گھر ایک ایسے ٹیلیفون پر ملا دیا گیا جو کسی ٹیلیفون ڈائریکٹری میں درج نہ تھا۔ اس گفتگو کا ریکارڈ کہیں موجود نہیں۔

صدر یحییٰ خاں کی متوقع آمد کی خبر سن کر جنرل یعقوب اور اُن کے رفقاء کو قد سے اطمینان ہوا، اُڑتی اُڑتی یہ خبر چھوٹی جونیئر افسروں تک بھی پہنچی۔ ہم سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بات آگے تو بڑھی۔

اسی رات (۴ مارچ) اور ۵ مارچ کی درمیانی شب) گورنر احسن کو مغربی پاکستان روانہ ہونا تھا۔ وہ جنرل یعقوب کے گھر ایک الوداعی دعوت میں مدعو تھے۔ جنرل فرمان اور جنرل خادم بھی موجود تھے۔ والس ایڈمرل احسن کو جہاز پر چڑھانے کے بعد تینوں جنرل فلیگ سٹاف ہاؤس (جو جنرل یعقوب کا مسکن تھا) پہنچے اور صدر یحییٰ خاں کے متوقع دورے اور اس کے مفید نتائج پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ جب گھڑی پر نو بجکر دس منٹ ہوئے تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ کال جنرل یحییٰ خاں کی طرف سے تھی۔ وہ جنرل یعقوب سے بات کرنا چاہتے تھے۔ جنرل یعقوب نے دل میں کئی دوسرے ایسے ٹیلیفون کا ریسورس اٹھایا۔ جنرل خادم، جنرل فرمان اور تینوں بیگمات امید و بیم کی حالت میں دیکھتی رہیں کہ کیا خبر آتی ہے۔ جنرل یحییٰ خاں نے کہا: ”میں نے فی الحال ڈھاکہ آنے کا ارادہ بدل لیا ہے۔“ جنرل یعقوب نے حسب توقع اُن کے تشریف لانے پر اصرار کیا، مگر یحییٰ خاں نہ مانے، انہوں نے کہا: ”نہیں، نہیں، میں نہیں آ سکتا، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے آنے سے صورت حال کو بہتر بنانے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔“ انہوں نے فیصلہ سنا کر فوراً ٹیلی فون بند کر دیا۔

تینوں جنرل سخت مایوس ہوئے۔ صدر نے دو ٹوک فیصلہ کر کے اُمید کی آخری کرن بھی بجھا دی تھی۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ وہ سوچ میں پڑ گئے۔



جنرل یعقوب نے آپریٹر سے کہا کہ وہ جنرل پیرزادہ سے بلا دے چپٹم زدن میں کال مل گئی جنرل یعقوب نے کہا: پیرا اگر صدر کو ڈھاکہ آنے پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا، تو مجھے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے میں کل صبح استعفیٰ ارسال کر دوں گا۔ بات ختم ہوئی جنرل یعقوب چہرے پر برہمی کے آثار لیے واپس ڈرائنگ روم میں پہنچے جنرل فرمان اور جنرل خادم نے بھی استعفیٰ ہونے کی پیشکش کی کہ کم از کم اب ان دونوں سینیئر افسروں کا موقف یہی ہے۔ اس پر جنرل یعقوب نے ان کی تائید اور حمایت کے لیے اُن کا شکریہ ادا کیا اور کہا: یہ کوئی ٹریڈ یونین نہیں، فوج ہے، اس میں یوں استعفیٰ دینا مناسب نہیں۔

رات گئے یہ محض برخواست ہوئی اور تازہ صورت حال کے پیش نظر طے پایا کہ اسی رات جنرل فرمان راولپنڈی چلے جائیں اور بالمشافہ صدر بھی خاں اور جنرل پیرزادہ کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں۔ جنرل فرمان بلا تاخیر اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ اگلی صبح جنرل یعقوب نے بذریعہ تار (نگسل) اپنا استعفیٰ راولپنڈی بھیج دیا۔

جنرل یعقوب کا تحریک بری استعفیٰ ملنے سے پہلے ہی جنرل بھی خاں اگلا قدم اٹھا چکے تھے۔ انہوں نے پنجاب کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور کمانڈر جنرل ٹکا خاں کو راولپنڈی طلب کیا تاکہ انہیں جنرل یعقوب کی ذمہ داریاں سونپ سکیں۔

جنرل فرمان اور جنرل ٹکا خاں جو مختلف مقامات سے مختلف مشنوں پر مختلف اوقات میں روانہ ہوئے تھے، اپنی منزل پر تقریباً ایک ہی وقت پہنچے۔ انہوں نے صدر سے الگ الگ ملاقات کی جنرل ٹکا خاں نے فوراً جنرل بھیجی کے حکم پر برسرِ تسلیم خم کر دیا۔ جنرل فرمان نے نسبتاً طویل گفتگو کے دوران صدر کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا اور بلا تاخیر فیصلوں کی ضرورت پر زور دیا بھیجی خاں نے یہ راز کمانی منسنے کے بعد کہا: بچو، مجھے اپنے بیٹے کا بھی تو خیال رکھنا ہے۔ میں مشرقی پاکستان کے لیے مغربی پاکستان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ عقدہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا کہ اُن کی مُرد مغربی پاکستان کے اکثریتی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو سے تھی، فوجی جرنیلوں سے یا دونوں سے؟

اس اثنا میں مشرقی پاکستان میں مزید خون بہتا رہا۔ ظلم و ستم کا نشانہ زیادہ تر وہ غیر بنگالی (بہاری اور مغربی پاکستانی) تھے جو عوامی لیگ کے دہشت پسندوں کے خلاف اپنا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی داستان غم اتنی طویل ہے کہ اس کے لیے ایک علیحدہ کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ یہاں صرف اتنا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان میں زیادتیوں صرف بنگالیوں پر ہی نہیں ہوئیں، غیر بنگالیوں پر بھی ہوئی ہیں اور وہ بنگالیوں کے بے انتہا غیظ و غضب کا نشانہ بنے ہیں۔

ایک دن میں سب سے زیادہ خون جس جگہ بہا وہ چٹاگانگ کا وہ حصہ ہے جسے بہار تلی کہتے ہیں۔ وہ واقعی ظلم کے پہاڑ تھے لگیا تھا۔ وہاں ۳۰ مارچ کو ۱۰۰ غیر بنگالیوں (زیادہ تر بہاریوں) کو ترہیع کر دیا گیا۔ بریگیڈیئر محمد ارے جنہیں چٹاگانگ کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنایا گیا تھا، اس قتل و خون کو روکنے کے لیے کوئی مؤثر کارروائی نہ کی یہ وہی بریگیڈیئر ہیں جن سے میں نے فوج میں بنگالیوں کا کوٹا ڈگان کرنے کے سلسلے میں انٹرویو کیا تھا۔ چٹاگانگ کا ذکر صرف نمونے کے طور پر کیا ہے۔ اس طرح کی بہت سی وارداتیں مشرقی پاکستان کے کئی علاقوں میں ہوئیں جہاں عوامی لیگ کے غنڈوں کو من مانی کرنے کا موقع ملا۔

خود ڈھاکہ میں حالت تشویشناک تھی شہریوں میں احساس تحفظ ختم ہو چکا تھا۔ ہر وقت موت سمر پر منڈلاتی نظر آتی تھی۔ لوگ

اپنا گھڑ سنامان اُٹنے پونے بچ کر مغربی پاکستان جا رہے تھے۔ گلشن کالونی اور بانانی کالونی (جو ڈھاکہ کا گلبرگ کہلاتا تھا) کے لوگوں نے پی آئی اے کے ٹکٹ کے عوض (جس کی مالیت صرف ۲۵۰ روپے تھی) اپنی نئی کاریں دے دیں۔ بعض نے اپنا بھرا ہوا گھر دوسرے کو سوئپ کر راہ فرار اختیار کی۔

ہوائی اڈے پر دن رات ٹکٹ کے امیدواروں کی لمبی لمبی قطاریں لگی رہتی تھیں۔ لوگ رات کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹتے تھے کہ اگلے روز ان کی باری پیچھے چلی جائے گی۔ یہ نظارہ بڑا رقت انگیز تھا جیسے سمندر کی بے رحم لہروں نے بحری قزاقوں کے ہاتھوں لٹے پٹے اس بے یار و مددگار قافلے کو ساحل کی یخ بستہ ریت پر پھینک دیا ہے۔ اب اس کا کوئی پُرساں حال نہیں، اب اس کا کوئی مددگار نہیں۔

عوامی لیگ کے رضا کاروں نے ہوائی اڈے کی طرف جانے والی تمام سڑکوں پر چوکیاں (چیک پوسٹ) قائم کر رکھی تھیں تاکہ "بگنگلہ دیش کی دولت کے انخلاء کو روکا جاسکے۔ سب سے بڑی چوکی شہر سے ہوائی اڈے کو آنے والی بڑی سڑک پر فام گیٹ کے قریب واقع تھی جہاں شہر سے آنے والے ہر مسافر کو روکا جاتا اور اس کی تلاشی لی جاتی۔ ایک روز ایک چٹھان رکش میں سوار وہاں سے گزرتے لگا، تو اُسے بھی روک لیا گیا۔ اُس نے مزاحمت کی، تو وہیں قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش گھسٹ کر سڑک کے کنارے ایک نالی میں پھینک دی گئی۔ یہ واقعہ دن دہاڑے مارشل لا میڈ کو آرڈر سے صرف چند سو میٹر کے فاصلے پر پیش آیا۔ بطور میڈیوٹی جو انوں پر مشتمل ایک ٹولی بھیجی گئی تاکہ وہ میت لے کر چھپاؤنی میں دفنادیں۔ کہ یہی واحد جائے اماں تھی زندہ اور مردہ محبت وطنوں کے لیے۔

جوں جوں مارچ کی فیصلہ کن تاریخ قریب آتی گئی، ڈھاکہ اور شاہراہوں اور خدشوں کی لپیٹ میں آتا گیا۔ یہ وہ تاریخ تھی جب یرش: عجیب الرحمن کو رنار میں جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ اس روز وہ بگنگلہ دیش کی آزادی کا ایک طرف اعلان کر دیں گے۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ اس سے اُس صورت حال کو ماضی ابط اعلان نصیب ہو جائے گا جو واقعہ سارے مشرقی پاکستان میں پائی جاتی ہے؛ البتہ یہ کہنا بعید از قیاس تھا کہ مسلح اذاج اس اعلان پر خاموش بیٹھی رہیں گی؛ تو کیا وسیع پیمانے پر خزانہ جنگی کا وقت آگیا تھا؟

عوامی لیگ کو بھی اس خوفی امکان کا احساس تھا۔ اس کی سنجیدہ قیادت ایسی صورت حال ماننا چاہتی تھی، مگر انتہا پسند گروہ اعلان آزادی میں مزید تاخیر کے خلاف تھا۔ عجیب کا اپنا ذہن کس طرف تھا؟ اس کی کوئی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ ان کے قریبی حلقوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک گروہ کے دباؤ میں کبھی ایک طرف جھک جاتے اور کبھی دوسرے گروہ کے کہنے پر دوسری طرف۔ کسی قطعی فیصلے پر پہنچنے کے لیے عجیب الرحمن نے ہمارے چاروں طرف کے کھانے کے بعد اپنے رفقاء کا اجلاس بلایا۔ مارشل لا میڈ کو آرڈر بھی منظر تھا کہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بٹھتا ہے۔ آدھی رات کو کسی فیصلے کے بغیر یہ تاریخی اجلاس اگلی صبح تک کے لیے ملتوی ہو گیا۔

اُس رات دو اور اہم واقعات ہوئے۔ صدر یحییٰ نے عجیب کو اپنی گفتگو کی تائید میں ایک برقی پیغام بھیجا جو آدھی رات کو میری موجودگی میں مارشل لا میڈ کو آرڈر میں موصول ہوا۔ ایک سینئر ممبر فرار یا پیغام لے کر عجیب الرحمن کے گھر چلے گئے۔ اس پیغام کا لپٹ لباب یہ تھا:



میجر جنرل خادم حسین راجہ  
جی اوسی، ہم اڈیشن

”براہ کرم جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔ میں جلد ہی ڈھاکہ آؤں گا اور آپ سے مفصل بات چیت کروں گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی آرزوؤں سے بڑھ کر آپ کے (عوام سے) وعدوں کی تکمیل ہوگی میرے ذہن میں ایسا نقشہ ہے جو چھ نکات سے بڑھ کر آپ کو مطمئن کر سکے گا۔ میں تاکید کروں گا کہ آپ کوئی عاجلانہ فیصلہ نہ کریں۔“

برگیزڈ صاحب پیغام پہنچا کر واپس مارشل لا میڈیکل وارڈ پہنچے، تو عجیب الرحمن کی خوش خلقی اور تواضع کے گن گنے لگے۔ انہوں نے بتایا دھان منڈی میں عجیب کے گھرشادی کا سماں ہے۔ باہر بہت سی کاریں کھڑی ہیں اور غیر معمولی روشنیاں ہیں، بیسیوں لوگ بیٹھے ہیں میرے پہنچے پر شیخ صاحب نے میرا رخ مقدم کیا اور مٹھائی لائے کو کہا۔

بعض غیر ملکی اخبار نویسوں کا یہ دعویٰ کہ یحییٰ خاں نے مذکورہ بالا پیغام ڈھاکہ کی مارشل لا انتظامیہ کے کمنے پر بھیجا تھا تاکہ فوجی کارروائی کے لیے مزید وقت مل سکے سراسر بے بنیاد اور لغو ہے، البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ جنرل یحییٰ خاں کے ذہن میں ایسا کوئی نقشہ تھا جو عجیب کو بھی مطمئن کرتا اور پاکستان بھی بچ جاتا۔

اسی رات دوسرا اہم واقعہ ڈھاکہ چھوٹاؤں میں میجر جنرل خادم حسین راجہ جی اسی کے گھر ہوا۔ رات کے دو بجے اُن کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ انہیں جبکا کہ اطلاع دی گئی کہ تین آدمی اُن سے ملنے آئے ہیں۔ انہوں نے اُن کے نام پوچھے تو انہیں بتایا گیا کہ اُن میں سے ایک اُن کے اپنے انٹیلی جنس افسر اور دوسری ہیں۔ جنرل راجہ نے انہیں اندر بلوایا اور انے کا مدعا پوچھا۔ دوسری جو عوامی لیگ کی طرف سے آئے تھے، کہنے لگے: ”انتہا پسند عناصر شیخ عجیب پر حد درجہ دباؤ ڈال رہے ہیں کہ سپر کورٹ آزادی کا ایک طرف اعلان کر دیں۔ شیخ صاحب اب تک یہ مطالبہ مالتے رہے ہیں، لیکن اب ان میں مزاحمت کی ہمت نہیں رہی۔ انہوں نے درخواست کی ہے کہ فوج انہیں اپنی تحویل میں لے لے۔“

میجر جنرل خادم حسین راجہ نے جواب دیا: ”مجھے یقین ہے کہ عجیب الرحمن جیسا مقبول رہنما ضرور جانتا ہوگا کہ دباؤ کو کس طرح ٹالا جاسکتا ہے۔ آپ انہیں میری طرف سے کہہ دیجیے کہ میں کل رنارلس کورس گراؤنڈ میں موجود رہوں گا اور انہیں انتہا پسندوں کے ہاتھوں کوئی گزند نہیں پہنچے ڈول گا۔ لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دیجیے کہ اگر انہوں نے پاکستان کی سلامتی کے خلاف کوئی بات کہی تو میں اپنی تمام توہین، ٹینک اور مشین گنیں لگا کر تمام غداروں کو نالود کر دوں گا اور ڈھاکہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ حکومت کرنے کو کوئی بچے گا نہ حکومت کرنے کے لیے کچھ باقی رہے گا۔“

اُدھر، بارہ بج کا سورج طلوع ہوا اور ادھر پاکستان میں متعین امریکی سفیر جناب فارلینڈ عجیب کے گھر داخل ہوئے۔ وہ کچھ دیر اندر رہے، پھر واپس چلے گئے۔ ان حضرات کے جانے کے اُدھر کھٹے بعد عوامی لیگ کے قریبی حلقے سے یقین رکھنے والے ایک اخبار نویس کا مجھے ٹیلیفون آیا: ”شالک صاحب، مبارک ہو! ایک طرف اعلان آزادی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔“ پروفیسر جی۔ ڈبلیو جو دھری امریکی سفیر کی اس بے وقت ملاقات کا مدعا یوں بیان کرتے ہیں: ”امریکی سفیر فارلینڈ نے عجیب پر امریکی پالیسی واضح کر دی تھی اور کہا تھا کہ علیحدگی کے کھیل میں امریکہ کسی امداد کی توقع نہ رکھتا۔“ (صفحہ ۱۲۰)

پھر وہ فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا۔ رنارلس کورس میں جلسے کا وقت ہو گیا۔ ریڈیو سٹیشن ڈھاکہ نے افسرانِ بالا کی اجازت کے بغیر جلسہ گاہ سے براہ راست کارروائی نشر کرنے کا بندوبست کر لیا تھا اور ریڈیو اناؤنسر دھانی بجے سے سامعین کو رواں تبصرے کی صورت

میں بتا رہا تھا کہ جلسہ گاہ میں دس لاکھ لوگوں کا ٹھکانا ہو گا، محیب الرحمن کا انتظار کر رہا ہے۔

یہ اعلان راولپنڈی میں بھی کسی نے سنا اور صدر یحییٰ کے ہیڈ کوارٹر سے ایک بریگیڈیئر نے دھاک فون کیا کہ یہ بکواس بند کرو اور جب فون بریگیڈیئر "ج" کو ملا، تو میں اُن کے پاس موجود تھا۔ انہوں نے مجھے فون دیتے ہوئے کہا: "لو، رہتھائے ٹھکے کی بات ہے تم بسناؤ،" میں نے احکام موصول ہوتے ہی ریڈیو سٹیشن فون کیا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ تقریباً تمام نمبر گھمائے، مگر بے سود! بالآخر ریڈیو سٹیشن کا ایک ادنیٰ سا افسر اتفاقاً مل گیا۔ میں نے اُس سے کہا: "جلسہ گاہ سے براہ راست نشریات فوراً بند کی جائیں۔ یہ مارشل لا ہیڈ کوارٹر کا حکم ہے، اگر اس کی تعمیل نہ ہوئی تو آپ دفتر دار ہوں گے۔" اُس نے غصے سے کہا: "اگر ہم ہالے سات کروڑ عوام کی آواز نشر نہیں کر سکتے، تو پھر یہاں کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں،" ٹیلی فون بند ہونے کے چند منٹ بعد ریڈیو سٹیشن خاموش ہو گیا۔

شیخ محیب الرحمن پر دو گرام کے مطابق جلسہ گاہ پہنچے جہاں ٹھکانے مارتا ہوا لاکھوں افراد کا ہجوم اُن کے اشارے پر کھڑے ہونے کو تیار بیٹھا تھا۔ وہاں پہنچے ہی انہیں آزاد جنگل دیش کا قومی پرچم لہانے کو کہا گیا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا، حالانکہ اسی صبح ان کی موجودگی میں چند طلبہ نے ان کے ذاتی کمان پر یہ "قومی پرچم" لہرایا تھا۔ وہ شدت جذبات سے مغلوب اور حالات سے پریشان دانش پرچم سے اور ہجوم کا جائزہ لیا جب نے اپنی تقریر کا آغاز حسب معمول کھن گرج سے کیا، مگر آہستہ آہستہ عوام کے جذبات کو اچھیننے کے بجائے ایک نئی راہ پر ڈالنا شروع کیا۔ انہوں نے پہلے کی نسبت مختصر تقریر کی اور اعلان آزادی سے اجتناب کیا، البتہ انہوں نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں (جو نئے اعلان کے مطابق ۲۵ مارچ کو ہونے والا تھا) شرکت کے لیے چار شرطوں کا اعلان کیا:

(۱) مارشل لا اٹھا لیا جائے۔

(ب) اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے۔

(ج) فوج کو بیرونی میں بھیج دیا جائے۔

(د) حالیہ قتل و غارت کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔

تقریر کے اختتام پر انہوں نے سامعین کو شورہ دیا کہ وہ پراسن رہیں اور کسی تحریری کارروائی میں حصہ نہ لیں، چنانچہ جلسہ ختم ہوتے ہی حاضرین خاموشی سے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ عبادت گزاروں کا کوئی مجمع المینان بخش وعظائم کھینچنے سے واپس آ رہا ہے۔

ہم سب نے سکون کا سانس لیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بلا مل گئی ہے؛ ورنہ اسی مشتعل ہجوم کو اگر وہ چھاؤنی پر پلغار کرنے کا اشارہ کرتے، تو وہ ضرور دھواولول دیتا، خواہ اس میں اُسے جان کی بازی لگانا پڑتی۔ مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں بھی اس تقریر کا خوشگوار اثر ہوا اور راولپنڈی سے ٹیلی فون کال کا جواب دیتے ہوئے بریگیڈیئر "ج" نے کہا: "موجودہ حالات میں یہ بہترین تقریر تھی۔"

لے اس نے اپنی نشریات کا آغاز اگلی صبح کیا جب محیب الرحمن کی تقریر کا ٹیپ نشر کرنے کی اجازت مل گئی۔

آزادی کے ایک طوفان اعلان کا خطرہ مل گیا، تو اس کے اسباب پر اظہار خیال کیا جانے لگا کسی نے اسے صدر یحییٰ خاں کی بروقت مداخلت پر محمول کیا، کسی نے اسے جنرل راجہ کی دھمکی کا اثر بتایا اور کسی نے اس کا سلسلہ فارلینڈ کی ملاقات سے ملایا، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کسی نے بھی اسے محیب الرحمن کی محبت الوطنی کی دلیل نہ سمجھا۔

جس سہ پہر کو محیب الرحمن کی یہ تقریر تھی، اسی سہ پہر کو تین بجے چالیس منٹ پر مشرقی پاکستان کے نئے حاکم اعلیٰ یقینٹ جرنل لنگا خاں چارج لینے دھاک پہنچے یقینٹ جرنل صاحبزادہ یعقوب، میجر جرنل خادم راجہ اور دوسرے سینئر فوجی افسران کے استقبال کے لیے ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ میں بھی حاضر تھا۔ جرنل لنگا خاں نیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہتاش باش طیارے سے اترے، وہ بھرپور اعتماد اور نئے عزم کی زندہ مثال تھے۔ اس کے عکس جرنل یعقوب پڑمردہ اور گھبے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اندرونی مہمان کو چھپانے کے لیے بار بار اپنی پتی سی چھتری اپنی خالی پتلون پر مار رہے تھے۔ تاہم کچھ اس دور پس پر ان دو جرنیلوں کے روپ اور رول میں فرق بڑا نمایاں تھا۔

ہوائی اڈے پر رسمی علیک سلیک کے بعد کاروں کا فادر روانہ ہوا سب سے آگے سیاہ سرسبز تھی جس کی چمکتی چھت پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ رات کی تاریکی آخری کرنوں کے ڈوبنے کے انتظار میں تھی۔

جرنل لنگا خاں موسم کی نزاکتوں سے بے نیاز سرسبز کاریں روانہ ہو گئے۔ جرنل راجہ اُن کے ہمراہ تھے۔ راستے میں جرنل لنگا خاں نے کہا: "آپ لوگوں نے یہاں کیا لگھن پھیلا رکھا ہے؟" جرنل راجہ جنہوں نے گزشتہ دو برسوں میں بہت سے عمومی اور سیاسی طوفان دیکھے تھے، اس جملے سے تمللا اٹھے۔ وہ میٹ کے کنارے پر جا اٹھے اور جرنل لنگا خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے: "سزا پنا بھرقہ کچھ دیر کے لیے اپنے پاس رکھیے، ہم یہاں روزانہ ایک دو رخ سے گزرتے ہیں کیا ہماری خدمات کا یہی صلہ ہے؟" جرنل لنگا خاں خاموش ہو گئے۔

ایک گھنٹے بعد جرنل لنگا خاں بریفنگ لینے اور چارج سنبھالنے مارشل لا ہیڈ کوارٹر تشریف لائے۔ مجھے حکم ہوا کہ ساتھ والے کمرے میں انتظار کروں، اگر ضرورت پڑی تو اندر بلا لیا جاؤں گا میں بیٹھا دوش و فدا کے غموں سے کھینٹا رہا اور اعلیٰ افسر دوسرے کمرے میں مصروف رہے۔ کوئی دو گھنٹے بعد بریفنگ ختم ہوئی اور جرنل یعقوب میرے کمرے میں آئے میں نے انہیں سلیوٹ کیا، تو انہوں نے کہا: "نہیں جانے سے پہلے آپ سے ملاقات ہوگی۔" پھر انہوں نے شفقت سے اپنا ہاتھ میرے دائیں کندھے پر رکھا اور داغ دہلی کا یہ شعر پڑھا:

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو

کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

اسی شام آٹھ بجے راولپنڈی تاریک بھیج دیا گیا کہ جرنل لنگا خاں نے اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا ہے، گویا اب ان پر ایک وقت تین دفتر دار ہیں مشرقی پاکستان میں تینوں افواج کے کمانڈر، مارشل لا ہیڈ کوارٹر اور گورنر جرنل لنگا خاں کو پہلی دو لمبیاں پہننے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تھی؛ البتہ تیسری ٹوپی پہنانے کے لیے دھاکہ ہانی کورٹ کے چیف جسٹس کا تعاون ضروری

لے BRIEFING کسی کو متعلقہ صورت حال سے آگاہ کرنا۔



تھا، کیونکہ قانون کے تحت وہی ان سے گورنر کے عہدے کا حلف لے سکتے تھے جسٹس صدیقی نے حلف لینے سے انکار کر دیا، پھر ناسازی طبیعت بتائی، مگر اصل وجہ عوامی لیگ کا اثر تھا جو صرف عوام ہی میں نہیں بلکہ انیٹھامیہ اور عدلیہ تک بھی پھیل چکا تھا۔ اس انکار کے چند روز بعد ڈھاکہ بار ایسوسی ایشن نے ایک باقاعدہ قرارداد پاس کی جس میں جسٹس صدیقی کے اس جرأت مندانہ اقدام کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

جنرل نگا خاں نے اپنے بنگالی چیف سیکرٹری کو خود فون کیا کہ وہ حلف اٹھانے کی رسم کا بندوبست کرے۔ وہ بھی ٹال مٹول کرتا رہا۔ دوسرے قانونی رکاوٹ بھی تھی کسی اور جج کو اس کام کے لیے نامزد کرنے کے لیے صدر قاضی حکم میں ترمیم ضروری تھی جس کے لیے نئے کاغذات راولپنڈی سے آنے تھے۔ نگا خاں حلف اٹھانے بغیر جرح فیض انجام دے سکتے تھے، دینے لگے۔

اس آئین عوامی لیگ نے اپنی حکومت چلانے کے لیے مختلف ہدایات جاری کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا یہ ہدایات جو مکمل تعداد ۳۳ تھیں، اخبار میں چھپوا دی جاتیں اور تمام افراد کو ان پر عمل کرنے کا حکم دیا جاتا۔ ان ہدایات کی زد میں تقریباً سبھی شے مثلاً سرکاری محکمے، صنعتی ادارے، بینک اور تعلیمی درس گاہیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن آتے تھے۔ لوگ عوامی لیگ سے دلی ہمدردی یا اس کے دہشت پسندوں کے دوسرے ان ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ وجہ کچھ بھی تھی صوبے پر نجیب کی گرفت مضبوط تھی۔ صرف سات چھاونیاں سات جبریوں کی طرح اس کے تسلط سے باہر تھیں جہاں فوجی افراد جو انہایت صبر آزما دن بسر کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ اس صورت حال کو فوراً بدلنے کے لیے بے قرار تھے مگر ابھی تک فوجی ڈسپن سے مجبور ہر چیز سے جا رہے تھے۔

نجیب نے اشتعال انگیز کابریاں کیا۔ فوج کے لیے ریل اور سڑکیں استعمال کرنے کی ممانعت کر دی۔ مقامی ٹیکس داریوں کو راشن سپلائی کرنے سے روک دیا اور جہاں ان کا سامنا ہوتا، انہیں گالیاں دی جاتیں مگر آفرین ہے ڈسپن کے ان محمولوں پر کہ انہوں نے خشک راشن کی دال اور عوامی لیگ کی ترسٹر گالیاں کھا کر گزارہ کر لیا، مگر فوجی ڈسپن کے خلاف کوئی حرکت نہ کی۔

ان فوجیوں میں سے بعض ابھی شہول ہیں متعین تھے جہاں وہ میک ریڈیو آئیشن، بجلی گھر، ٹیلیفون ایکسچینج اور دیگر نازک مقامات کی دیکھ بھال کر رہے تھے مشتعل عوام ان کے پاس آکر چیتیاں کتے، گالیاں دیتے اور بعض اوقات پتھر اڑاتے۔ جب حالات بے قابو ہونے لگتے اور تعلقہ تنصیبات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا، تو فوج، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس کے دستوں کو گولی چلانا پڑتی، جس سے بعض افراد ہلاک یا زخمی ہو جاتے۔ یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔

۴ مارچ کو ایک ہفتے کی جھڑپوں کا خلاصہ ایک سرکاری علیحدہ کی صورت میں جاری کیا گیا جس میں اس بات کا اقرار کیا گیا کہ گزشتہ چھ دنوں میں ۱۴۲ افراد ہلاک اور ۳۵۸ زخمی ہوئے۔ اس کی تفصیلات یہ تھیں:

”شاہانگ میں واپس کالونی، باغ کالونی، فیروز باغ اور بہاڑی میں ایک تصادم کے دوران میں ۲۸ افراد ہلاک اور ۲۰۵ زخمی ہوئے۔ فوج کے ہاتھوں پانچ افراد ہلاک اور ایک زخمی ہوا جبکہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے ہاتھوں دو آدمی گولیوں کا نشانہ بنے۔ ۲۴ مارچ کو بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں صورت حال پر قابو پانے کے لیے پولیس کو گولی چلانا پڑی جس میں ۳۴ افراد مارے گئے۔ رنگپور میں ایک ایسے ہی تصادم کو روکنے کے لیے سیکورٹی فورس کو کئی گنا پڑی جس کے نتیجے میں تین افراد ہلاک اور گیارہ زخمی ہوئے۔ ۲۵ مارچ کو کھٹنا کے قریب تخریب کاری کی وجہ سے ریل گاڑی پٹری سے اتر گئی اور پولیس فائرنگ سے چار افراد وہیں ڈھیر ہو گئے اور ایک آدمی

کو چوٹیں لگیں۔ ۶ مارچ کو ۳۲۱ افراد نے جوڈھاکہ سنٹرل جیل میں بند تھے جیل کے دروازے توڑ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ پولیس نے ان کی کوشش ناکام بنانے کے لیے فائرنگ کی، سات آدمی ہلاک اور تیس زخمی ہوئے۔ ۱۳ مارچ کو مشتعل ہجوم نے جیسور، کھٹنا اور راجشاہی کے ٹیلیفون ایکسچینج پر ہلے بول دیا۔ فوجی جوانوں کو جو ان نازک تنصیبات کی حفاظت پر مامور تھے، مجبوراً گولی چلانا پڑی جس کے نتیجے میں ۸ آدمی ہلاک اور ۱۹ زخمی ہوئے۔ ۱۵ مارچ کو کھٹنا جلاتے ہوئے فوجیوں پر ایک ہجوم نے حملہ کر دیا۔ فوجیوں کو اپنی مدافعت میں گولی چلانی پڑی تین افراد ہلاک اور چند زخمی ہوئے۔

”اپنے فرائض کی ادائیگی میں قانون نافذ کرنے والے افراد کو بھی قربانی دینا پڑی، ایک افسر ہلاک اور ایک زخمی ہوا۔ ۲۴ مارچ کو درمیان شب کو ڈھاکہ میں ٹھٹھری بازار اور نواب پور کے علاقے میں ایسٹ پاکستان رائفلز کے ہاتھوں ۲۶ افراد ہلاک اور ۵۳ زخمی ہوئے۔ ای پی آر کے ایک سپاہی کو اپنی مدافعت میں گولی چلانا پڑی جس کی وجہ سے چار افراد ہلاک اور تین زخمی ہوئے۔

”یوں صوبے بھر میں فوج کے ہاتھوں کل ۲۳ افراد ہلاک اور ۲۶ زخمی ہوئے۔ ان میں سے چھ افراد اس وقت مارے گئے جب ایک ہجوم نے صدر گھاٹ (ڈھاکہ) ۲۴ مارچ کو درمیان رات کو فوجیوں کی ایک ٹولی پر حملہ کر دیا۔ اگلی صبح ڈھاکہ ہی میں ایک پھرے ہوئے ہجوم نے مقامی ٹیلی ویژن اسٹیشن پر ہلے بول دیا۔ وہاں متعین فوجی دستے نے گولی چلائی اور ایک شخص ہلاک ہو گیا۔“

یہ تھے ایک ہفتے کے سرکاری اعداد و شمار بنگالیوں نے مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ حقائق کو کوئی نگاہٹ کر بیان کیا گیا ہے۔ انہیں سرکاری اعلانیے کے بجائے ان خبروں پر زیادہ اعتماد تھا جو عوامی لیگ کے ذریعے سے مقامی اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں۔ یہ اخبار ان واقعات کو خوب اچھا لارہے تھے اور اشتعال انگیز مژخیاں جاتے تھے، مثلاً ”آج ہزاروں افراد کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا“۔ ”سینکڑوں افراد موقع پر ہی ڈھیر ہو گئے“۔ ”گولیوں کا نشانہ بننے والوں میں بڑی تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے“ وغیرہ۔

اگر سرکاری مینڈیٹ اور ٹی بی بی کے تفصیلات کو گھٹا کر بیان کیا گیا تو مقامی اخبارات نے انہیں کئی گنا بڑھا کر کر دی کر دی، لیکن جو قیامت غیر بنگالیوں (بہاریوں) پر ٹوٹی، اس کا نوحہ نہ سرکاری اعلانیوں میں درج ہوا نہ اخبارات میں۔ ان کا خون ان کی آہوں کی طرح بے اثر کیا۔ مجسمیت کئی لوگوں نے حکام بالا سے کہا کہ عوامی لیگ کے ”دور حکومت“ میں ہونے والے ان مظالم کی تفصیلات چھپی چاہئیں مگر وہ نہ مانے۔ ان کا اصرار یہ تھا کہ یہ دلخاش واقعات پردہ راز میں ہی رہنے چاہئیں، ورنہ نقصان ہوں گے۔ اول یہ کہ ایسی خبروں سے مسلمانوں نے مسلمانوں کا گلا کاٹنا شروع کر دیا (دوقومی نظریے کی نفی ہوگی۔ دوئم اس سے مغربی پاکستان میں انتقام کی فضا پیدا ہوگی جہاں ہزاروں بنگالی پُر امن زندگی گزار رہے ہیں۔

ان دلائل کے باوجود میرے جیسے بعض افراد کا خیال تھا کہ غیر بنگالیوں پر ہونے والے مظالم کی تشہیر ضرور ہونی چاہیے، ورنہ یہ تاثر لیا جائے گا کہ بنگالی معصوم ہیں اور وہ فوج کے ہاتھوں ستم سہہ رہے ہیں، حالانکہ ستم سننے والوں میں غیر بنگالیوں کی بھی بڑی تعداد شامل ہے اور ان پر ظلم ڈھانے والے خود بنگالی ہیں۔ یہ دلیل ایک تجویز کی شکل میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دفتر (راولپنڈی) میں بھیجی

ملہ پاکستان ایئر بورڈ ڈھاکہ، مورخہ ۸ مارچ ۱۹۷۱ء

گئی، مگر کوئی جواب نہ آیا۔

اسی عرصے میں عجیب الرحمن نے ایک اور محاذ پر اپنی تیاریاں مکمل کر لیں۔ یہ تھا براہ راست فوج سے ٹکرائے کا محاذ۔ اس سلسلے میں انہوں نے کرنل (ریٹائرڈ) ایم۔ اے۔ جی عثمانی کو (رحمن کی ہونجھوں کا ذکر پہلے آچکا ہے) یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ رافعت کے لیے ایک فورس تیار کر لیں۔ عجیب کی اس پرائیویٹ فوج کے افراد سابق فوجیوں، عوامی لیگ کے رضا کاروں اور یونیورسٹی کے طالب علموں سے لیے گئے۔ اسلحے کی ضروریات اسلحہ خانوں کو لوٹ کر پوری کی گئیں، صوبائی حکومت کے تحت، انصار، فورس کی ہزاروں رائلفلین جوہول انتظامیہ کے پاس ہوتی تھیں، ان افراد میں بانٹ دی گئیں۔ کچھ اسلحہ بیرون ملک بھارت سے بھی آیا۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی کے لڑکوں اور لڑکیوں نے سائنس لیبارٹری میں نصابی تجربات کرنے کے بجائے دسی بم بنانے شروع کر دیے۔ یہ بم بنانے کے لیے زیادہ معلومات یا ساز و سامان درکار نہ تھا۔ ہر وہ چیز جو دھماکے سے پھٹ سکے اور قریب کھڑے افراد کو نقصان پہنچا سکے، کافی تھی۔

اس پرائیویٹ آرمی نے کرنل عثمانی کے زیر نگرانی بھرپور تربیت کا آغاز کیا اور لڑکوں نے مورچہ بندی اور لڑکوں پر گاموں کی کھڑی کرنے کی مشق شروع کر دی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ایک غریبہ بنگالی سیاست دان نے عجیب سے کہا: آپ کیا بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں، کیا ان تیاریوں سے آپ پاکستان کی پیشہ ور فوج کا مقابلہ کر سکیں گے؟ عجیب نے جواب دیا: بالکل ہی پیشہ ور فوج؟ وہ فوج جو دھماکے میں گرفتار نافذ نہ کر سکی، سڑاھے سات کروڑ عوام کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔ خواہ تمہارا کچھ بھی ہوں۔“

عجیب کے کہنے پر کرنل عثمانی نے ایٹم بنگال، جھٹ، ایٹم پاکستان، رائلفلن اور پولیس سے بھی رابطہ قائم کیا تاکہ وقت ضرورت ان سے بھی مدد لی جاسکے۔ ان تینوں شعبوں میں ملازمت کرنے والے بنگالی پہلے ہی تربیت یافتہ اور ہتھیار بند تھے اور اندر ہی اندر ان کی ہمدردیاں بھی عوامی لیگ کے ساتھ تھیں، لیکن اوپر سے ڈسپن کا خول یا مجرم قائم تھا۔ ان میں سے کئی درپردہ عوامی لیگ کی فوجی کمیٹی کے اجلاس میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے۔

سیخ: عجیب الرحمن اور ان کے مقرر کردہ کمانڈر انچیف کرنل ایم۔ اے۔ جی عثمانی کی مشہوری یہ تھی کہ اندر ہی اندر فوجی محاذ پر لڑنے کی تیاریاں مکمل کر لی جائیں اور اوپر سیاسی محاذ گرم رکھا جائے، مگر نہ کیسی سیاسی محاذ کی پیش ہی سے اندرونی محاذ کو حرارت مل سکتی تھی اور اگر سیاسی عمل سے انصاف العین حاصل ہو جائے، تو ٹکرائے کی کیا ضرورت ہے، البتہ تیاری دونوں محاذوں پر مکمل ہونی چاہیے۔

منہ کے بات یہ ہے کہ انٹیلی جنس والوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے ان تمام تیاریوں کے متعلق حکام بالا کو باخبر رکھا۔ پتہ نہیں ان کی رپورٹیں کس مرحلے پر ملے اثر ہو کر رہ جاتی تھیں۔ میں نے خود ایک سینئر افسر سے فوج میں عوامی لیگ کے اثر و رسوخ اور ترقی محاذ کا ذکر کیا۔ اس نے مجھے یہ کہہ کر جھک دیا: بکواس بند کرو، تم دنیا کی بہترین فوج کے ڈسپن پر بہتان لگا رہے ہو۔“

عجیب الرحمن کی حکومت کے پہلے پندرہ روز کی فضا یہ تھی جس میں ہمیں بالآخر بھیجی خاں کی آمد کا خروہ پہنچا۔

لے بعد یقین کے دوران جن فوجی انٹرول نے اس فوجی سازش میں موٹ رہنے کا اعتراف کیا، ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: بریگیڈیئر محمد ذرا کماڈنٹ ایٹم بنگال، کمانڈر انچیف کرنل سودا حسن کمانڈنگ آفیسر، ایٹم بنگال، جھٹ، ایٹم بنگال، کرنل حسین گورنر کی معائنہ ٹیم کے ممبر۔ ان کے علاوہ میجر شرف میجر جلیل میجر جعفر نور میجر ضیاء الرحمن بھی شامل تھے، لیکن یہ گرفتار نہ ہو سکے، اس لیے یقین کے دوران ان کے اعتراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔

## باب ۸

## بھٹو، مجیب اور یحییٰ

یوں تو میں نے کئی ملکوں کے سربراہوں کی آمد کا بارہا مشاہدہ کیا ہے، مگر ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو دھاکہ میں صدر یحییٰ خاں کی آمد کا منظر کبھی نہیں بھولوں گا عجیب فضا تھی۔ ماہ وصال کے لحاظ سے موسم بہار کے شباب کا وقت تھا، مگر سیاسی کشمکش نے اسے پُر آشوب و در میں بدل دیا تھا۔ رُوسلی سربہر کو کھلی ہوا میں بھی دم گھٹتا تھا۔

دھاکہ ایئر پورٹ کے تمام راستے بند کر دیے گئے تھے، صرف پی۔ اے۔ ایف میں والا گیٹ کھلا تھا جس کے باہرہ انجناب کی ایک کمپنی ہتھیاروں سے لیس ٹرکوں میں سوار گھڑی تھی، ہر ٹرک کی چوٹی پر مشین گن نصب تھی جس کا دستہ ایک چاقو بند شین گنر کے قبضے میں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا اشارہ پاتے ہی وہ گولیوں کی بوجھاڑ کر دے گا گیٹ سے اندر جانے پر سخت پابندی تھی، صرف ٹھہری ہوئے افراد کو داخلے کے خصوصی پاس جاری کیے گئے تھے۔ ان میں سے ہر کسی کو گیٹ پر روک کر پوری چھان بین کی جاتی کہ پاس کا کہیں غلط استعمال تو نہیں ہو رہا ہیں بڑی شکلوں سے اندر داخل ہوا۔

ہوائی اڈے کی عمارت پر بھی فوج تعین تھی۔ ہتھیار بند آہنی خود پھینے ہر تن متعذر ہوائی جہازوں کی آمد و رفت بھی روک دی گئی تھی۔ صرف صدر کے جہاز کا انتظار تھا، جو کسی لمحے پہنچے والا تھا۔

استقبال کرنے والوں میں لیفٹیننٹ جنرل لنگا خاں، میجر جنرل خادم راہہ، میجر جنرل فرمان، میجر جنرل البکر عثمان، چھڈر کارڈ مارٹر جنرل جی ایچ کیو (اور پانچ چھ اور افسر تھے سرکردہ شہریوں کی لمبی قطار تھی نہ سرکاری (سولیں)، انہوں کی قیاب نگاہیں بھٹوؤں کے گلستے تھے نہ اودے اودے باموں والے بچے۔ اخبار نویس تھے نہ فوٹو گرافر، حتیٰ کہ سرکاری فوٹو گرافر بھی غائب تھا۔

جنرل لنگا خاں اور ان کے ساتھی پی آئی اے کے ہیڈنگر (HANGAR) کے پاس چھوٹے سے کنٹرول آفس کے باہر کھڑے تھے۔ ان سے تقریباً سو میٹر دور ایک چھوٹا ہیل کاپٹر (الوہٹ III) اڑنے اور اترنے کی مشق کر رہا تھا۔ میں نے اس کی موجودگی کی وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ ہوائی اڈے سے شہر کو جانے والی سڑک پر عوامی لیگ کی چمک پوسٹ ہے، ممکن ہے صدر کو تیل کا پٹرکے کنڈیلے ایوان صدر پہنچا پا رہے۔

میں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی، یحییٰ خاں کی آمد میں صرف چند منٹ باقی تھے۔ میں نے مغرب کی جانب ان کا پونگ طیارہ تلاش کیا، جو کہیں نظر نہ آیا، البتہ اچانک سیاہ رنگ کا ایک گدھ اڑتا ہوا آیا اور ہمارے سروں کے اوپر سے پرواز کرتا نظر گیا۔ اتنے میں دھاکہ کا بنگالی پرنٹنگ پوسٹ ہانپتا ہوا آیا اور فوجی انہوں کو خوشخبری سننے لگا کہ شیخ صاحب کمال مہربانی سے اس بات پر آمادہ ہو گئے ہیں کہ خادم گیٹ والی چوکی فوراً اٹھالی جائے تاکہ ”جہان کو کوئی پریشانی نہ ہو“ اس سے پیشتر مجیب الرحمن کھلے عام یہ کہہ چکے



تھے کہ ”صدر سچی خاں جنگلہ دیش کے مہمان کی حیثیت سے تشریف لاسکتے ہیں۔“

ٹھیک تین بجے سرپر صدر کا طیارہ اتر آیا۔ پی آئی اے کے عملہ کی عدم موجودگی میں بی۔ اے۔ ایف کے کپتان لیڈر تافنی نے طہری لگائی صدر اترے۔ ان کا شعلہ جیہہ صحت و توانائی کی تابانیاں بکھیر رہا تھا، بڑے پُر اعتماد اور خوش و غرم نظر آ رہے تھے جہاز کے عملے کے متعلق جو انہیں سری لیکا کے راستے سارے پانچ گھنٹے میں ڈھاکہ لایا تھا، انہوں نے کہا: ”یہ بڑے بہادر بیٹے ہیں، شاہ باں!“ ان میں کوئی بچی نہ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے سب سے ہاتھ ملایا۔ میرے ساتھ بھی۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ذہن یا ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں۔ وہ افکارات سے آزاد یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی فوجی یونٹ کے معاینے پر آئے ہوں۔ معلوم ہوتا تھا انہیں حالات کی اس سنگین کا علم نہ تھا جو ہماری نیندیں حرام کیے ہوئے تھی۔

مصافحہ ختم ہوا، تو صدر کے شایان شان کار سامنے آگئی۔ اس پر جرنیل کی علامت چارستاروں والی پلیٹ اور پاکستانی جھنڈا لگا تھا جنرل لگا خاں نے کہا:

”سرمو کیا آپ کار میں تشریف لے جائیں گے؟“

”کیا آپ کو اس میں کوئی شک ہے؟“

”جی نہیں میرا مطلب تھا کہ... کہ سبلی کا پر بھی تیار ہے۔“

”نہیں انہیں میں کار میں جاؤں گا۔“

”اچھا، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“

”پھر آپ کو کھوٹے کون آئے گا؟“

کاروں کا کارواں روانہ ہوا۔ پی۔ اے۔ ایف گیٹ سے باہر انچاب کی کمپنی نے حفاظتی فرائض سنبھالے اور میں چھاؤنی میں آپریشن روم میں چلا گیا جہاں صدر کے نازک سفر کی لمحہ بلمحہ خبریں آرہی تھیں: ”اب وہ بحفاظت فارم گیٹ سے گزر گئے ہیں۔“... ”اب وہ وی آئی پی ایئرپورٹ کے پاس ہیں۔“... ”اب کار الوان صدر کی طرف مڑ رہی ہے۔“... ”اب مہمان بخیر و خوبی اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔“ آخری پیغام سن کر سب کے دم میں دم آیا۔

اسی شام جنرل سچی خاں نے اعلیٰ فوجی افسروں کا ایک اجلاس الوان صدر میں طلب کیا۔ اس اجلاس میں جنرل لگا خاں، میجر جنرل خادم راجہ، میجر جنرل فرمان اور ایئر کورڈوسر سود نے شرکت کی۔ یہ اجلاس کم اور بلیٹنگ زیادہ تھی۔ اس کا مقصد تازہ صورت حال سے صدر کو آگاہ کرنا تھا کہ بلیٹنگ فوجی ضابطے کے مطابق شروع ہوئی۔ اس میں شن، وسائل اور وسائل کی تقسیم وغیرہ کا ذکر کیا گیا اور امن عامہ کی حد تک موجودہ صورت حال کا تجزیہ پیش کیا۔ اس بلیٹنگ کا اختتام روایتی انداز میں رجائیت پر ہوا۔ امن وامان کی صورت حال کے چھبے کار فرما عوامل کی نشاندہی نہ کی گئی اور نہ کوئی ایسی سفارشات پیش کی گئیں جو بہتر مستقبل کی ضمانت دے سکیں۔ میں نے بعد میں ایک سینئر فوجی افسر سے اس کو تاہم کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا: ”صدر نے کبھی ہمارے تجربوں پر اعتماد نہیں کیا۔ ان کے اپنے سرکاری اور غیر سرکاری مشیر ہیں ان کے ہوتے ہوئے میں ایسے تردد کی ضرورت نہ تھی۔“

اجلاس کے آخر میں صدر نے فرمایا: ”آپ لوگ پریشن نہ ہوں میں کل عجیب کو بلواؤں گا اور اُسے کھری کھری مٹاؤں گا، ایسی سر دھری دکھاؤں گا کہ دوپہر کے کھانے کا بھی نہیں پوچھوں گا۔ اس کے بعد پرسوں اس سے باقاعدہ ملاقات کروں گا اور دیکھوں گا کہ

اس کی طبیعت ٹھیک ہوئی ہے کہ نہیں مگر پھر بھی وہ راہِ راست پر نہ آیا، تو میں جانتا ہوں کہ اس کا علاج کیا ہے، صدر کے مُنہ سے یہ تند و تیز کلمات سن کر حاضرین پر خاموشی چھا گئی۔ ”میں جانتا ہوں اس کا علاج کیا ہے؛ بار بار ذہنوں میں بجنے لگا چند لمحوں بعد ایک جیت اور پھر برے بدن والا افسر سچ کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ٹوڈ بنگر بنجیدہ لیجے میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی۔ صدر نے سُر کی جنبش سے اجازت مرحمت فرمائی، تو اُس نے کہا: ”جناب والا احوالات بڑے ہی نازک ہیں یہ بنیادی طور پر سیاسی مسئلہ ہے، اسے سیاسی طور پر ہی حل کرنا چاہیے؛ ورنہ ہزاروں بے گناہ مرد، عورتیں اور بچے خواہ مخواہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“ جنرل سچی خاں نے یہ جملے ہمدردی گوش اور دوسروں نے ہمدردی تشویش بن کر سنے سامعین میں سے کئی دل تیز دھڑکے صدر سچی خاں نے اپنی بھاری بلکیں جھپکے ہوئے جواب دیا: ”ہائیں، مٹی لیں مجھے علم ہے... میں جانتا ہوں... بیٹھ جاؤ۔“ مٹی بیٹھ گئے کچھ عرصہ بعد مٹی کو اس جرأتِ دندانہ کی یادداشت میں فرائض سے سبکدوش کر دیا گیا، تھوڑی دیر بعد اجلاس ختم ہو گیا۔ ڈھاکہ میں صدر سچی کا یہ آخری فوجی اجلاس تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے سیاسی کاموں میں لگ گئے۔

اگلے روز سچی خاں نے الوان صدر میں عجیب سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران کوئی اور موجود نہ تھا۔ باہر سے دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ یہ سابقہ اعتماد کی نگہی ہوئی دھجیوں کو جوڑنے کی ایک کوشش ہے سچی خاں نے اس ملاقات کے دوران محسوس کیا کہ عجیب اب انتخابات سے پہلے والا عجیب نہیں ہے۔ اب یہ جناب کی ہاں میں ہاں ملا کر دلجوئی حاصل کرنے کے بجائے احتیاط اور سرد مہری سے کام لے رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ دل کی بات کھل کر زبان پر نہیں لا رہا۔ صدر کو یہ نیا عجیب الزمکن دریافت کر کے ضرور تعجب ہوا ہو گا۔ یہ امر حیران کن ہے کہ لیڈروں کی تیز حیات کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ لان میں اگتے ہوئے گھاس کی آواز بھی سن سکتے ہیں مگر سچی خاں کو گھاس میں چھپا ہوا ایر سانپ پورا ایک سال نظر نہ آیا۔

درحقیقت ماہ مارچ کے پہلے پندرہواڑے میں حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا اور سچی خاں نے انہیں جس طرح خراب سے خراب تر ہونے کا موقع دیا تھا، اس کے بعد گفت و شنید اور صلاح مشورے کے امکانات خاصے کم ہو چکے تھے۔ اب جناب عجیب یہ سمجھنے لگے تھے کہ پورے صوبے پر میرا قبضہ ہے، میں یہ اقتدار سچی خاں کو کیوں لوٹاؤں اور سچی خاں سوچتے تھے کہ میں پورے ملک کا سربراہ اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہوں، میں رضا کارانہ طور پر (صوبے میں) عجیب کی حاکمیت کیسے تسلیم کروں۔ شیخ صاحب اسی صورت میں مغربی پاکستان سے آنے والے مہمان کی بات مان سکتے تھے جب وہ چھ نکات پر مبنی آئین پر مصاد کرنے کو تیار ہو، لیکن سچی خاں ایسے آئین کی تائید کر کے اپنے بیس (BASE) کو تباہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔

مارچ کو سچی خاں اور عجیب کے درمیان بات چیت کا ایک اور دور ہوا جس میں دونوں جانب سے ماہرین اور مشیر بھی شامل ہوئے طرفین نے اپنا اپنا نقطہ نظر بڑی وضاحت سے پیش کیا، مگر سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ عوامی لیگ کے ماہرین نے اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں وزنی دلائل تیار کر رکھے تھے، مگر صدر اور ان کے مشیروں کو قائل نہ کر سکے۔ اجلاس تعطل کا شکار ہو گیا۔

اجلاس کے بعد عجیب الزمکن اپنی سفید کار پر سہا جھنڈا لہرائے الوان صدر سے باہر نکلے، تو منتظر اخبار نویسوں نے انہیں

لے مارچ کے ابتدائیں جو ہنگامی مائے گئے، ان کا مقصد جگہ جگہ سے لہر کر گیا عجیب الزمکن کی کار پر جھنڈا بھی اسی مائے کا بھلا مت تھا۔



روک لیا، میں بھی وہیں موجود تھا، مگر عجیب لسنے بے قرار اور جنونی کیفیت میں تھے کہ انہوں نے میری وردی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ان کے بائیں بازو کے پاس کھڑا ان کا چہرہ پڑھتا رہا۔ ان کا چہرہ راکھ کی طرح تھا، ہونٹ شدت جذبات سے پھٹک رہے تھے اور بدن کانپ رہا تھا۔ میں مشرقی پاکستان کے سب سے با اثر لیڈر کا بہ حال دیکھ کر گھبرا گیا۔ میں نے سوچا کہ اس دندانہ تلے شہر کی کھال میں یہ طوفان بلا وجہ نہیں آسکتا ضرور ہم کسی عظیم ایجنے کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔

اخبار نویسوں نے ان سے جھپٹ پٹ کئی سوال کر ڈالے، "گر وہ ہاں، ہاں، نہ، نہ" جیسے مختصر جواب دے کر دھان مندی (گھر) کی طرف چل دیے۔ اخبار نویس ان کے پیچھے ان کے مکان کی طرف بھاگے۔ میں برگد کے درخت تلے اکیلا رہ گیا۔ دھلتے سورج کی وجہ سے سائے طویل ہو چکے تھے۔ ایوان صدر کا آہنی دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔ اس کی پھریلوں سے صرف سنتری کی سنگین دکھائی دے رہی تھی۔

چھاؤنی آکر پتہ چلا کہ مذاکرات کے نتائج معلوم کرنے کے لیے میر جبریل خادم راجہ جبریل لنگا خاں کے پاس گئے، مگر لنگا خاں نے بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "خادم! میں بھی مذاکرات کے متعلق آنتا ہی جانتا ہوں جتنا تم۔" جبریل راجہ نے کہا: "لیکن مذاکرات کی رفتار اور نتائج سے باخبر رہنا تو آپ کے فرائض میں ہے، کیا پتہ آپ کو کس وقت کوئٹہ اکیشن لینے کو کہا جائے؟" ہرنے کی بات یہ نکتہ لنگا خاں کے پلے پڑ گیا اور وہ سیدھے جبریل بھٹی خاں کے پاس گئے۔ کہا جاتا ہے جبریل بھٹی نے لنگا خاں کے سوالوں کے جواب میں بتایا: "وہ حراجی کر رہا ہے آپ تیار رہیں،" واپس آکر لنگا خاں نے اسی رات ۱۰ بجے جبریل راجہ کو ٹیلیفون پر کہا: "خادم! آپ اپنی تیاری کر لیں، اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ ہر طرح کی صورت حال سے بچنے کے لیے کاغذی تیاری اور منصوبہ بندی کرنے کو کہا گیا ہے، مگر اس منصوبے کا دار و مدار سیاسی مذاکرات پر ہوگا۔ یہاں یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہر ملک کی فوج ہر قسم کی ممکنہ صورت حال سے بچنے کے لیے منصوبہ بندی کرتی ہے جس کا مقصد اندرونی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ ان منصوبوں کی موجودگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ ممالک ایسی کارروائی کرنے پر تڑپتے ہوئے ہیں، اس لیے بعض غیر ملکی مصنفین کا یہ استدلال سراسر بے بنیاد ہے کہ جب صدر یحییٰ خاں ایوان صدر میں سیاسی حل کے لیے کوشاں تھے، ڈھاکہ میں مقیم جرنیلوں نے انہیں فوجی کارروائی پر مجبور کیا۔ اگر بعض جرنیلوں کی طرف سے ان پر ایسا دباؤ تھا، تو یہ بھی خاں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے جرنیلوں کی طرف سے ہوگا۔ ڈھاکہ میں مقیم جرنیلوں کا انداز فکر مختلف تھا۔

اسی طرح میں بعض غیر ملکی صحافیوں کے ان الزامات کو بھی بعید از حقیقت سمجھتا ہوں کہ بھی خاں نے ڈھاکہ میں مذاکرات کا صرف اس لیے ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ ان کے جرنیلوں کو فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی اور تیاری کے لیے وقت مل سکے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ مذاکرات کے دوران تو کیا عجیب الزحمن کے ۲۵ روزہ حکیم مایچ سے ۲۵ مارچ تک) دور میں بھی کوئی فوجی کمک ڈھاکہ نہیں بھیجی گئی اور نہ فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی میں دس دن لگے۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ یہ منصوبہ کب، کہاں اور کتنے وقت میں تیار ہوا۔

۸ مارچ کو صبح کے دس بجے ہوں گے کہ میر جبریل راؤ فرمان علی، جی اسی خادم راجہ کے دفتر تشریف لائے اور فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ انہوں نے اس بنیادی مفروضے پر اتفاق کیا کہ حکیم مایچ سے روٹنا ہونے والے حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ امن دامن قائم رکھنے کے لیے پہلے سے جو منصوبہ "بلیٹز" (BLITZ) کے نام سے تیار پڑا

ہے وہ یکساں ہو چکا ہے کیونکہ اس منصوبے کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ بنگالی عوام ہمارے ساتھ ہیں اور صرف چند سرچروں سے بننا ہے، لیکن اب ان کے خیال میں صورت حال یہ تھی کہ عوامی تعاون کی توقع نہیں کی جاسکتی، اس لیے ایک ایسے منصوبے کی ضرورت ہے جو عجیب الزحمن کی غیر قانونی حکمرانی کا فوراً قلع قمع کر کے حکومت کے مؤثر اقتدار کو مؤثر طور پر بحال کر دے۔

ابتدائی سوچ بچار کے بعد جبریل فرمان نے آسمانی رنگ کا سرکاری پیڈ لنگا لاجس کے بائیں جانب ڈیڑھ انچ حاشیہ چھوڑ کر لمبی لکیری لکھی ہوئی ہے۔ انہوں نے سکے کی غامض پیل کے کرکری کے دائیں جانب منصوبے کا مسودہ لکھنا شروع کیا، جس میں فوجی کارروائی کی ضرورت، اس کے بنیادی لوازمات، مشن اور اس کی تکمیل کے لیے مختلف اقدامات کا ذکر کیا۔ منصوبے کا آخری حصہ جس میں صوبے میں تین مختلف یونٹوں کو مختلف کام سونپے گئے تھے، جبریل خادم نے سپر قلم کیا۔ دونوں کی کوششوں سے یہ منصوبہ اسی ایک نشست میں تیار ہو گیا۔

یہ منصوبہ جس کا نام "آپریشن سرچ لائٹ" رکھا گیا پانچ صفحات پر پھیلے ہوئے سولہ پی آر گران پر مشتمل تھا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو جنیم سوئم۔ اس منصوبے میں اور باتوں کے علاوہ دو بنیادی کارروائیوں پر زور دیا گیا: ایک یہ کہ بنگالی یونٹوں کو رد عمل کا موقع دیے بغیر فوراً غیر مسلح کر دیا جائے۔ دوسرے کہ عوامی لیگ کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر کے عدم تعاون کی تحریک کو قیادت سے محروم کر دیا جائے۔ منصوبے میں صحیحیہ کے طور پر عوامی لیگ کے ان سولہ رہنماؤں کے نام اور پتے بھی درج تھے جنہیں فوری طور پر گرفتار کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔

۲۰ مارچ کی سہ پہر کو ہاتھ کا لکھا ہوا یہ مسودہ فلک شہات ہاؤس میں جبریل عبد الحمید خاں اور جبریل لنگا خاں کو پڑھ کر سنا گیا۔ دونوں نے اسے بذرانی کوشی، والدہ جبریل حمید نے بنگالی یونٹوں کو غیر مسلح کرنے والی شہریت یہ کہہ کر کٹا دی کہ اس طرح دنیا کی بہترین فوج تباہ ہو جائے گی۔ مگر انہوں نے نیم فوجی تنظیموں مثلاً پولیس اور ایسٹ پاکستان رائفلز کو غیر مسلح کرنے کی منظوری دے دی۔ آخر میں انہوں نے پوچھا: "تمام یونٹوں کو اتنے سارے کام سونپنے کے بعد کتنی نفری درپزور) بچتی ہے؟" جبریل راجہ نے جھپٹ جواب دیا: "کچھ بھی نہیں"۔

بعد ازاں یہ منصوبہ جبریل بھٹی کو پیش کیا گیا۔ انہوں نے اسے ایک اور بنیادی خصوصیت سے محروم کر دیا۔ انہوں نے اس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا کہ مذاکرات کے بہانے عوامی لیگ کی اعلیٰ قیادت کو ایک جگہ جمع کر کے گرفتار کر لیا جائے، کیونکہ بقول ان کے "میں مذاکرات میں لوگوں کے اہتمام کو ٹھیس پہنچا کر قاتل جنہوریت کے طور پر تاریخ میں اپنا نام درج کروانا نہیں چاہتا۔" ان ترامیم کے بعد منصوبے میں جو کچھ بچا، اسے آخری شکل دے دی گئی۔ اس پر عمل درآمد کا انحصار مذاکرات کے نتائج پر تھا۔

اُدھ جب عجیب الزحمن مذاکرات میں مصروف تھے، تو ان کا غیر سرکاری کمانڈر انچیف کرنل (ریٹائرڈ) ایم۔ اے۔ جی عثمانی اپنی فوجی کارروائی کو قطعی شکل دے رہا تھا۔ اس نے عجیب کی "پرائیویٹ آرمی" کو تازہ ہدایات دینے کے علاوہ مشرقی پاکستان میں متعین



بنگالی یونٹوں سے بھی رابطہ قائم کیا اور انہیں مقررہ اشارے پر کارروائی کرنے کو کہا۔ ہندوستانی میجر جنرل (ریٹائرڈ) ڈی۔ کے۔ پلیٹ، جنرل عثمانی کے منصوبے کے حسب ذیل مقاصد بتاتے ہیں:

(ا) ڈھاکہ کے ہوائی اڈے اور چٹاگانگ کی بندرگاہ پر قبضہ کر کے مشرقی پاکستان میں داخلے کی تمام راہیں مسدود کر دی جائیں۔

(ب) ڈھاکہ کی یونیورسٹی کو مرکز بنا کر ایسٹ پاکستان رائفلز، پولیس اور طلبہ کی مدد سے ڈھاکہ شہر کو کنٹرول کیا جائے۔

(ج) مختلف چھاونیوں میں مقیم بنگالی یونٹیں بغاوت کر کے متعلقہ چھاونیوں پر قبضہ کر لیں۔

اس طرح فریقین نے اپنے طور پر بدترین حالات کے لیے تیاری مکمل کر لی، تاہم یہ معلوم نہ تھا کہ پہل کدھر سے ہوگی۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا دونوں دھڑوں کی یہ کوشش ہے کہ پہلے سیاسی بات چیت کو آزما دیا جائے، اگر خاطر خواہ نتائج نہ نکلیں، تو پھر فوجی کارروائی کی جائے۔

۱۸ مارچ کو سرکاری ذرائع سے مذاکرات میں کچھ پیش رفت کی اطلاع ملی۔ اس کی بالواسطہ تصدیق محیب الرحمن کے اُس بیان سے بھی ہوئی جو انہوں نے ایک صحافی کے سوال پر دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا: "کوئی پیش رفت نہ ہوتی تو میں مذاکرات جاری کیوں رکھتا؟" طبعی اطمینان بخش خبر جنرل لٹکا خاں اور چیر جنرل خادم راجہ کو ملی ہوئے۔ تب اس کی جھینک جھبجھ جیسے جو نثر افسروں تک پہنچی، تو محسوس ہوا کہ روشنی طلوع ہونے لگی ہے۔ شاید تاریک سُرنگ میں رہنے والوں کو ملکی سی کرن بھی روشنی کا پذیرا تھی ہے۔ یہ خبر جنرل کریم میں سے بعض افسر تھے پُر امید ہو گئے کہ انہوں نے اپنے بال بچوں کو مغربی پاکستان بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

بیکمی خاں اور محیب الرحمن کے درمیان مذاکرات آخر کار عوامی لیگ کی اس تجویز پر مرکوز ہو کر رہ گئے کہ بیکمی خاں کی سربراہی میں وقتی طور پر کوئی تبدیلی کیے بغیر مارشل لا فوراً اٹھایا جائے اور اقتدار پانچ صوبوں میں عوامی نمائندوں کو سونپ دیا جائے۔ آئین سازی کے متعلق عوامی لیگ کی تجویز یہ تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ارکان اسمبلی پر مشتمل دو الگ الگ کمیٹیاں قائم کر دی جائیں جو اسلام آباد اور ڈھاکہ میں اپنے اجلاس منعقد کریں اور ایک معینہ مدت میں اپنی الگ الگ رپورٹ تیار کریں۔ بعد میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلا کر ان دونوں رپورٹوں کو مدغم کر کے ایک قابل قبول آئین ترتیب دیا جائے۔ درمیانی مدت کے لیے چھ نکات کی روشنی میں ۱۹۶۲ء کے آئین میں صوبائی خود مختاری کی ضمانت دے کر اسے نافذ کیا جائے۔ جہاں تک مغربی پاکستان کے چار صوبوں کی خود مختاری کا تعلق ہے، انہیں اپنی مرضی کے مطابق اپنی حدود و قیود تعیین کرنے کا اختیار دیا جائے۔ انتقال اقتدار کی اس تجویز کو ایک صدارتی فرمان کے ذریعے نافذ کیا جائے۔

صدر بیکمی خاں کو اس تجویز میں ایک خوبی نظر آئی کہ اس سے ان کی کرسی پر اہم اہم وقتی طور پر کوئی ذریعہ نہیں پڑتی تھی یعنی وہ اور ان کے منتخب کردہ مشیر بھی برسر اقتدار رہیں گے۔ مذاکرات میں جس 'امید' یا 'روشنی' کا اوپر ذکر کیا ہے، غالباً اس کا پس منظر بھی یہی تجویز اور اس پر بیکمی خاں کا خوشگوار رد عمل تھا، لیکن اس تجویز کا سنگین پہلو یہ تھا کہ مارشل لا اٹھانے کے بعد بیکمی خاں کی حکومت کے لیے کوئی قانونی بنیاد باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ اس نکتے کو یا تو بیکمی خاں سمجھے نہیں یا اس سے جان بوجھ کر پہلو ہٹا کر گئے۔ انہوں

یہ اقتباس ان کی کتاب THE LIGHTNING CAMPAIGN سے لیا گیا ہے جو بھارتی مکر کی اعانت سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے فوراً بعد شائع ہوئی۔

روزنامہ پاکستان آج، روزہ ڈھاکہ، مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۷۱ء

نے محیب الرحمن کو یقین دلایا کہ اگر بھٹو کو اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ ہوا تو اسے تسلیم کر لیا جائے گا۔

ذوالفقار علی بھٹو ان دنوں کراچی میں بیٹھے ڈھاکہ مذاکرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے اس سے قبل بیکمی خاں کو اس مضمون کا ایک تار ارسال کیا تھا کہ اگر کوئی پی پی پی سے بالا بالا کوئی فیصلہ کیا گیا، تو اس پر عمل نہیں ہو سکے گا، یہ بیکمی خاں اور محیب کے درمیان مذاکرات کی روشنی میں بھٹو کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ ڈھاکہ تشریف لائیں۔ انہوں نے جواب بھیجا کہ "میں پہلے ہی اپنا لفظ نظر صدر پر واضح کر چکا ہوں، بیکمی خاں کے لیے مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ ادھر جناب محیب، بھٹو کو من لگانے کے لیے تیار نہ تھے، کیونکہ ان کے خیال میں بنگالیوں کے قتل و خون کا ذمہ دار بھٹو تھا اور ادھر بھٹو نے یہ شرط عائد کر دی تھی کہ وہ صرف اسی صورت میں ڈھاکہ آئے گا کہ محیب الرحمن اس کے ساتھ مذاکرات کے لیے آمادہ ہو۔

جب ٹیلی فون اور ٹیلی پرنٹر کے ذریعے بھٹو کو ڈھاکہ آنے پر آمادہ کیا جا رہا تھا، تو میں حسب عادت ڈھاکہ پریس کلب گیا جہاں ایک کمرہ مشق صحافی مسٹر حسین سے ملاقات ہوئی۔ اسے محیب کا قریب حاصل تھا۔ اس نے کہا: "جہاں تک ہمارا تعلق ہے بھٹو کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک بار ہم بیکمی خاں کو قائل کر لیں تو بھٹو کو منانا ان کا کام ہوگا، اور اگر بھٹو ان کی بات نہیں مانتا، تو پھر بیکمی خاں جہاں میں اور بھٹو، وہ بیچارا اس بات سے بے خبر تھا کہ بیکمی خاں بھٹو کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔

پریس کلب سے واپسی پر میں روزنامہ "دی پبل" کے دفتر میں رکھا صحافتی معیار سے گرا ہوا یہ اخبار فوج کے خلاف زہر اگلنے میں سب سے آگے تھا۔ وہاں میری ملاقات عوامی لیگ کے تین سرسٹروں سے ہوئی جنہوں نے موجودہ سیاسی بحران میں فوج کی نیت کے بارے میں مجھ پر چرچ شروع کر دی۔ اگر میرا حافظ جواب نہیں دے رہا، تو ان میں سے ایک کا نام شہاب الدین تھا۔ اس نے کہا: "کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ فوج جو اپنے خون سے ملک کا دفاع کرتی ہے، اس پر حکمرانی کا بھی حق رکھتی ہے؟" میں نے عرض کیا: "مگر نہیں، ہم تو خلوص دل سے سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام سرحدوں کا دفاع کرنا ہے۔" "اگر یہ درست ہے تو عوام کے نمائندہ کو اقتدار کیوں منتقل نہیں کرتے اور عوامی لیگ کا مسودہ آئین کیوں مان نہیں لیتے؟" اسے منظور یا منظور کرنا تو صدر کا یا پھر سیاست دانوں کا کام ہے۔ اس میں فوج کے عام افسروں اور سپاہیوں کا کوئی دخل نہیں،" میں نے جواب دیا۔

دوسرا میرا سرسٹرو سفید قمیص اور سیاہ فریم والا چشمہ پہنے ہوئے تھا، بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا: "میری تجویز یہ ہے کہ آپ عوامی لیگ کے آئین کو آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کے اندیشے درست ثابت ہوں اور واقعی ملکی سالمیت کا خطہ لاحق ہونے لگے، تو آپ اسے فوراً منسوخ کر دیں۔ آپ کے پاس تب بھی تو میں اور یہ ذیل ہوگی کہ آپ قومی سلامتی کی خاطر یہ اقدام کر رہے ہیں،" میں نے جواب دیا: "میں اس بات کا قائل نہیں کہ آئین کو تسلیم کر کے اسے بعد ازاں منسوخ کر دیا جائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آئین ایک ایسی مقدس دستاویز ہے جسے منظور کرنے کے بعد ہمیشہ قائم و دائم رکھنا چاہیے۔" "سرسٹرو نے ابو لے، "واہ، میرا صاحب فوج نے کب سے آئین کے تحفظ کا ٹھیکہ لیا ہے۔ دس سال میں دو آئین منسوخ کر کے آج آپ یہیں اس کے تقدس کا سبق دینے لگے ہیں۔"

روزنامہ پاکستان ٹائمز، راولپنڈی ۱۱ مارچ ۱۹۷۱ء



تیسرے سیرسٹر بھی بحث میں الجھنے کے لیے برقرار رہے تھے کہ میں نے گھڑی دیکھی اور اس معلومات افرا گفتگو سے اپنی خبر کو کاٹ کر کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اخبار کے مدیر سے اجازت چاہی اور چھاؤنی چلا گیا۔

چھاؤنی میں سیدھا گھر لانے کے بجائے میں نے سیرسٹر میں جھانکا جہاں کھانے کے بعد چند افسر بیٹھے ٹیلی وژن دیکھ رہے تھے حسب معمول ٹی وی پر گرام عوامی لیگ کی عدم تعاون کی تحریک کی تصویر دکھائی گئی رہا تھا۔ پرجوش لڑکے اور لڑکیاں گلا پھاڑ پھاڑ کر آزادی کے نعے الپ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی یہ فوجی افسر شرم کی تانہ خبر سننے کے لیے میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے انہیں سیرسٹروں والا واقعہ سنایا جس سے تڑپ کر کیپٹن چوہدری جھٹ لوے: ”صدر صاحب بلاوجہ معاملے کو طول دے رہے ہیں ان کے حکم کی دیر ہے، فوج کی ایک کمپنی برنگالیوں کو سیدھا کرنے گی“

بھٹو اور ان کے ساتھی اہل مارچ کو دھاکہ پہنچے عوامی لیگ نے بجگہ دیش کے مہمانوں کے استقبال کی ذمہ داری اٹھائی اور حفاظتی اقدامات سمیت تمام انتظامات اپنے ذمے لے لیے، البتہ فوج کو احساس تھا کہ اڑے وقت عوامی لیگ کا بندوبست قابل اعتماد ثابت نہ ہو گا اور بالآخر انہی کو یہ ذمہ داری بٹھانا پڑے گی چنانچہ فوج نے بھی مغربی پاکستان سے آنے والے وفد کے لیے متبادل انتظامات کیلئے حسب توقع جلد ہی عوامی لیگ کا بندوبست ناکام ہو گیا۔ بہر طرف انفرافرنی گئی اور بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت کے لیے فوج کو آگے بڑھنا پڑا۔

بھٹو سب سے پہلے صدر سیدی خاں سے ملے جنہوں نے نجیب الرحمن سے اپنے مذاکرات کے بارے میں پی پی پی چیئرمین کو مطلع کیا۔ بھٹو کا رد عمل ان کی کتاب (GREAT TRAGEDY) میں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: (صفحہ ۴۱)

”میں نے دو کمیشنوں کی تجویز کے بارے میں اپنے رفقاء کو مطلع کیا اور انہوں نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے شور و دیا کہ اس تجویز کو نہ مانوں، کیونکہ اس میں پاکستان کو دولت کرنے کے بجائے تباہی پہنچا دے گی“

مسٹر بھٹو نے اپنی صفائی میں جو دلیل دی ہے، اس کی تصدیق کہیں سے نہیں ہو سکتی، اس لیے یہ کتنا مشکل ہے کہ کبھی خاں نجیب الرحمن اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان مذاکرات صرف بھٹو کی ”حُب الوطنی“ کی وجہ سے ناکام ہو گئے مستقبل کے مورخ کو تاریخ کے اس اہم موڑ کے لیے مزید شہادتیں اکٹھی کرنا ہوں گی۔

تفعل کے انہی دنوں میں ۲۳ مارچ کا سورج طلوع ہوا۔ یوم پاکستان عوامی پاکستان، تحریک پاکستان اور استقلال پاکستان کے پس منظر میں منایا جاتا ہے، مگر اس روز دھاکہ میں کچھ اور ہی منظر تھا۔ عوامی لیگ نے اسے ”یوم مزاحمت“ کے طور پر منایا۔ عوامی لیگ کے چند کارکنوں نے قومی پرچم جلا دالا، قائد اعظم کی تصویر پھاڑ ڈالی اور ان کا ٹیگا بنا کر نذر آتش کر دیا۔ پاکستان کی یہ نمائندہ علامتیں ختم کرنے کے بعد انہوں نے آزاد بجگہ دیش کا پرچم ہر جگہ لہرایا اور نجیب الرحمن کی تصاویر جگہ جگہ آویزاں کر دیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے ٹیگور کا مشہور نغمہ ”سار بنگلہ“ قومی ترانے کے طور پر نشر کیا۔

اس حرکت کو محض چند انتہا پسند طلبہ کی شرارت پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ردوائی میں نجیب الرحمن شامل تھے۔ انہوں نے اسی صبح کو طلبہ کے ایک وفد سے اپنے گھر پر ملاقات کی (جسے عموماً غیر سرکاری ایوان صدر کہا جاتا تھا)۔ ان کی مرضی سے ان کے گھر پر آزاد بجگہ دیش کا پرچم لہرایا گیا۔ نجیب الرحمن نے اسے سلامی دی۔

۲۳ مارچ کو سائے شہر پر سبز اور قمری رنگ کے بجگہ دیشی پرچم لہرا رہے تھے۔ پاکستان کا جھنڈا صرف دو مقامات

پر نظر آ رہا تھا: ایک گورنمنٹ ہاؤس پر اور دوسرا مثل لاہیڈ کوارٹر کی عمارت پر، بلکہ گورنمنٹ ہاؤس کے مغربی دروازے پر بھی کسی نے بجگہ دیش کا جھنڈا لگا دیا تھا؛ تاہم اصل عمارت پر اب بھی پرچم تیار نہ تھا۔ مگر تنہا تنہا۔

بجگہ دیش کا جھنڈا لگانا بڑے بنگلہ کے آخریے لگاتے خوب دندناتے پھرتے تھے۔ وہ واقعی اسے یوم آزادی کے طور پر منانا بنگالی نوجوان شہر کی سڑکوں پر تھے بجگہ کے آخریے لگاتے خوب دندناتے پھرتے تھے۔ وہ واقعی اسے یوم آزادی کے طور پر منانا رہے تھے۔ بجگہ دیش کی آزادی! ان کی راہ میں صرف چند روڑے تھے جنہیں عجیب الرحمن پراس طور پر بٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔

۲۴ مارچ کو عوامی لیگ نے نئی تجاویز پیش کر دیں۔ اس نے دو دستور کی کمیٹیوں کے بجائے دو دستور کی کنونشن (محاسن) بنانے پر اصرار کیا اور کہا کہ یہ محاسن مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیے دو عمدہ عمدہ آئین مرتب کریں اور پھر ان دساتیر کو الحاق پاکستان یا کنفیڈریشن کے لیے بنایا جائے۔

اسی روز بھٹو اور سیدی خاں کے درمیان عمدہ ملاقات ہوئی اور انہوں نے اتفاق کیا (اور یہ اتفاق رائے پہلی بار نہیں ہوا تھا) کہ عوامی لیگ کی خود مختاری رفتہ رفتہ پاکستان کی آئینی شکست و ریخت تک پہنچ گئی ہے؛ لہذا قومی سلامتی اور بقا کے لیے ضروری کارروائی کرنی چاہیے۔ اس اتفاق رائے کے باوجود سیدی خاں نے اعلان کیا کہ مذاکرات کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری مشرتاج الدین نے اسی شام اپنی پارٹی کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ ہم نے ”آخری تجاویز“ پیش کر دی ہیں اور ہم ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرنے کو تیار نہیں۔

مغربی پاکستان کے سیاست دان ماہرین اور شیریں نے پرنڈوں کی طرح آنے والے طوفان کی بوس گھبراہٹ اپنے ایشیائوں کا رخ کرنے لگے۔ ان میں سے اکثر وہ مارچ کی صبح کو مغربی پاکستان روانہ ہو گئے۔ صرف بھٹو اور دو تین حضرات پیچھے رہے۔

بعد میں عوامی لیگ کے ایک ممبر نے مجھ سے جگہ کیا کہ ہمیں تو آخری وقت تک یہی کہا گیا کہ مذاکرات جاری ہیں کسی نے اشارہ بھی نہ کیا کہ مذاکرات ناکام ہو گئے ہیں یا عوامی لیگ خطرے کی لکیر کو پار کرنے والی ہے۔ میں نے عرض کیا: کیا کنفیڈریشن کی تجویز کے بعد بھی کوئی امید باقی رہ گئی تھی؟ اس نے جواب دیا: ”ہمارا خیال تھا کہ مذاکرات آگے بڑھ رہے ہیں فوج بدستور پیچھے ہٹ رہی ہے، ہم اپنی منزل کے بہت قریب ہیں، غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ ہم یہ فراموش کر بیٹھے کہ بھٹو بھی دھاکہ میں موجود ہے۔“

جب مغربی پاکستان کے قائدین دھاکہ سے کراچی روانہ ہو رہے تھے، تقریباً اسی وقت میرے جنرل خادم راجہ اور میرے جنرل راؤ فرمان علی بھی عمدہ علی علی کا پٹرل کے ریلوے سٹیشن پر موجود تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہاں کے ریلوے کمانڈر ریگنڈر ڈرائیو اور ریگنڈر اقبال شیخ کو اس پٹریشن سرچ لائٹ کی تفصیلات سے آگاہ کریں اور اشارہ ملتے ہی کارروائی کے لیے تیار رہنے کو کہیں۔

جنرل فرمان جیسور سے واپس دھاکہ آ گئے، مگر جنرل خادم کو ملا سے چٹا گانگ کے لیے چلے گئے تاکہ وہاں بھی یہی اہم ہدایات دے سکیں۔ چٹا گانگ کی حالت دوسری چھاؤنیوں کی نسبت خاصی نازک تھی۔ وہاں سب سے سینئر افسر ریگنڈر محمد تھے جو عوامی لیگ سے دلی وابستگی کے لیے مشہور تھے۔ انہیں اعتماد میں لینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جنرل راجہ نے نہایت ہوشیاری اور سلیقہ سے کام لیتے ہوئے چٹا گانگ میں متعین ایک غیر بنگالی افسر ٹیننٹ کرنل فاطمی سے رابطہ قائم کیا۔ اسے آگاہ میں لیا، رازداری پر زور دیا اور

اڑے پہنچے، تو بنگالی ونگ کمانڈر خوند کر اپنے دفتر میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے مجھٹ سیلی فون پر عجیب کو اطلاع دے دی۔  
صدر سنجی خاں کی روانگی کے پندرہ منٹ بعد ایک غیر ملکی صحافی نے ہٹل انٹر کانٹینیئنٹل سے مجھے فون کیا اور صدر کی  
روانگی کی سرکاری تصدیق چاہی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ صدر کی روانگی کا راز، راز نہیں رہا جب صدر نابل پرواز ہوئے تو شب کی  
تاریکی چھل چکی تھی۔ اس وقت کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس شب کی سرکاری نہیں ہوگی۔

کہا: تمہارا کام یہ ہوگا کہ جب تک بریگیڈیئر اقبال شفیق اپنی فوج لے کر کوئٹہ سے پہنچ نہیں جاتے، تم چٹاگانگ کو بندھالے رکھنا۔  
اس دوسرے میں جنرل خادم نے بریگیڈیئر محمد رسد سے کہا کہ ڈھاکہ سے شمال میں چند میل کے فاصلے پر ۲ ایٹ بنگال رجمنٹ میں  
بے جینی کے آثار پائے جاتے ہیں، انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے پاپا ٹائیگر کی ضرورت ہے۔ آپ بنگال رجمنٹ کے سینئر افسر ہیں،  
میرے ساتھ چلیں اور انہیں تسلی دیں۔ بریگیڈیئر محمد رسد فوراً رضامند ہو گئے اور وہ جنرل راجہ کے ساتھ سیلی کا پٹر میں بیٹھ کر ڈھاکہ آ  
گئے۔ وہ ڈھاکہ کیا آئے، اس پر ہرگز نہ گئے (اور پھر ملازمت سے ہٹا دیے گئے)۔

باقی چھ اونیوں کو فوجی کارروائی کی تفصیلات بتانے کے لیے چند اعلیٰ شہادت افسر سٹٹ، رنگپور اور راجشاہی تشریف لے گئے  
اور وہاں کے کمانڈروں کو اعتماد میں لے کر واپس چلے آئے۔

ڈھاکہ شہر ۵ بریگیڈیئر ذمہ داری تھی۔ بریگیڈیئر ارباب نے چچکے چچکے اُن مقامات کی نشاندہی کر لی جہاں کارروائی کرنا تھی۔ اس  
کام کے لیے انہوں نے سادہ لباس اور پرائیویٹ گاڑیوں میں اپنے عملے کو بھیجا۔ بظاہر یہ سارا معاملہ صیغہ راز میں رہا اور اس کا کوئی  
ناخوشگوار رد عمل نہ ہوا۔

صدر نے ۲۵ مارچ کو واپس راولپنڈی آنے کا فیصلہ کیا اور طے پایا کہ وہ اگلے روز قوم سے خطاب کریں گے۔ اس خطاب کے  
لیے میر جنرل راؤ فرمان علی نے حسب ذیل نکات مرتب کر کے صدر کے حوالے کیے:

- ① عجیب الرحمن کو عذر قرار دینے کے بجائے ایسا محبت و ملن بتا جائے جو انتہا پسندوں کے زعم میں بھٹس گیا ہے۔
- ① یہ اعلان کیا جائے کہ عجیب الرحمن کو کسی جرم میں گرفتار نہیں کیا گیا، بلکہ حفاظتی اقدام کے طور پر فوج کی تحویل میں لیا گیا ہے۔
- ① اس خطاب میں مشرقی پاکستان کے لیے خود مختاری کی حدود کا تعین کر دیا جائے۔

۲۶ مارچ کو صدر سنجی نے قوم کے نام جو تقریر نشر کی، اُس میں ان نکات کو سرسبز نظر انداز کر دیا۔ ڈھاکہ میں مقیم اعلیٰ افسروں  
کی رائے کو نظر انداز کرنے کا یہ پہلا۔۔۔ یا آخری۔۔۔ واقعہ نہ تھا۔ قوم سے خطاب میں جنرل سنجی خاں نے ایک متوازی حکومت  
قائم کرنے کی وجہ سے عجیب الرحمن کو عذر کہا اور اعلان کیا "اُسے اُس کے کیس کے سزا مل کر رہے گی۔" یہ اعلان عجیب الرحمن کی  
مددگار کی تقریر کا جواب معلوم ہوتا تھا جس میں انہوں نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا پر کہا تھا: "ہم اسے جیلنگ کیے بغیر  
نہیں جانے دیں گے۔"

صدر سنجی خاں کی روانگی کو اُن کی آمد سے بھی زیادہ پر اسرار بنا دیا گیا۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ایک چھوٹا سا ڈرامہ کھیلایا گیا۔  
صدر پر کو صدر چائے پینے کے بہانے ایوانِ صدر سے چھاؤنی میں واقع فلیگ شاپ ہاؤس تشریف لے گئے۔ دن کی روشنی ختم ہونے  
سے پہلے صدر کی سواری پورے طلاق اور لوازمات کے ساتھ چھاؤنی سے شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ اس کے آگے پیچھے جلیوں اور  
موٹر سائیکلوں کا قافلہ تھا۔ کار پر قومی پرچم لہرا رہا تھا اور اس کے آگے پیچھے چار تاروں والی پلیٹیں لگی تھیں جو یہ ظاہر کرتی تھیں  
کہ اندر جنرل صاحب بیٹھے ہیں۔ دراصل وہاں بریگیڈیئر رفیق بیٹھے تھے جن کا بیٹھنا اہم اور چوکنا کسی حد تک جنرل سنجی خاں سے  
ملتا جلتا تھا۔ اس سوانگ کو رازداری قائم رکھنے کا بہت بڑا معرکہ سمجھا گیا، حالانکہ عجیب کے جاسوسوں کو حقیقت حال  
کا پتا چل چکا تھا۔ سنجی خاں کے ایک بنگالی شہادت افسر ٹیننٹ کرنل اے۔ آر۔ چودھری نے صدر کا سامان لے جانے والا  
ڈاچ ٹرک دیکھ لیا اور فوراً عجیب کو خبر کر دی۔ اسی طرح شام کو سات بجے جب جنرل سنجی خاں پی۔ اے۔ ایف گیٹ سے ہوئی



جنرل عبدالحمید خاں  
چیف آف سٹاف (آرمی)

حصہ دوم

# خانہ جنگی

# آپریشن سرچ لائٹ

۲۵ مارچ، صبح ۱۱ بجے میجر جنرل خادم راجہ اپنے دفتر میں بیٹھے تھے کہ ان کی صاف شفاف مینبر پر پڑے ہوئے ٹیلیفونوں میں سے ایک اچانک بجنے لگا۔ یہ مقامی ہاٹ لائن تھی جو افسران بالا کے درمیان رابطہ کا کام دیتی تھی جو میجر جنرل راجہ نے میلو کہا، جنرل کاٹھا خاں بولے: ”خادم! آج رات!“

ٹھیک دو سال پہلے جنرل کی خاں نے فیلڈ مارشل ایوب خاں سے اقتدار وصول کیا تھا۔ آج وہ اپنے دور اقتدار کا سب سے بڑا فیصلہ دے چکے تھے۔ جنرل راجہ نے اپنے اسٹاف کو بلا کر ضروری ہدایات دے دیں۔ اڈہ کی سطح پر شاید یہ کمیشن معمول کی کارروائی سمجھا گیا ہو لیکن انجمنی سطح پر جب زیر تعلقہ حضرات تک پہنچی تو خاصی الجھن پھیل گئی۔ کوئی ٹینک ٹرک توپ کا امیونیشن لینے جھاگا، کوئی ہتھیار اکٹھے کرنے لگا، کسی نے اپنے موجودہ ہتھیاروں کی کمی پوری کرنا چاہی اور کسی نے ان کے ناقص اجزاء بدلنے کی کوشش کی۔ ۲۹ کیرولری کے چند افراد جو کچھ روز پہلے نگپور سے آئے تھے، ورکشاپ میں پڑے ہوئے چھ زنگ آلو ٹینکوں (ایم۔۲۴) کو صاف کرنے لگے۔ اگرچہ یہ ٹینک متحرک جنگ لڑنے کے قابل نہ تھے، مگر دھاکہ کی سڑکوں پر شور مچانے کے لیے کافی تھے۔

۱۴ ڈویژن کے اسٹاف نے دھاکہ سے باہر چھاونیوں کو آپریشن سرچ لائٹ کے متعلق ایک مخصوص کوڈ کے ذریعے اطلاع دینا شروع کر دی۔ اسی کارروائی کے لیے ۲۴ اور ۲۵ مارچ کی درمیانی رات ایک بجے کا وقت مقرر کیا گیا۔ وقت کے تعین میں مصلحت یہ تھی کہ اُس وقت تک جنرل کی خاں منجیر عافیت کراچی پہنچ چکے ہوں گے۔

”آپریشن سرچ لائٹ“ کے منصوبے کے مطابق دھاکہ میں تین سید کوآرڈز قائم کیے گئے۔ ایک کے انچارج میجر جنرل راجہ فرمان علی تھے۔ ان کے ذمے دھاکہ شہر تھا۔ ان کے وسائل میں ریگنیر لارباب والا ۵۵ بریگیڈ تھا۔ دوسرے سید کوآرڈ کے انچارج میجر جنرل خادم راجہ تھے جنہوں نے ۵۵ بریگیڈ کے علاوہ ۱۴ ڈویژن کے ذریعے سارے صوبے کو کنٹرول کرنا تھا۔ اس کے علاوہ لیفٹیننٹ جنرل کاٹھا خاں نے جنرل فرمان اور جنرل راجہ کی کارکردگی پر مجموعی طور پر نظر رکھنے کے لیے مارشل لا سید کوآرڈ میں رات جاگ کر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ یہ میجر سید کوآرڈ دارالحکومت ثانی کے علاقے میں واقع تھا۔

لے دارالحکومت ثانی سرخ آئین کا تہا بنوا جید وضع کا زیر نگیل منصوبہ تھا جس کا ڈیزائن امریکہ کے مشورہ ماہر فنی تعمیر لونی کاہن نے تیار کیا تھا۔ اس کی تعمیر کی بنیادی وجہ فیلڈ مارشل ایوب خاں (اکتوبر ۵۸ء سے مارچ ۱۹۹۹ء) کے زمانے میں اسلام آباد میں نئے دارالحکومت کا قیام تھا۔ جگہ لونی نے اسلام آباد کی تعمیر پر جوشیدہ روح عمل ظاہر کیا تھا۔ اسے منہذا کرنے کے لیے یہ دوسرا دارالحکومت شروع کیا گیا تھا۔ یہ دھاکہ کو ایئر پورٹ کے جنوب مغرب کی کنارے پر واقع ہے۔



کارروائی سے چند روز قبل مغربی پاکستان سے میجر جنرل افتخار جنجوعہ اور میجر جنرل ابوبکر عثمان ٹھہ کو ڈھاکہ بھیجا گیا تھا تاکہ وہ ضرورت پڑنے پر میجر جنرل خادم راجہ اور میجر جنرل راؤ فرمان کی جگہ و تداریاں سنبھال سکیں۔ یہ احتیاط اس لیے برتنی گئی کہ تھوڑا عرصہ پہلے تک یہ دونوں افسر جنرل صاحبزادہ یعقوب کی قیادت میں تھے جنرل یعقوب کو جابجائے تھے، مگر ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں فوجی کارروائی کرنے سے انکار نہ کریں۔ اس شک کی تصدیق کرنے کے لیے جنرل کچی خاں اور ان کے قریبی حلقوں نے کئی طریقے اختیار کیے، جتنی کہ ان کے ہم نوا دو ہم پیالہ دوست جنرل عبدالحمید نے جنرل فرمان اور جنرل راجہ کی بیگمیں سے پوچھا کہ آپ کے شوہروں کے خیالات کیا ہیں۔ جب یہ بات جنرل فرمان اور جنرل خادم تک پہنچی تو انہوں نے جنرل حمید کو یقین دلایا کہ ہم آپ کے فرمان کے خادم ہیں۔ میرے جیسے ادنیٰ افسر دس بجے رات جنرل کٹاخاں کے میز کو اڑیں، جمع ہونا شروع ہو گئے جب یہیں وہاں پہنچا تو دفتر کے احاطے میں صوفے اور آرام کرسیاں بکھری تھیں اور رات بھر کے لیے چائے اور کافی کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ میرے ذمے کوئی خاص فرائض نہ تھے، صرف "حاضر رہتے" کو کہا گیا تھا۔ یہیں ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ صوفوں اور کرسیوں کے پاس ایک جیپ کھڑی تھی جس میں جنرل وائس سیٹ نصب تھے۔ یہ بیرون خانہ آپریشن روم تھا جس میں جنرل کٹاخاں، جنرل ٹھہ اور چند اور حضرات تشریف فرما تھے۔

ٹھہڑی چاندنی میں ڈوبا ہوا شہر سو رہا تھا اور موسم بہار کی خشک ہوا میرے گالوں کو چھو کر گزر رہی تھی۔ باہر جتنا سکون تھا میرے اندر اتنا ہی زیادہ تلام تھا۔ میں سوچنے لگا یہ شوگر اور رات خون کی ہولی کھیلنے کے لیے قطعاً نامناسب ہے۔ مسلح افواج کے علاوہ اگر کچھ اور لوگ اس رات سرگرم عمل تھے تو وہ عوامی لیگ کے قائدین اور ان کی پرائیویٹ آرمی تھی بنگالی فوجیوں نے شہر کو بڑا کمزور کرنا شروع کر دیا تھا۔ کئی عرصے سے ہمدردی رکھنے والی پولیس اور ای پی آر مستعد تھی۔ شیخ مجیب الرحمن کا مقصد زبردستی کمانڈر ایچیف کرنل ایم۔ اے۔ جی عثمانی بنگالی فوجیوں سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔ ان تیاریوں کے باوجود ابھی تک ساری کارروائی پر خاموشی کی پٹی سی چادر تھی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے جیپ میں سویا ہوا وائس سیٹ جاگا۔ ڈھاکہ کے مقامی کمانڈر نے کارروائی مقررہ وقت (ایک بجے) سے پہلے شروع کرنے کی اجازت چاہی، کیونکہ مخالفین کو فوجی کارروائی کا علم ہو چکا تھا اور وہ پوری شد و مد سے مزاحمت کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا اب وقت ضائع کرنے سے حریف ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ ہم سب نے اپنی اپنی گھڑیوں پر نگاہ ڈالی اور اندازہ لگایا کہ ابھی جنرل کچی خاں سری لنکا کے قریب ہوں گے۔ اگر ابھی کارروائی شروع کی گئی تو عین ممکن ہے جہاز کے لڑاکا طیارے صدر کے فونک کو کراچی پہنچنے سے پہلے شکار کر لیں، چنانچہ کٹاخاں نے فیصلہ دیا: "بانی (ارباب) سے کہو کہ جب تک ممکن ہو صبر سے کام لے۔"

بریگیڈیئر ارباب کے ریگڈ کو وقت آنے پر حسب ذیل کارروائی کرنا تھی:

● ۱۳ افویئر فورس ڈھاکہ چھوٹی میں ریزرو فورس کے طور پر ٹھہرے گی اور وقت ضرورت چھوٹی کا دفاع کرے گی۔

● ۴۳ لائٹ ایک ایک جرنٹ (آئری) پہلے ہی ڈھاکہ ائیر پورٹ پر متعین تھی۔ اس کے ذمے ہوائی اڈے کا زمینی اور

فضائی دفاع تھا۔

● ۲۲ بلوچ ڈھاکہ شہر میں فیل خانہ میں تھی جہاں ایٹ پاکستان رائلز (ای پی آر) کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس کے ذمے ای پی آر

کے پانچ ہزار افراد کو غیر مسلح کرنا اور ان کے ٹیلیفون انجینئرین پر قبضہ کرنا تھا۔

● ۳۲ پنجاب کے ذمے راجہ باغ پولیس لائنز میں ایک ہزار بنگالیوں کو غیر مسلح کرنا تھا۔ یہ فورس عوامی لیگ کی ہمدرد بھیجی جاتی تھی۔

● ۱۸ پنجاب کو نواب پور اور پرائے شہر میں پھیل جانا تھا جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہاں ہندوؤں کے ان گنت مکانات اہل خانوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

● فیلڈ جرنٹ (آئری) کے ذمے متحدہ پور، میر پور اور ان سے ملحقہ علاقوں کو کنٹرول کرنا تھا۔

● ۱۸ پنجاب ۲۲ بلوچ اور ۳۲ پنجاب کی ایک ایک کمپنی پرنسٹن ایک خصوصی فورس تیار کی گئی تھی جس کے ذمے آقبال ہال اور جگن ناتھ ہال کو جو عوامی لیگ کے حامیوں کے گڑھ سمجھے جاتے تھے۔ باغیوں سے صاف کرنا تھا۔

● (ایم۔ ۲۴) ٹینکوں کے نامکمل اسکاڈرن کو حکم تھا کہ وہ پوچھنے سے پہلے شہر کی شاہراہوں پر اپنی قوت اور ہیبت کا مظاہرہ کریں اور اگر ضرورت پڑے تو فائر بھی کریں۔

● پیشی سروس گروپ (کمانڈر) کی ایک کمپنی کے ذمے مجیب الرحمن کو گرفتار کرنا تھا۔

مذکورہ بالا یونٹوں کے فرائض میں حکومت کے اقتدار کو بحال کرنا، چندہ چیدہ سیاسی قائدین کو گرفتار کرنا، اہم تنصیبات کی حفاظت کرنا اور مزاحمت کی صورت میں باغیوں کو کھل دینا شامل تھا۔ ان فوجیوں کو اپنے اپنے علاقوں میں رات ایک بجے سے پہلے پہنچنا تھا، لیکن راستے میں بنگالیوں کی کھڑکی کی ہوئی گاؤں کے پٹیل نظر کاٹر فوٹس چھوٹی سے ساڑھے گیارہ بجے ہی کل پڑیں۔ جو فوجی دستے پہلے ہی شہر میں ریڈیویشن ٹیلی وژن، ٹیلیفون انجینئرنگ، بجلی گھر اور ہیٹ بنگ وغیرہ کی حفاظت پر مامور تھے، انہوں نے بھی قوت سے پہلے اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔

چھاندنی سے جو پہلا دستہ روانہ ہوا، اسے فارم گیٹ پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں عوامی لیگ کے رضا کاروں نے چیک پوسٹ قائم کر رکھی تھی۔ اب انہوں نے وہاں وحشت کاٹ کر ٹرک پر گرا دیے تھے اور خالی جگہوں پر پرائی کار اور روٹی کوٹنے والا بلے کا راجن کھڑا کر دیا تھا۔ ان رکاوٹوں کے پار سینکڑوں بنگالی زور زور سے بے ہنگام کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے جنرل کٹاخاں کے میز کو اڑیں کھڑے ان نعروں کا شور مچا، دفعہ گولیوں کی تاراج تاراج سنا دی۔ پھر نعرے بلند ہوئے، پھر گولیوں کی بوجھا ہوئی پھر نعرے گولیوں کی سرسراہٹ اور چیخیں گھل گھل گئیں۔ ایک شور مچا ہوا۔ ایک دو مرتبہ کسی خود کار ہتھیار کے چلنے کی آواز بھی آئی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد ہنگامہ فرو ہوئے لگا اور نعرے مدھم پڑنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا ہتھیاروں نے نعروں پر برتری حاصل کر لی ہے۔ فوجی دستے رکاوٹ پار کر کے شہر کی طرف بڑھنے لگے۔ چاند و در کھڑا تھا اور چھاندنی اس آہ و بیک میں اپنا روپ کوٹھیتی تھی۔

اب جب کہ کارروائی خود بخود شروع ہو چکی تھی رات ایک بجے کا انتظار بے معنی تھا۔ دوزخ کے دروازے کھل چکے تھے۔ اس دوزخ میں بڑکنے والا پہلا شعلہ بلند ہوا تو ریڈیو پاکستان کی ریڈیائی لہر کے عین قریب شیخ مجیب الرحمن کی آواز سنا دی۔ اس نے عوامی جھوٹ بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ بینا پہلے سے ریکارڈ کیا ہوا ہے۔ اس کا مکمل متن جبارتی وزارت خارجہ کی مرثبہ کو "دو بنگلہ دیش کی دستاویزات" میں یوں درج ہے:

شاید یہ میرا آخری بیچام ہو۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج سے بنگلہ دیش آزاد ہے۔ میں عوام سے اپیل کرتا ہوں



بالخصوص روزنامہ دی میل کی عمارت سے تباہی کے آثار نظر آرہے تھے۔ بعض حصوں سے مختلف ہتھیاروں کے فائر کرنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

رات دو بجے کے قریب ایک بار پھر وائرلیس سیٹ نے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ میں قریب ہی کھڑا تھا۔ پیغام سننے کے لیے ریسپونڈ کیا۔ دوسری طرف سے ایک فوجی کپتان بولا: ”مجھے اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال میں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔۔۔“ یہ سنتے ہی پاس کھڑے ایک اعلیٰ۔۔۔ نمبر نے ریسپونڈ کر دیا: ”جیٹا اور آگ گھنگو میں چلا کر کہا: ”کیا مزاحمت مزاحمت لگا رہی ہے۔۔۔“ کتنی دیر میں مارگٹ پر قبضہ کر لو گے؟۔۔۔ چار گھنٹے؟ بکواس، لغو! تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں؟ لاکٹ لائچر ریکال لیں رائفیل، مارٹر؟۔۔۔ تو یہ کس کام کے لیے ہیں؟ انہیں استعمال کرو اور دو گھنٹے کے اندر اندر مارگٹ پر قبضہ کی اطلاع دو۔“

حسب الحکم صبح چار بجے تک یونیورسٹی کی عمارت کو (اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال سمیت) مخر کیا جا چکا تھا، لیکن وہاں سے ٹھوٹنے والا بیگالی قومیت کا نظریہ کافی عرصے تک ناقابلِ تخیل رہا۔۔۔ شاید نظریوں کو مخر کرنا تو پولیو اور ٹیکوں کے بس کی بات نہیں۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے فوج کے مختلف دستوں نے شہر کے دوسرے حصوں میں بھی اپنا کام مکمل کر لیا۔ راجہ باغ میں پولیس کو لوہے کی فیل خانے میں اپنی آڑ کو غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ گلی کو چوں میں دہشت پھیلانے کے لیے ہوا میں گولیاں چلائی گئیں۔ سپاہی صرف ان عمارتوں میں داخل ہوئے جہاں سے گولی چلانے میں سہل کی گئی؛ درودہ سڑکوں اور گلیوں میں پھر حکومت کا اقتدار بحال کرتے رہے۔

۲۶ مارچ کو پوچھتے ہی مختلف دستوں نے اپنا اپنا مشن مکمل کرنے کی رپورٹ دی جنہاں گناہاں جو ساری رات لان میں ہمارے ساتھ بیٹھے رہے تھے اعلیٰ افسر اندر گئے۔ جب تھوڑی دیر بعد وہ رومال سے سینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے باہر نکلے تو برآمدے میں میں کھڑا تھا۔ انہوں نے اوپر اوپر نگاہ دوڑائی اور خود کلامی کے لہجے میں فرمایا: ”آٹھا، کوئی بھی تو نہیں۔۔۔“ میں نے باہر نکل کر نظر ڈالی تو اسی وہاں بنی نوع انسان کا نام و نشان تک نہ تھا، صرف ایک آوارہ گتہ تھا جو دم دہلے شہر کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

دن چڑھے ٹھوٹے کو ہرنل انٹرکانٹینینٹل سے لے کر حفاظت انیر لوٹ پہنچا گیا۔ وہاں انہوں نے دی آئی پی لائونج میں گزشتہ رات کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے ریڈیو پر ارباب سے کہا: ”خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا ہے۔“ اگرچہ پہنچنے پر انہوں نے پھر بھی حلیہ ڈھیرایا۔ جب سٹریمٹویئر پر آمید تبصرہ کر رہے تھے، میں اس وقت یونیورسٹی کمپس میں اُن قبروں کا جائزہ لے رہا تھا جن میں کئی کئی مردے ٹھونس دیے گئے تھے۔ میں نے وہاں پانچ سے پندرہ میٹر قطر کے تین گڑھے دیکھے۔ ان گڑھوں میں پڑی ہوئی مٹی ان خاک کے پتلوں کی بے بسی کا پتہ دے رہی تھی جو بے کفن ان میں دفن تھے۔ میں نے وہاں موجود فوجی افسروں سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد پوچھی لیکن کسی نے سیدھا جواب نہ دیا۔

میں یونیورسٹی کا کچھ لگاتار جوا جگن ناتھ ہال اور اقبال ہال گیا جن کے متعلق میں نے مارشل لا ہیڈ کوارٹر کے برآمدے میں کھڑے کھڑے اندازہ لگایا تھا کہ وہ زمین بوس ہو چکے ہوں گے یہاں اگر دیکھا تو دونوں عمارتیں جنوں کی ٹوں کھڑی تھیں۔ اقبال ہال پر دو آدمی گن ناتھ ہال پر تین راکٹوں کے نشان تھے۔ ان کے بعض کمرے جھلے ہوئے تھے، کہیں کہیں کواڑ جل کر گر چکے تھے، تین جگہوں پر آدھ علی رائفیلوں کے ڈھیر تھے اور ایک آدھ جگہ فالتو کا گندہ مجلس رہے تھے۔ اگرچہ نقصان سنگین تھا، تاہم اتنا نہ تھا جتنا میں نے قیاس کیا تھا۔

غیر ملکی اخباروں نے قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی میں ہزاروں افراد موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ فوجی افسروں نے ہلاک شدگان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ بتائی۔ سرکاری طور پر صرف چالیس اموات کی تصدیق کی گئی۔

## باب ۱۰

# آپریشن سچ لائٹ (۲)

دھاکہ تو ایک رات کی مارکٹائی سے سُن ہو گیا، لیکن صوبے کے باقی حصوں میں حکومت کی حاکمیت بحال کرنے میں خاصی دیر لگی۔ جن علاقوں میں خصوصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، ان میں چٹاگانگ، راجشاہی اور پٹنہ شامل تھے۔

چٹاگانگ میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کی تعداد چھ سو کے لگ بھگ تھی جو ۲۰ بلوچ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ پٹنہ مشرقی پاکستان میں عرصہ ملازمت پورا کرنے کے بعد بحری راستے سے کراچی روانہ ہونے والی تھی۔ اس کا ہراول دستہ پہلے ہی کراچی کرچکا تھا۔ باقی نفری باری کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی کمان انٹیلیجنٹ کرنل فاطمی کے ہاتھ میں تھی جنہیں میجر جنرل خادم راجہ چند روز پہلے یہ ہدایات دے چکے تھے کہ وہ کوسیلہ سے لگ بھگ چٹاگانگ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

چٹاگانگ میں بنگالی نفری پانچ ہزار کے قریب تھی جن میں سے آدھے افراد ایسٹ بنگال سنٹر سے تعلق رکھتے تھے۔ دہرگیڈیئر مجھدار کے تربیت یافتہ تھے۔ فوجی اور سیاسی لحاظ سے ان میں سے اکثر نے اپنی ٹریننگ چند مہینے پہلے مکمل کر لی تھی مگر ریگڈیئر صاحب نے سیاسی فضا بدلتے دیکھ کر انہیں "جہاز کی نایابی" کے بہانے روک لیا تھا۔ ان کے علاوہ چٹاگانگ میں ایک نئی بنگالی پلٹن ۸ ایسٹ بنگال کے نام سے کھڑی کی گئی تھی جس کے سیکنڈ ان کمانڈر یا نائب سالار میجر ضیاء الرحمن تھے۔ نیم فوجی تنظیم ایسٹ پاکستان رائفلز کا سیکرٹری ہڈ کوارٹر اور ایک ونگ بھی یہیں مقیم تھا۔ بنگالی پولیس اور سابق فوجی اور عوامی لیگ کے رضا کار اس کے علاوہ تھے۔

فوجی طاقت کے لحاظ سے چٹاگانگ میں جوڑا بر کار تھا۔ بلحاظ بری دکھائی دیتا تھا کہ پانچ ہزار بنگالی، چھ سو غیر بنگالیوں کو فوراً ہڑپ کر جائیں گے اور یہ اہم بندرگاہ اور شہر باغیوں کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ شروع شروع میں جو خبریں دھاکہ پہنچیں وہ واقعی تشویش کی تھیں، مگر تاثرات یقین تھا کہ ۲۰ بلوچ کی نفری ابھی تک ڈٹی ہوئی ہے، مگر کب تک؟ کیا یہ چند سوپاہی کوسیلہ سے لگ بھگ پہنچنے تک حالات کا مقابلہ کر سکیں گے؟

اُدھر کوسیلہ سے آنے والی ملک کا یہ حال تھا کہ جوئی فوجی دستے کوسیلہ چند میل جنوب میں فینی کے قریب صوبہ پور کے مقام پر پہنچے، باغیوں نے لکڑی کا پل اڑا کر ان کی پیش قدمی روک دی۔ اس طرح چٹاگانگ میں میجر ضیاء الرحمن اور ان کے ساتھیوں کو اتنا وقت

یہ یورٹی سے نکل کر نہیں شہر کے مختلف حصوں میں گیا۔ راستے میں کبھی کسی فٹ پاتھ پر اور کبھی کسی گلی کے موڑ پر مجھے اکاد کا لاش نظر آئی۔ لاشوں کے وہ انہار جن کے قصے میں نے بیرونی اخبارات میں پڑھے، مجھے کیس نظر آئے، تاہم میں نے جو کچھ دیکھا، اس سے مجھے متحکا کرنے لگی اندر لاول بیٹھنے لگا۔ میں اس تجربے کو زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکا اور وہاں سے چل دیا۔

پڑنے شہر کی بعض گلیوں میں اب بھی رکاوٹیں موجود تھیں، مگر ان پر پہرہ دینے والے غائب ہو چکے تھے۔ رات کی فائزنگ سے خوف زدہ ہو کر ہر فرد پلنے گھر میں دب کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے کوئی شخص کیس نظر آیا، البتہ ایک گلی کی کٹڑ پر ایک سایہ سا دکھائی دیا جو کسی پچھری ہوئی روح کی طرح بے قرار تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ساتھ والی گلی میں غائب ہو گیا۔

شہر کا پتھر لگانے کے بعد میں دھان منڈی گیا جہاں عجیب الرحمن کا گھر واقع تھا۔ عجیب کے گھر ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اسے دیکھ کر دشت یاد آ رہا تھا۔ مختلف اشیاء اور اُدھر بکھری پڑی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھر کی بھرپور تلاشی کی گئی ہے۔ اس کباڑ میں کوئی تھالی نہ تھی نظر نہ آئی، البتہ کراہندہ رناتھ نیگور کی قد آدم تصویر اوندھے منہ پڑی فرش چاٹ رہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کمرے دیکھا۔ شیشے کا ڈیم کئی جگہوں سے ٹوٹ چکا تھا، مگر اس کی شبیہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔

مکان کا بیرونی گیٹ بھی اپنی آرائش سے محروم ہو چکا تھا۔ عجیب الرحمن کے غیر قانونی دور حکومت کے دوران سیاہ رنگ کے گیٹ پر پینل کابینا ہوا بنگلہ ویش کا نقشہ نصب کر دیا گیا تھا اور اس کے ارد گرد چھ ستارے بنا کر عوامی لیگ کے چھ نکات کی نمائندگی کی گئی تھی۔ اب گیٹ پر صرف وہ سوراخ نظر آ رہے تھے جہاں یہ آرائشی نقش نصب کیے گئے تھے۔ چند دن کی شان و شوکت آٹا فانا غائب ہو چکی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے وقت میں واپس چھاؤنی چلا آیا۔ یہاں کا ماحول کیسے مختلف تھا۔ فوجی کارروائی سے بہت سے فوجی افسروں کے دل بکے ہو گئے تھے۔ فضا کا جو محل پن غائب ہو چکا تھا۔ آفیسرز میں بھی پہلی گفتگو میں اطمینان اور سکون کی لہر بہہ تھی۔ کیپٹن چودھری نے کیڑو چھیٹے ہوئے کہا: "بنگلہ لیوں کو خوب سبق سکھایا گیا ہے۔ کم از کم ایک لٹل تک تو سر نہیں اٹھائیں گے۔" میجر ملک نے گروہ لگائی، "جی ہاں، ان کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔"

سلطہ یہ وہی میجر ضیاء الرحمن ہیں جنہوں نے چند روز بعد پاکستانی فوج کے خلاف عملیات دہاکا اور چٹاگانگ ریڈیو سٹیشن (ملائیشیہ) سے بنگلہ دیش کی آنادی کا اعلان کیا۔ اگست ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمن اور ان کے اہل خانہ قتل کر کے بنگلہ دیش کا اقتدار سنبھالا۔ وہ اب اس کے صدر ہیں۔



مل گیا کہ وہ عدوی بڑی سے فائدہ اٹھا سکیں، چنانچہ انہوں نے شہر اور چھاؤنی کے کئی حصوں پر قبضہ جمایا۔ چٹاگانگ ریڈیو سٹیشن کو بیچ گیا کیونکہ وہاں پاکستانی سپاہی مقیم تھے لیکن چٹاگانگ/کپتان ریڈیو ٹرانسمیٹر زنجبیاں ایسے حفاظتی اختیارات نہ تھے، ہانپل کے زیر اثر پہلے گئے۔ ان ٹرانسمیٹروں کے احاطے میں ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی جس میں ایسے آلات نصب تھے جن کی مدد سے ایمری نشریات شروع کی جاسکتی تھیں۔ وہیں سے میرضیا، الزکمن نے بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کیا۔

۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات کو ڈھاکہ میں میجر جنرل خادم حسین راجہ کو اطلاع ملی کہ کوسیلا سے روانہ ہونے والے فوجی دستے پل ٹوٹنے کی وجہ سے فینی کے قریب رگ گئے ہیں۔ انہوں نے کوسیلا کے ریگیڈ کمانڈر ریگیڈیئر اقبال شیخ کو ٹیلیفون پر حکم دیا کہ وہ مذکورہ پل کو باغیوں کے قبضے میں رہنے دیں اور خود نالہ پارک کے آگے بڑھ جائیں۔ ریگیڈیئر اقبال شیخ کے لیے سسٹم کے ساتھ کوسیلا سے ہٹ کر نالہ کے پار کیے جائیں، کیونکہ اسی صورت حال سے پٹنہ کا پہلے سے کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا، چنانچہ انہوں نے پل پر دوبارہ قبضہ کرنے پر اپنی توخیم کو زرخیز اور اگلی صبح دس بجے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

ریگیڈیئر اقبال شیخ فوجی دستوں کو لے کر چٹاگانگ کی طرف بڑھنے لگے جہاں ان کی اشد ضرورت تھی، مگر شہر سے بس کلومیٹر دور کوسیلا کے مقام پر باغیوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ فوجی دستے کے ہارل گروہ میں سے گیارہ افراد جہاں میں پٹنہ کے کمانڈنگ افسر بھی شامل تھے، شہید ہو گئے۔ اس اچانک افتادے ایسی جگہ پر چلے کہ اس دستے کا کوسیلا اور ڈھاکہ سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ جی۔ اوسی ڈھاکہ میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اس دستے کا کیا بنا ہے؟ کیا وہ سارے کے سارے شہید ہو گئے ہیں؟ اگر کچھ بچے ہیں، تو وہ کہاں ہیں؟ اس کمک کی ناکامی سے چٹاگانگ کی صورت حال اور بھی بگڑنے کا امکان تھا، کیا پتہ کس وقت وہاں چند سو پاکستانی سپاہی باغیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بن جائیں؟

جنرل راجہ جب گمشدہ فوجی دستے سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر براہ صلت رابطہ قائم نہ کر سکے، تو فیملی کا پہلے کر خود اسے تلاش کرنے نکلے۔ پہلے وہ چٹاگانگ گئے تاکہ کرنل فاطمی سے وہاں کی صورت حال معلوم کر سکیں۔ جو جہاں ان کا پہلے ۲۰ بلوچ میں اترنے کے لیے نیچے آیا، چٹاگانگ کی بہت قامت پہاڑیوں سے اچانک اس پر فائرنگ ہوئی۔ دو گولیاں ہیملی کا پیر کو لگیں، مگر زیادہ نقصان نہ ہوا۔ جنرل راجہ بخفاخت ۲۰ بلوچ میں اتر گئے۔ وہاں کرنل فاطمی نے انہیں بتایا کہ ان کی پٹنہ نے باغیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے، پچاس کو ہلاک اور کوئی پانچ سو افراد قیدی بنالیا ہے جس سے ایسٹ بنگال سٹریٹ فورسز محفوظ ہو گیا ہے، البتہ شہر اور چھاؤنی کے کئی حصوں پر باغی قابض ہیں۔

جنرل راجہ نے فیصلہ کیا کہ وہ چٹاگانگ سے کوسیلا کی طرف سڑک کے اوپر پرواز کریں گے تاکہ راستے میں جہاں کہیں فوجی دستہ نظر آئے وہاں اتر جائیں جب وہ چٹاگانگ سے چلنے لگے تو ایک ستم رسیدہ خاتون جس کی گود میں بچہ تھا، ان کے پاس آئی اور چٹاگانگ سے نکلنے کے لیے ان کی مدد مانگنے لگی۔ یہ خاتون مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک افسر کی بیوی تھی اور ہنگاموں میں کارواں سے جدا ہو گئی تھی جنرل صاحب نے اسے ہیملی کا پیر میں بٹھالیا۔

ہیملی کا پیر میجر لیاقت بھاری آزار ہے تھے جو اپنی بہادری اور پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے تمام حلقوں میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے پائلٹ میجر پیٹر تھے جو اپنے کام میں بہت طاق تھے۔ یہ دونوں ہوا باز، جنرل خادم راجہ بے بس خاتون اور اس کے بچے کو لے کر بحیرہ ریت چٹاگانگ سے نکل آئے۔ ہیملی کا پیر کوسیلا کی طرف سڑک کے ساتھ ساتھ پرواز کرنے لگا

اور جنرل راجہ ایک چھوٹا سا فوجی نقشہ اپنے گھٹنوں پر پھیلائے اندازہ لگاتے رہے کہ گمشدہ فوجی دستہ اس وقت کہاں ہوگا۔ انہوں نے متوقع جگہ کے قریب پہنچ کر باہر جھانکا، مگر پچھلے بادلوں کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا، تو بھریا قیامت بھاری سے کہا کہ وہ بادلوں کے نیچے جائیں تاکہ سڑک نظر آ سکے بھاری نے فوراً ٹیلیفون کی، مگر وہ جہاں نیچے گئے کو ٹیلیفون کی ایک ہوجھاڑ ہوئی۔ پائلٹ نے جلی تحریک پر فوراً ہیملی کا پیر اوپر اٹھایا ایک گولی ہیملی کا پیر کے پچھلے حصے میں لگی اور دوسری ایندھن کی ٹینکی سے چند انچ دور لمبے کی چادر کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے پاس ہی وہ عورت اپنے بچے سمیت بیٹھی تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے کچھ کی میجر بھاری نے جنرل راجہ سے پوچھا، سڑک کیا ایک اور کوشش کروں؟ انہوں نے فرمایا، نہیں اب سیدھے ڈھاکہ چلو۔

اسی اثنا میں میجر جنرل میٹھ نے جوائینٹل سروس گروپ (کمانڈوز) کے مارا استعمال کی شہرت رکھتے تھے، ڈھاکہ سے ۳۰ کمانڈو بائین کا ایک دستہ فضا میں راستے سے چٹاگانگ بھیجا تاکہ وہ زمینی راستے سے ریگیڈیئر اقبال شیخ کے ساتھ رابطہ قائم کر سکے۔ یہ دستہ بحیرہ ریت چٹاگانگ پہنچ گیا، لیکن اسے کچھ علم نہ تھا کہ ریگیڈیئر اقبال شیخ کہاں ہیں اور ان تک پہنچنے کے لیے کوئی راستہ مناسب ہے؟ اتنے میں پتہ نہیں کہاں سے ایک بنگالی افسر آگے بڑھا۔ اس نے پاکستانی دستے کے کمانڈنگ آفیسر سے کہا: میں کمپین حمید ہوں مری میں ہوتا ہوں۔ چٹاگانگ میں اپنے والدین کی خبر لینے آیا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی رہنمائی کے لیے تیار ہوں۔ اس کی پیش کش کو فوراً قبول کر لیا گیا اور یہ فوجی دستہ کمپین حمید کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے چٹاگانگ/کوسیلا کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہر سے باہر سڑک کے دونوں جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ جب وہ ان پہاڑیوں کے درمیان پہنچے، تو اچانک دونوں جانب سے ان پر گولیاں برسنے لگیں۔ چھاپہ مار دستے نے پٹنہ کی بہت گوشش کی، لیکن بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ تیرہ افراد ہلاک ہو گئے جن میں ایک کمانڈنگ آفیسر، دو فوجی افسر، ایک جے سی او اور نو سپاہی شامل تھے۔

اس دستے کے علاوہ ۲۰ بلوچ کا ایک گروہ بھی اسی شہر پر روانہ کیا گیا، مگر یہ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ جب کرنل فاطمی سے اس ناکامی کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہہ دیا کہ راستے میں باغیوں کی طرف سے شدید مدافعت تھی۔ گویا یہ دونوں کوششیں ناکام ہو گئیں۔

ادھر ریگیڈیئر اقبال شیخ پیش قدمی کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے کوسیلا کے مقام پر تعطل کے دوران کوسیلا سے چھوٹی توپوں کی ایک بیٹری منگوائی۔ یہ توپیں ان کے پاس ۲۶ مارچ کی شام کو پہنچیں اور اگلی صبح باغیوں پر حملہ کر کے مدافعت توڑ دی گئی۔ چٹاگانگ شہر کی طرف پیش قدمی کے لیے راستہ کھول لیا گیا۔

راستے میں اس تاخیر کے دوران چٹاگانگ شہر میں حاجی کیپ کے قریب اصفہانی جوٹ ملز کی کالونی پر قیامت گر گئی۔ وہاں باغیوں نے بے یار و مددگار مردوں، عورتوں اور بچوں کو کلب کی عمارت میں جمن کر کے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس سفاکانہ قتل کے چند روز بعد میں اس عمارت میں گیا۔ اس کے فرش اور دیواروں کے پچھلے حصے پر خون جی خون تھا۔ عورتوں کے لباس اور بچوں کے کھلونے خون سے تر تھے۔ ساتھ والی رہائشی عمارت میں بستر کی چادریں اور گدے خون خشک ہوئے کی وجہ سے اکڑ گئے تھے۔

۲۹ مارچ کو ریگیڈیئر اقبال شیخ اور چٹاگانگ کے دستوں میں غلاب کی خبر ملی۔ ڈھاکہ کے آپریشن روم میں منظر فوجی افسروں کی جان میں جان آئی، مگر اتنے میں اصفہانی کالونی کے بے گناہ ماسی اپنی جان پر کھیل چکے تھے۔

اب تک چٹاگانگ میں قابل ذکر کامیابی صرف ایک بحری جہاز سے سامان اتروانے تک محدود تھی۔ یہ جہاز وسط مارچ میں

مغربی پاکستان سے دفاعی سامان لے کر پہنچا تھا، لیکن عوامی لیگ کے کارکنوں نے اس سے سامان اتارنے کی اجازت نہ دی تھی کیونکہ۔ بقول ان کے۔ اس کی مدد سے ہمارے کرورنگاریوں کی آواز کو دبانا مقصود تھا۔ عجیب الزحمت کے پچیس روزہ دورہ اقتدار میں فوجی انتظامیہ نے زبردستی سامان اتارنے کی کوشش نہ کی؛ البتہ جب پالیسی بدلی تو لاگ ایریا کا نڈر ریگیمیئر اہم ایچ۔ انصاری کو فضائی راستے، ڈھاکہ سے چٹاگانگ پہنچایا گیا۔ انہوں نے چٹاگانگ میں موجود سائل جن میں پیادہ فوج کی ایک پلٹن، چند کبکی توپیں اور دو ٹینک شامل تھے، جمع کر کے ایک ٹاسک فورس (TASK FORCE) ترتیب دی۔ بحریہ نے ایک تباہ کن جہاز (DESTROYER) اور چند گن بوٹ (GUN BOATS) مہیا کیں۔ ان کی مدد سے ریگیمیئر انصاری نے نازک مسئلے کو حل کر دیا بعد ازاں ایک اور پلٹن ڈھاکہ سے چٹاگانگ پہنچ گئی اور ریگیمیئر انصاری کے وسائل بہتر ہو گئے۔

اگرچہ وسائل کے اعتبار سے حالت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی، مگر چٹاگانگ کو باغیوں سے پاک کرنے کا مرحلہ ابھی باقی تھا باغیوں کا زیادہ تر اجتماع ایٹ پاکستان رائل فلو کے سیکٹر ہیڈ کوارٹر ضلع کچہری میں ریزرو پولیس لائنز اور کپتی ریزرو ٹرینسپورٹ بنگلہ میں تھا۔ سب سے پہلے جبریل منٹھ نے ٹرانسپورٹ کی عمارت سے باغیوں کو نکالنے کے لیے ایس ایس جی (کمانڈوز) کا ایک دستہ روانہ کیا۔ اس دستے نے اپنے حریف تک پہنچنے کے لیے دیہاتی راستہ اختیار کیا تاکہ ایک پہلو سے انہیں حملہ کیا جائے، لیکن ابھی وہ کشتیوں ہی میں تھے کہ ان پر فائر کھل گیا۔ وہ نہ بھاگ سکتے تھے اور نہ ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے تھے۔ سولہ افراد موقع ہی پر ہلاک ہو گئے۔

ادھر ۲۰ بلوچ کا ایک اور دستہ لیفٹیننٹ کرنل فاطمی کی قیادت میں ٹرانسپورٹ بنگلہ کی طرف روانہ کیا گیا، لیکن یہ اپنے ٹارگٹ، ٹیک نہ پہنچ سکا، کیونکہ سب معمول کرنل فاطمی راستے ہی میں باغی افراد سے الجھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ آخر کار پاکستان آئیر فورس کے دو سیمر طیاروں (ایف۔ ۷۹) نے کام چمکایا۔ انہوں نے بھرپور فضائی حملہ کر کے باغیوں کو وہاں سے بھاگایا۔ چند روز بعد وہاں گیا، ٹرانسپورٹ بنگلہ کے ارد گرد مضبوط دفاعی لائن میں جا جا خندقیں کھدی تھیں۔ ان خندقوں کو گہری نالیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیا گیا تھا۔ سارا دفاعی انتظام نہایت پیشہ ورانہ مہارت سے مکمل کیا گیا تھا۔ ہوائی حملے سے ٹرانسپورٹ تباہ ہوئے تھے نہ عمارت منہدم ہوئی تھی؛ البتہ گولیوں کے چند نشان ابھی تک گواہی دے رہے تھے کہ یہ عمارت تازہ تازہ کی امتحان سے گزری ہے۔

دوسرا اہم ٹارگٹ ایٹ پاکستان رائل فلو کا سیکٹر ہیڈ کوارٹر تھا جہاں ایک ہزار مسلح باغیوں نے حصار بنا رکھا تھا۔ ان کے مورچے جو بلند جگہ پر واقع تھے پشٹونوں کے ساتھ ساتھ بنائے گئے تھے۔ بلکہ ہتھیاروں سے نازک کرنے کے لیے ان پشٹونوں میں ضروری سوناخ اور درزی بھی رکھی گئی تھیں۔ پاکستانی سپاہیوں کو ان دفاعی انتظامات کا پہلے سے علم تھا؛ چنانچہ انہوں نے ایک پوری پلٹن (تقریباً چھ سو افراد)، دو ٹینکوں اور ایک توپ سے ان پر حملہ کیا۔ ساحل کے پاس سے نیوی کے ایک جہاز (DESTROYER) اور دو گن بوٹیں (GUN BOATS) نے ان کی مدد کی۔ لڑائی کوئی یمن گھنٹے جاری رہی۔ بالآخر سرکش بنگالی مورچے چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ان میں سے کئی ہلاک ہو گئے۔ یہ فتح آپریشن سرچ لاسٹ کے چھپے دن یعنی ۱۳ مارچ کو نصیب ہوئی۔

اس کے بعد ریزرو پولیس لائن کی باری تھی۔ اطلاعات کے مطابق یہاں پولیس، سابق فوجی، عوامی لیگ کے رضا کار اور دیگر سرکش عناصر جمع تھے جن کے پاس ایک اندازے کے مطابق بیس ہزار انٹلیجنس تھیں۔ یہاں بھی پاکستان آرمی کی ایک پلٹن نے حملہ کیا، مگر مداخلت کر دینا چاہی اور وہ ابتدائی کارروائی ہی میں مورچے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

ان مقامات پر مزاحمت کو فرو کرنے میں ریگیمیئر انصاری نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں کچھ عرصے بعد ہلال جرأت کا اعزاز اور میر جبریل کا عنہ عطا کیا گیا۔ (قبل ازیں وہ اس ترقی سے محروم رہ گئے تھے)۔

مارچ کے آخر تک چٹاگانگ میں اہم فوجی کارروائیاں ختم ہو گئیں، مگر اکاؤنٹا جبریل میں چٹاگانگ شہر اور چھاؤنی پر مکمل قبضہ ۶ اپریل کے لگ بھگ بحال ہوا۔

دیگر دو قصبے جہاں باغیوں کو ابتدائی دور میں برتری حاصل تھی، کشتیا اور پربت تھے۔ آئیے ذرا ان مقامات کا حال بھی دیکھتے چلیں؛ کشتیا، جیسو سے شمال مغرب میں نوے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جو کئی سڑکوں اور ریلوے لائن کا سنگم ہے۔ یہاں عام حالات میں پاکستانی فوج قیام نہ تھی، مگر فوجی کارروائی کے پیش نظر جیسو سے ایک کمپنی (تقریباً ۲۵۰ سپاہی) کشتیا بھی گئی تاکہ وہاں اپنی موجودگی کا متاثر قائم کرے۔ یہ کمپنی اپنے ساتھ صرف چھوٹے ہتھیار اور محدود تعداد میں ایمنیشن لے گئی، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہاں اندرونی فوجی لائن بحال کرنے کے لیے بحاری ہتھیاروں اور وافر ایمنیشن کی ضرورت نہیں اس متاثر کی بڑی وجہ تھی کہ اسے مکمل معلومات فراہم کیے بغیر فوراً جیسو سے روانہ کر دیا گیا تھا۔

کمپنی کمانڈر نے اپنی کمپنی کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے اسٹیلین، کیمپنج، دی ایچ ایف، الیف، الیف ٹینشن اور دیگر اہم مقامات پر لگا دیا۔ چند چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کو عوامی لیگ کے مقامی قائدین کو گرفتار کرنے کے لیے بھیج دیا۔ قائدین تو ہاتھ نہ آئے، البتہ پہلے روز ہی ایک جہڑپ میں باغی باغیوں کو ٹھکانے لگا کر انہیں موجودگی کا سکہ بنادیا۔ اس کے بعد صرف کوئی نو فائر کرنا تھا جس میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اگلے دو روز بھی ان دامان سے گزر گئے۔

۲۸ مارچ کو ساڑھے نو بجے رات مقامی سپرٹنڈنٹ پولیس، کمپنی کمانڈر شعیب کے پاس کیا خوف کے مارے اس کا رنگ زرد تھا۔ اس نے پوچھتے ہوئے بتایا کہ کشتیا سے کوئی سولہ کلومیٹر دور چھاؤنی کے سرحدی قصبے میں بہت سے باغی جمع ہیں اور وہ مکملی دے رہے ہیں کہ جس کسی نے پاکستانی فوج سے تعاون کیا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ایس پی نے یہ اطلاع بھی دی کہ وہ کسی وقت واپس کشتیا پر بلہول دیں گے۔ میر شعیب نے اپنی تمام پلانوں کو چوکس رہنے کی ہدایت بھیج دی، مگر سپاہیوں نے کسی غیر معمولی حفاظتی اقدام کی ضرورت محسوس نہ کی۔ آخر بنگالی ہی تو ہیں شالے، پٹیل میں گے ان سے۔

رات کے پچھلے پیر کو اپنی چاندی کے کشتیا پر گولے برسنے لگے۔ یہ فرسٹ ایٹ بنگال (ای بی) کا حملہ تھا جسے اپنے تمام ہتھیاروں سمیت جیسو چھاؤنی سے 'ٹریفک' کے سہارے باہر بھیجا گیا تھا تاکہ چھاؤنی میں مزاحمت کا باعث نہ بنے۔ ای بی کی کے ساتھ بحاری کیوریٹی فورس (ایس۔ ایف) کے سپاہی بھی مل گئے۔ (بعد میں پاکستانی فوج نے بی ایس ایف کے چار سپاہی جیسو کے باہر گرفتار کر لیے تھے)۔ حملہ کا ہدف وہ اسلحہ خانہ تھا جسے تین روز پہلے پاکستانی سپاہیوں نے پولیس سے چھین کر اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس اسلحہ خانے سے ملنے ایک بیج کا سرسبز نمکدان تھا۔ باغی اس مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں سے اسلحہ خانے میں گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ ہمارے سپاہی اسی عمارت میں پڑے رہے کیونکہ باہر نکلنے سے زیادہ نقصان اٹھانے کا خطرہ تھا۔ جب سورج طلوع ہوا

۱۔ VERY HIGH FREQUENCY وائیں ٹینشن جو زیادہ فاصلے تک مواصلاتی رابطے کا کام دیتا ہے۔

۲۔ یہ بحاری بارڈر پولیس یا دیگر کی طرح نیم فوجی تنظیم ہے، مگر فوجی لوازمات سنبھالنے کے لیے ابھی بھی جاتی ہے۔

تو ہمارے پانچ سپاہی صحن میں شہید پڑے تھے۔ نو بجے تک شہیدوں کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ آئندہ نصف گھنٹے میں مزید نو افراد کا کام آئے پلاٹوں میں سے صرف چند سپاہی جان بچا کر کمپنی ہیڈ کوارٹر پہنچ سکے۔ اس تباہی کی دو بڑی وجوہ تھیں — ایک ایمنوٹیشن کی کمی اور دوسرے حفاظتی اقدامات سے لاپرواہی۔

ہماری دوسری دو چوکیاں ٹیلیفون کچھنچ اور دی ایچ۔ ایف اسٹیشن میں واقع تھیں۔ ان پر بھی ایک وقت آناشدید حملہ ہوا کہ اجڑائی قریب کے باوجود ایک چوکی دوسری چوکی کی مدد کو نہ پہنچ سکی — خود کمپنی ہیڈ کوارٹر مژدہ خانے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہاں گیارہ فوجی ایک جگہ ہلاک پڑے تھے اور چودہ دوسری جگہ۔ وہاں ساتھ افراد میں سے بچائیں شہید ہو چکے تھے۔ اس تباہی کے پیش نظر جیسور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں فوری مدد کے لیے پیغام بھیجا گیا اور بلاتاخریہ فضا نیہ کی امداد پر زور دیا گیا۔ بار بار پیغامات کے جواب میں یہ یلوس کی جواب موصول ہوا: فوجی ملک خارج از امکان ہے، کیونکہ ساری نفری پہلے ہی کسی نہ کسی کارٹریں میں مصروف ہے اور فضا نیہ مدد کو مگر غزالی کی وجہ سے ممکن نہیں۔ . . . خدا حافظ!

میر شعیب نے اپنی کمپنی کے تشریح سپاہیوں کو جمع کیا۔ تیرہ ہلاک و ڈیڑھ سو افراد میں سے صرف ۶۵ زندہ بچے ہیں۔ انہوں نے فوراً کشتیا چھوڑ کر جیسور جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سفر کے لیے ایک بڑا ٹرک، ایک ڈائج اور چھ جیپیں اکٹھی کیں۔ دو آگئی رات کی تاریکی میں ہوئی۔ سب سے آگلی جیپ میں میر شعیب خود سوار تھے کشتیا سے چوبیس بجیں کلومیٹر دور آجائیک میر شعیب کی جیپ کی ٹرک پر چلتی چلتی ایک کھائی میں ڈھنسن گئی جہاں باغیوں نے ٹرک کاٹ کر اوپر سے ڈھانپ دی تھی۔ جو بھی قافلہ رکھا، ٹرک کے دوڑوں جانب سے گولیاں برسے گئیں۔ پاکستانی سپاہی گولیوں کی دھچکا میں ٹرکوں سے دوڑ کر آؤ لینے کے لیے بھاگے، مگر میر شعیب سمیت ان میں سے اکثر وہیں شہید ہو گئے۔ صرف نو افراد رینگ رینگ کر زندہ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں سے بھی بعض راستے میں پکڑے گئے اور باغیوں اور دیہاتیوں نے مل کر انہیں ذلیل و خوار کیا۔ ننگا بازاروں میں چلویا اور طرح طرح کی اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا۔

اب مختصر پینہ کا حال بھی سنی لیجیے۔ پینہ کے قریب راجشاہی میں ہماری ۲۵ پنجاب متین تھی۔ اس کی ایک کمپنی روٹی سوساؤنڈ، اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے "پنہ روانہ کی گئی۔ کمپنی بھی کشتیا والی کمپنی کی طرح، صرف امن و امان برقرار رکھنے کے لیے آئی اور اپنے ساتھ چھوٹے ہتھیار، تھوڑا سا ایمنوٹیشن اور تین دن کا راشن لائی یہاں بھی کمپنی کا انداز نے زیر کار سپاہیوں کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر اہم تصبیات مثلاً بجلی گھر اور ٹیلیفون کچھنچ وغیرہ پر متین کر دیا۔ چند سپاہیوں کو سیاسی لیڈروں کے گھر بھیجا گیا، مگر وہ پہلے ہی وہاں سے فرار ہو چکے تھے۔ پہلے دن پاکستانی سپاہیوں نے کسی مزاحمت کے بغیر پینہ میں ڈیرہ ڈال لیا۔ آئندہ ۳۶ گھنٹے بھی بھجرو عافیت گزر گئے، مگر ۲۷ مارچ کو سورج ڈوبتے ہی نالے کے پار سے گولیاں چلنے لگیں۔ یہ فائر کرنے والے ایسٹ پاکستان رائفلرز کے نو سو باقی تھے جن کے ساتھ چالیس چالیس آدمی پولیس اور عوامی لیگ کے تھے۔ انہیں ہماری گل تعداد کا علم نہ تھا؛ چنانچہ وہ دُور دُور سے فائر کرتے رہے۔ ہمارے فوجی بھی وقتاً فوقتاً جوابی فائر کرتے، مگر ذرا کجیسی سے کیونکہ انہیں ایمنوٹیشن کی کمی کا احساس تھا۔ اس ابتدائی جھڑپ میں ہمارا ایک نام کیشتیا آفیسر (N.C.O) اور دو سپاہی زخمی ہو گئے۔

باغیوں کی ایک بجلی مشین گن (ایم جی) مسلسل فائر کر رہی تھی۔ کمپنی اصرار سے سوچا کہ جب تک اسے خاموش نہ کیا گیا، کھوکھ کا سانس بن مشکل ہوگا؛ چنانچہ چند جہاں شمارتے لیے اور آہستہ آہستہ اس ایل ایم جی پوزیشن کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جب

وہ اپنے ٹارگٹ کے قریب پہنچا تو اس نے ایک دہائی بم بھیک کا جو ٹھیک نشانے پر لگا، بجلی مشین گن تباہ ہوئی، مگر قبل اس کے کہ کمپنی اصرار لگی کارروائی کرتا دشمن کی ایک اور مشین گن نے اس پر گولیوں کی دھچکا کر دی۔ وہ سخت زخمی ہوا، مگر اڑتیا ہوا دشمن سے اوجھل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اوٹ میں جاتے ہی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ کمپنی اصرار کے بعد ٹیلیفون شہید نے چند ساتھیوں سمیت اسی دشمن پر حملہ کر دیا اور نہایت شجاعت سے اپنی جان، جہاں آفریں کے حوالے کر دی۔

اس آٹنا میں بجلی گھر اور ٹیلیفون کچھنچ سے بھی سپاہی واپس بلا لیے گئے تاکہ انہیں بجلی کے مقابلے کے لیے از سر نو منظم کیا جائے۔ اوجھل باغیوں نے بھی اس وقفے کے دوران اپنے آپ کو منظم کر کے ایک بھر پور حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہیوں اور افسروں کو اس احساس ہوا کہ صرف چھوٹے ہتھیار اور محدود ایمنوٹیشن لانے کا نقصان کیا ہے؛ انہیں اس کوتاہی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس جھڑپ میں ہمارے دو افسر تین جوئیہ کیشتیا افسر اور ساتھی سپاہی شہید ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایک افسر اور تیس سپاہی زخمی ہوئے۔

مدد کے لیے بار بار راجشاہی پیغام بھیجا گیا۔ بالآخر غزنیوں کو اٹھانے کے لیے ایک سیلی کا پٹر آیا، مگر اترنے کے لیے محفوظ جگہ نہ پا کر واپس چلا گیا؛ البتہ راجشاہی سے مقرر اسلحہ سپاہیوں کی کمک لے کر پہنچ گئے۔ وہ اپنے ساتھ ایک ریکالٹ لیس رائفل ایک مشین گن اور کچھ ایمنوٹیشن لائے، بچے کچھ سپاہیوں کو باغیوں کے زخمیوں سے نکالا۔ زخمیوں کو ڈان میں ڈال کر کچے راستے سے راجشاہی روانہ کیا تاکہ زیادہ مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے، اور خود وہاں پہنچنے کے لیے سڑک کا راستہ منتخب کیا تاکہ راستے میں باغیوں کا سامنا ہو، تو ان سے بچا جاسکے۔

پینہ/راجشاہی روڈ پر مقرر اسلحہ کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اسے فزور کر کے اڑھنے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی، چنانچہ اپنے ساتھیوں سمیت ٹرک چھوڑ کر دیہاتی راستوں سے راجشاہی کی طرف پیدل چلنا شروع کیا، جس گاؤں میں باغیوں کا سامنا کرنا پڑتا وہاں سے دوسرے راستے پر بولے، بالآخر جب وہ ٹھوکے پیاسے خاک چھاتے اور باغیوں سے نپٹتے تھے اپرل کو راجشاہی پہنچے، تو ان میں سے صرف ۱۸ آدمی زندہ تھے، مگر اسلحہ سمیت باقی سارے راستے میں شہید ہو چکے تھے۔

یہ تھی چٹاگانگ کشتیا اور پینہ کی مختصر روداد جہاں ہمیں شدید مزاحمت اور بھاری نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ ان شہروں پر بالترتیب چھ اپریل، سولہ اپریل اور دس اپریل کو حکومت پاکستان کا اقتدار بحال کیا گیا، اس کے علاوہ بعض دوسرے مقامات پر بھی مزاحمت ہوئی، مگر اسے زیادہ جانی نقصان کے بغیر فرو کر لیا گیا۔

اس سلسلے کے المناک ترین پہلو یہ ہے کہ باغیوں نے نہ صرف پاکستانی فوجیوں کو بے دردی سے قتل کیا، بلکہ ان کے بال بچوں کو بھی سفاک زبردستی لوٹ لیا۔ اس کتاب میں ان کی بربریت کے سارے قصے رقم کرنا ممکن نہیں۔ صرف ایک واقعہ نمونے کے طور پر درج کرتا ہوں:

۲ ایسٹ بنگال، ڈھاکہ کے شمال میں جو دیپ پور کے مقام پر تھی۔ اس میں ساری نفری بنگالی تھی؛ البتہ چند افسر بے سی او اور

۱۔ یہ وہی پینہ ہے جس کی تقریب پر کشتیا فروری ۱۹۷۱ء میں منعقد ہوئی تھی اور ٹیلیفون جنرل دمی القریں نے بنگالی سپاہیوں کو وقت مروت کرنی دیا، انہوں نے ایمنوٹیشن کی قیادت پر جھڑپ کرنے کی تلقین کی تھی۔

این سی اور جن کا تعلق میکینیکل شعبوں سے تھا، مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے، گران کی تعداد آٹھ میں ایک کے برابر تھی ان میں سے اکثر نے اپنی ملازمت کا بیشتر حصہ اسی پلٹن میں گزارا تھا اور وہ اپنے آپ کو اسی کنبے کے افراد سمجھتے تھے۔ ۲۵ مارچ کی کارروائی کے پیش نظر جس طرح فرسٹ ایسٹ بنگال کورنگ کے بہانے عبور چھاؤنی سے باہر بھیجا گیا تھا اسی طرح سیکنڈ ایسٹ بنگال کو بھی جو دیپ پور سے شمال کی طرف روانہ کیا گیا تاکہ وہ ڈھاکہ سے دور رہے۔ اس پلٹن کی ایک ایک کمپنی غازی پور تکمیل لبریننگ میں تھی، البتہ چوتھی کمپنی پیچھے ایک پرانے محل میں واقع ہند کوارٹر میں رہی۔

اس پلٹن نے دوسری بنگالی پلٹنوں سے مواصلاتی رابطہ قائم کرنے کے بعد ۲ مارچ کو بغاوت کر دی۔ بغاوت کے بعد بھلا گام یہ کیا کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے تمام افراد اور ان کے اہل خاندان کو قتل کر دیا؛ البتہ صوبیدار ایوب جو دیپ پور سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، وہ بھاگا بھاگا ڈھاکہ پہنچا اور اس بربریت کی داستان سنائی۔ دہشت کے مارے اس کے ہونٹوں پر پٹریاں لگی ہوئی تھیں اور ہونٹوں کے کناروں پر سفید چھاک کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ہر کسی نے اسے قتل دینے اور چائے پلانے کی کوشش کی، مگر اس نے کسی کی نہ مٹی اور جلد از جلد مدد کی ضرورت پر زور دیا۔

ڈھاکہ چھاؤنی سے پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی فوراً جو دیپ پور روانہ ہو گئی۔ ہند کوارٹر کے چند فوجیوں اور افسر رضا کا رازہ طور پر ساتھ ہو لیے۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو بمالین کا سارا علاقہ قتل میں بدل چکا تھا۔ گندگی کے ایک ڈھیر پر پانچ پتھے ذبح ہوئے پڑے تھے۔ ان کے پیٹ سنگینوں سے چاک کیے گئے تھے۔ ان کی ماؤں کی سرخ شدہ لاشیں ایک دوسرے ڈھیر پر ادھج پڑی تھیں جو بیدار ایوب ان میں اپنے کنبے کے افراد کو پہچان کر چلا اٹھا اور انسانی صدے سے دفاعی توازن کو بٹھا۔

محل کے صحن میں ایک فوجی جیپ کھڑی تھی جس میں وارٹیس سیٹ نصب تھا۔ جیپ کے تاروں سے ہوا نکل چکی تھی اور جیپ کے اندر مغربی پاکستان کا ایک این سی او (میکینیکل) ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ اس کے خون کے چھینے اس کے وارٹیس سیٹ پر بھی پڑے ہوئے تھے۔ عمارت کے اندر بھی مظہر زیادہ مختلف نہ تھا۔ وہاں ایک محل خانے میں چند خون آلود کپڑے ملے جو (بعد کی تفتیش کے مطابق) گوجر اولالہ کے کمپن ریاض کے تھے۔ سپاہیوں کے رہائشی کوارٹروں میں ایک فوجی عورت بیٹھے کپڑوں سمیت مردہ پڑی تھی اور اس کا شیر خوار بچہ اس کی چھاتیوں سے لپٹ کر رہا تھا۔ ایک اور کوارٹر میں چار سالہ بچی کھڑی تھی۔ وہ فوجیوں کو دیکھتے ہی چلا اٹھی، مجھے زمارو، مجھے زمارو، میرے ابو کو کالینے دو۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے ابواب کبھی نہیں آئیں گے۔

چند ماہ بعد چیف آف آرمی سٹاف جنرل عبدالحمید نے مجھ سے ڈھاکہ ایئر پورٹ کے دی آئی پی لاؤنج میں باتیں کرتے ہوئے اس تمام قتل و غارت کی ذمہ داری لفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب پر عائد کی اور کہا، یعقوب نے مارچ کے آغاز میں مغربی پاکستان سے فوجیوں کی آمد کی مخالفت کی تھی۔ اگر انہوں نے ہمیں بروقت فوجی طاقت میں اضافہ کرنے دیا ہوتا، تو ماہرے شہر وں اڈھوں میں ہمارے جوان موجود ہوتے اور اس وحشیانہ قتل و غارت کی نوبت نہ آتی۔ میں یہ دلیل سن کر خاموش ہو رہا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جنرل یعقوب نے کم مارچ کو فوجیوں کی آمد کس بنا پر روکی تھی۔

کچھ قتل و غارت کے بعد اور کہیں اس کے بغیر پاکستانی فوج نے چند بڑے بڑے شہروں کو باغیوں کے زرخ سے نکال لیا۔ اس کے بعد مضامین کی طرف توجہ دی گئی اور مختلف فوجی دستے مختلف اطراف میں روانہ کیے گئے۔ ایک دستے کے ساتھ

مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا جس کا انھوں دیکھا حال میں آپ کو سنا تا ہوں۔ اس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ان دہشتوں نے اپنا کام کیسے انجام دیا۔ اس ایک واقعے کو تمام واقعات کا نمونہ قرار نہیں دیا جاسکتا، مگر اس سے طریق کار اور ذہنی رویے کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے۔

یہ فوجی دستہ ایک پلٹن (چھ سو افراد کے قریب) پر مشتمل تھا جس کی دو کمپنیاں ٹرکوں پر سوار تھیں جن کے آگے اور اطراف پر لگی اور بجاری مشین گنیں نصب تھیں۔ باقی دو کمپنیاں ٹرک کے دونوں جانب کوئی پانچ سو میٹر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ تمام انسانی اور غیر انسانی مداخلت کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح لیس تھیں۔ پیدل فوج کے پیچھے پیچھے توپ خانہ تھا جس کی دو بڑی توپیں دھنوں کے بعد دو دو گولے سامنے کی طرف فائر کرتی تھیں تاکہ باغی توپوں کی گھن گرج سن کر سپاہی ہوتے جائیں۔ سپاہی اتنے حساس تھے کہ ذرا سے شیعہ پر گولی چلا دیتے تھے۔ چلتے چلتے اگر کسی مکان یا درختوں کے جھنڈے ذرا سی جنبش ہوتی، تو اس کا جواب ملی مشین گن کے ایک برسٹ (BURST) سے دیا جاتا۔ مجھے یاد ہے ایک موقع پر ایک جھنڈی سرسراہٹ ہوئی، ایک سپاہی نے فزاً گولی داغ دی۔ چند لمحے بعد آگ کی تیش سے ہائ کی گڑھی تڑاخ سے پھٹ گئی ہر ایک نے یہی قیاس کیا کہ کسی شہرہ مند نے جوابی فائر کیا ہے، چنانچہ ساداتا قافلہ رک کر اس جھنڈی تلاش کی گئی۔ چند سپاہی جھنڈے سے باہر نکلیں تاکہ اسے تھیلے سے لے کر باغی نکلا، تو اس کو ہلاک کر دیں گے۔ اس میں پندرہ منٹ ضائع ہو گئے۔

ڈھاکہ سے تنگیل جاتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹا سا قصبہ پڑا ہے جس کا نام کرانیہ ہے جو گنجان درختوں میں گھرا ہے۔ اس کے ایک طرف نالہ ہے جو ہر وقت پانی سے بھرا رہتا ہے۔ ٹرک کے کنارے ایک پٹرول پمپ اور ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ تمام دکانیں بند تھیں۔ قصبہ بالکل اجاز پڑا تھا۔ حکم ملنے پر بازار میں پڑے ہوئے مٹی کے تیل کے ڈرم مذاکرش کر لیے گئے اور دکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ دوسرے مکانوں تک بھی پھیل گئی اور دھواں سبز نشیوں سے بلند ہونے لگا۔ فوجی دستہ اس کے آخری گوشہ کا انتظار کیے بغیر روانہ ہو گیا۔ جب ہم قصبے کے دوسری جانب پہنچے تو میری نظر ایک سیاہ مینے پر پڑی جو کھوٹے سے بندھا آتش زدہ استخوان سے بھاگنے کے لیے بے تاب تھا۔ جوں جوں وہ آواز ہونے کے لیے کھوٹے کے گرد بھاگتا، اس کے گلے کا رشتا اتنا ہی تنگ ہو جاتا۔ سچی کہ وہ چڑکھا کر وہیں گر گیا۔ شعلہ اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ چند کلومیٹر آگے بڑھے تو ٹرک کے بائیں جانب انگریزی حرف دی (V) کی شکل کی دو خندقیں نظر آئیں۔ وہ بالکل تازہ دکھائی دیتی تھیں جیسے انہیں کوئی ابھی چھوڑ کر گیا ہو، غالباً کچھ دیر پہلے تک یہاں باغی تھے جو توپوں کی گھن گرج سن کر بھاگ گئے تھے، مگر کدھر؟ اس کی اطلاع دینے کے لیے کوئی شخص موجود نہیں تھا۔

اس جگہ کو کھنگالے بغیر آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہ تھا؛ چنانچہ سپاہیوں کو حکم ہوا کہ وہ ٹرک کے دونوں جانب سائے علاقے کی تلاش لیں۔ میں مکمل کھڑا رہ گیا۔ اس فراغت میں میں گارے کی بنی ہوئی کھلی جھونپڑی میں گھس گیا تاکہ طرزا ہائش دیکھ سکوں۔ اس میں دو کمرے تھے۔ ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ چھوٹا کمرہ ہٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور بڑا رہنے کے لیے بڑے کمرے میں مٹی کا خوبصورت لیپ کیا گیا تھا اور سامنے کی دیوار پر دو بچوں کی فریم شدہ تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ دونوں بچائی معلوم ہوتے تھے۔ کمرے کے درمیان ایک چارپائی اور ایک کھجور کی بنی ہوئی چٹائی بھی تھی۔ چٹائی کے اوپر لیجے ہوئے چادروں کا ایک پیالہ تھا جس میں نئے نئے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ نوالہ چھوڑ کر کیوں چلے گئے، کہاں



ایک موٹی ہی گالی نے مجھے میرے خیالات سے چونکا دیا۔ سپاہیوں نے ایک ہڈے کو تلاش کر کے اس سے پوچھ کر شروع کر دی تھی، مگر وہ باغیوں کے متعلق کچھ نہیں اگلتا تھا۔ سپاہی اسے عدم تعاون کی سزا کے طور پر جان سے مارنے کی جگہ دے رہے تھے۔ میں بھی اس کے پاس چلا گیا اور پچاسیوں کو چپ کر لیا۔ بنگالی بااثروں کا ڈھانچہ تھا جس کے جسم پر واحد جیتھ اس کا ستر ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس کی سیاہ جلد ساٹھ سال کی محسوس ہوتی تھی اور اس کی ڈاڑھی سیاہ سے سفید ہو چکی تھی۔ میں نے اوپر سے نیچے تک اس پر نگاہ ڈالی۔ میری نظر اس کے گرد آؤنگے پاؤں کی سوجی ہوئی گولی پر آ کر ٹک گئیں۔ مجھے وہ کسی طور شہید یا شہیدوں کا حامی نظر نہ آیا۔ میرے ہمدردانہ رویے سے ہمت پا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر کہنے لگا:

”تھوڑی دیر پہلے وہ (شہید) یہاں تھے۔ وہ کہتے تھے اگر تم نے ہمارے متعلق کچھ کہنا، تو گولی مار دیں گے۔ اب یہ پاکستانی آئے ہیں۔ کہتے ہیں اگر ان کے متعلق نہ بتایا، تو گولی مار دیں گے۔ میں کیا کروں؟ میں کدھر جاؤں؟“

ترس کھا کر بڑے میاں کو زندہ چھوڑ دیا گیا اور قافلہ آگے بڑھا اور چلتے چلتے شام تک پہنچ گیا جہاں سرکٹ ہاؤس پر بنگلہ دیش کا پرچم لہرا رہا تھا۔

پاکستانی فوجوں نے جا کر وہ پرچم اتار کر اس کی جگہ پاکستان کا جھنڈا لہرا دیا۔ دونوں توپوں نے بریگیڈیئر صاحب کے حکم پر دو دو گولے مغربی جانب سنٹوش (مولانا بھاشانی کی جائے رہائش) کی طرف فائر کیے تاکہ ان سب کو پتہ چل جائے کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔ فوجی دستے نے دن بھر کی مسافت کے بعد رات تک گیل میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور میں بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ بلی کا پٹر میں واپس ڈھاکہ چلا آیا۔

ایسی کارروائیوں سے باغی بڑی سرکوں سے ہٹ کر یا تو یہی علاقوں میں چلے گئے یا سپاہی ہوتے ہوئے سرحد پار کر کے ہندوستان میں چلے گئے۔ ان کے تعاقب یا سرکوں کا وار و مدار دستیاب وسائل یا فوجی نفری پر تھا۔ جب تک وسائل محدود تھے، صرف شاہراہوں کو صاف کیا گیا، مگر جب گٹ پنچھی، توکارروائی کا دائرہ کاری وسیع کر دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے ۲۵ مارچ تک مشرقی پاکستان میں متعین فوج صرف ۱۴ ڈویژن پر مشتمل تھی، لیکن ۲۶ مارچ سے ۱۶ اپریل تک مزید نفری مغربی پاکستان سے پہنچی۔ اس میں دو ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز (۹ ڈویژن اور ۱۶ ڈویژن)، پانچ بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز، ایک کمانڈو بٹالین اور بارہ انفنٹری بٹالین (پیدل پٹنیں) شامل تھیں۔ یہ سب اپنے بھاری ہتھیار توپیں وغیرہ مغربی پاکستان ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ کیونکہ انہیں چند شہرینہ کی سرکوبی کرنا تھی، کوئی باقاعدہ جنگ تھوڑا ہی زمانہ تھی!

اس کے علاوہ تین بیادہ پٹنیں اور دو مارٹر بیٹریاں (بگنی توپیں)، بالترتیب ۲۴ مارچ اور ۲۵ اپریل کو مشرقی پاکستان پہنچیں۔ فوجی لشکر جو ایسٹ پاکستان رائل فوج کی جگہ لینے کے لیے یکم اپریل اور ۲۶ اپریل کے درمیان پہنچا، اس میں ایسٹ پاکستان سول آرمد فورسز (ای پی سی اے ایف)، مغربی پاکستان ریجنل (ڈیلیو آرا)، اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے رضا فوج شامل تھے۔

جتنی نفری آئی تھی اسے آپریشن سرچ لاسٹ کی تکمیل پر لگا دیا گیا۔ آپریشن جو ۲۵ مارچ کی رات کو شروع ہوا، اس کے باضابطہ اختتام کا بھی اعلان نہیں کیا گیا، مگر وسط مئی میں بڑے شہروں اور قصبوں کو مکمل زیر اثر لینے کے بعد یہی سمجھا گیا کہ اس کے مقاصد حاصل

ہو گئے ہیں۔

ذکورہ بالا واقعات کے دوران کل کتنے آدمی مارے گئے؟ ان میں سے کتنے بنگالی اور کتنے غیر بنگالی تھے؟ مجھے انہوں سے کہیں یہ اعداد و شمار کتنے نہیں کر سکا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہلاک ہونے والے بنگالیوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار ہزاروں میں ہوگی۔ اگر غیر ملکی ذرائع ابلاغ عامر نے یہ اعداد و شمار بڑھا چڑھا کر بیان کیے ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہیں راولپنڈی میں بیٹھے ہونے پر باہر مقل دولتش نے ۲۶ مارچ کو مشرقی پاکستان سے نکال دینے کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے اکثر صفا فوجی تھے جہاں وہ تیاروں کی غیر مصدقہ خبروں اور بھارتی معلقوں کے تخمینوں پر انحصار کرنے لگے۔ مجھے یقین ہے اگر ان صحافیوں کو مشرقی پاکستان میں رہنے دیا جاتا، تو حالات انہیں اتنے گھمبیر نظر نہ آتے جتنے انہوں نے دورِ مہم کرناگ امیز ہی کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے۔

لے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کو حسب ذیل تاریخوں پر باغیوں سے صاف کیا گیا:

پاکسی (۱۰ اپریل)، چور (۱۰ اپریل)، سلٹ (۱۰ اپریل)، اشروڈی (۱۳ اپریل)، چندر گھوتا (۱۳ اپریل)، راجشاہی (۱۵ اپریل)، شاکر گانڈ (۱۵ اپریل)، کشنیا (۱۶ اپریل)، کشم (۱۶ اپریل)، جواڈنگ (۱۶ اپریل)، برہمن باڈی (۱۶ اپریل)، درسنہ (۱۹ اپریل)، قی (۲۱ اپریل)، سنگھیا (۲۱ اپریل)، گوندو (۲۱ اپریل)، دودھاری (۲۲ اپریل)، گارڈ (۲۳ اپریل)، رچپور (۲۴ اپریل)، نوکھی (۲۴ اپریل)، سنندھ (۲۴ اپریل)، سراج گنج (۲۴ اپریل)، مولوی بانار (۲۴ اپریل)، کاکس بانار (۲۴ اپریل)، داتیا (۲۴ اپریل)،

# جنرل نیازی کی آمد

۲۶ مارچ کو ڈھاکہ سے غیر ملکی نامہ نگاروں کو نکالنے کا فیصلہ پاکستان کو بہت مہنگا پڑا۔ انہوں نے باہر جا کر مشرقی پاکستان کے متعلق طرح طرح کی خبریں تخلیق کرنی شروع کر دیں جن میں سے بیشتر مبالغے یا غیر مصدقہ اطلاعات پر مبنی ہوتی تھیں۔ ان سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ پاکستانی فوج معصوم اور نشتہ بنگالیوں کو ناحق موت کے گھاٹ اتار رہی ہے۔ اس پروپیگنڈے کا زہر کم کرنے کے لیے میں نے مارچ ۱۹۷۱ء کے آخر میں حکام بالاکو تجویز پیش کی کہ ہمیں برطانوی بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ مشرقی پاکستان میں تعین تمام بنگالی یونٹیں ایسٹ پاکستان لٹننٹ اور پولیس بغاوت کر چکی ہے اور پاکستان آرمی کو ان مسلح اور منظم ہائیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے نہ کہ معصوم اور نشتہ۔ بنگالیوں کا میری اس تجویز کے عوض مجھے ایک جھاڑ وصول ہوئی جس کا متن یہ تھا: ”تم دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہو کہ پاکستان آرمی کا واپس لوٹ گیا ہے؟ کیا تم ایسی حرکت کر کے آرمی کے ناموس کو بڑا لگانا چاہتے ہو؟“

تجویز تو میں نے واپس نہ لی، البتہ جھاڑ وصول کر کے خاموش ہو گیا۔ چند ہفتے بعد جب حالات نے حکام کو مجبور کیا، تو انہوں نے ایک برطانوی اخبار کے نمائندے کی خدمات حاصل کر کے اپنا نقطہ نظر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس مضمون میں سارا دریاں اس بات پر صرف ہوا کہ بنگالی فوج کی بغاوت کی وجہ سے پاکستانی فوج کو سخت مداخلت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کے نتیجے میں جانی اور مالی نقصان ہو رہا ہے۔

معقول تجویز کے بروقت قبول نہ ہونے کا قلق صرف مجھے ہی نہیں تھا، ایک اور سلسلے میں میر جنرل رائو فرمان علی بھی نشانہ بن چکے تھے۔ انہوں نے ڈھاکہ میں فوجی کارروائی کے چند روز بعد (اواخر اپریل میں)، اعلیٰ قیادت کو شورو دیا کہ باغی عناصر کے لیے فوراً عام معافی کا اعلان کر دیا جائے تاکہ جو لوگ زنا کام مداخلت کے بعد واپس آنا چاہیں آجائیں۔ انہوں نے اس پر فوری طور پر عمل کرنے کو کہا تاکہ باغی عناصر مستقلاً بھارت کی گرفت میں نہ چلے جائیں۔ اس پر ایک سینئر جنرل نے طنزاً کہا: ”اودھ! ہمیں آپ کی سیاسی چالوں کا پتہ ہے، مگر اب سیاست کا وقت گزر چکا ہے۔“ اسی اعلیٰ قیادت کو پانچ ماہ بعد (۴ ستمبر) عام معافی کا اعلان کرنا پڑا، مگر دریائی عرصے میں گمراہ بنگالی بھارت کی ریجنائی میں ”گمراہ آزادی“ میں بدل چکے تھے۔ بعد میں دوران جنگ اس سپاہ نے بھارتی فوج کا کام بہت سہل کر دیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

پتہ نہیں وہ کون خوش قسمت تھا یا تھی، جس کی تجویز کو راولپنڈی والوں نے بروقت قبول کرتے ہوئے ایک اور لفٹیننٹ



لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی  
کمانڈر، ایٹرن کمانڈ

جنرل مشرقی پاکستان بھیج دیا تاکہ وہ لیفٹیننٹ جنرل لنگا خاں کی بھاری دستہ داروں میں ہاتھ بٹا سکے۔ اس وقت گورنر مارشل لا اینڈ منسٹر اور کمانڈر ایئرکن کمان کے تینوں عہدے لنگا خاں کے پاس تھے۔ مؤخر الذکر دستہ داری (سپاہ کی کمان) سنبھالنے کے لیے مشرقی پاکستان سے لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی بھیجے۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں ملٹری کراس اور ۱۹۴۵ء کی جنگ میں لالہ خیرا حاصل کیے تھے اور ٹائیگر کے نام سے مشہور تھے۔ غالباً ارباب اقتدار کا خیال تھا کہ بنگال کے ٹائیگر کو زیر کرنے کے لیے پنجاب کا ٹائیگر بھیجنے ضروری ہے۔ ان کی وہ کڑواریاں جو دسمبر ۱۹۴۸ء کی شکست کے بعد نظربار میں آئیں اُس وقت زبان زد عام تھیں شاید اس وقت تک ان کی قلمی نہیں کھلی تھی یا لوگ صاحب اقتدار شخصیت پر اٹھکی اٹھا کر مصیبت کو دعوت نہیں دینا چاہتے تھے۔

وہ اپریل کو ڈھاکہ پہنچے اور اگلی صبح کمانڈر ایئرکن کمان کے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ اسی شام ان کے سرکاری مکان (فیک ہاٹ ہاؤس) میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ شام کو بھی دردی پسندے ہوئے تھے۔ انہیں اپنے کندھے پر لیفٹیننٹ جنرل کے تازہ بریک کا واضح احساس تھا۔ انہیں دردی، ریک اور چھاتی پر تنے سجانے کا بہت شوق تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان کی شخصیت زیادہ باوقار گنتی ہے۔ (یہ باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں جب انہوں نے مجھے ٹائیگر کی کسی اخباری نمائندہ سے کولانے سے پہلے میں دیکھ لیا کہ وہ دردی میں ہیں، جنرل خادم راجہ نے مجھے بتایا کہ جب وہ فوج کی کمان ان کے سپرد کیے تو جنرل نیازی نے پوچھا: "اپنی دانتاؤں کا چارج کب دو گئے؟"

چارج لینے کے بعد جنرل نیازی نے اپنے ہٹاؤ کو خطاب کیا جس میں انہوں نے ماضی کی "خفاقتوں پر تنقید کی اور بنگالیوں بالخصوص بنگالی دانشوروں اور بنگالی ہندوؤں پر خوب برسے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بنگالی قومیت کو پروان چڑھانے والے یہی لوگ ہیں۔

فوجی کارروائی کے بارے میں انہوں نے اپنے پیشرو سے مشورہ کیا اور جس طرح چل رہا تھا، دس مئی تک چلنے دیا یہ وہ تاریخ تھی جب مشرقی پاکستان کا آخری قصبہ (کاکس بازار) دوبارہ ہمارے قبضے میں آیا۔

ماہ اپریل میں تین ہجرتی جنرل جنرل نیازی کی اعانت کے لیے ڈھاکہ پہنچے۔ ہجرتی جنرل رحیم جنرل خادم راجہ والے ۴۴ ڈویژن کے جی او ای مقرر ہوئے جبکہ ہجرتی جنرل شوکت رضا اور ہجرتی جنرل نذر حسین شاہ کو بالترتیب ۹ ڈویژن اور ۱۹ ڈویژن دیے گئے۔ یہ دونوں ڈویژن تازہ تازہ مغربی پاکستان سے آئے تھے جنرل نیازی نے اپنے تازہ وسائل کے پیش نظر مشرقی پاکستان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مشرقی سرحد جنرل شوکت رضا کو، شمال مغربی علاقہ جنرل نذر حسین شاہ کو اور باقی علاقہ جنرل رحیم کو سونپ دیا۔

اس اضافی طاقت کے ذریعے سارے مشرقی پاکستان میں حکومت کا کنٹرول بحال کرنے میں زیادہ ویرنگی۔ اپریل کے آخر تک بڑے بڑے شوروں سے باغیوں کو نکالنا لگا چکا تھا اور وسطیٰ ملک سر قابل ذکر بلکہ پاکستانی فوج پہنچ چکی تھی، لیکن یہ کنٹرول طاقت کے بل بوتے پر قائم تھا۔ اس کا دلوں پر چاکیت سے کوئی تعلق نہ تھا، کیونکہ مؤخر الذکر کام کے لیے جن سیاسی اور انسانی اقدامات کی ضرورت تھی ان کی طرف کوئی توجہ دی گئی، بلکہ عمل صفائی (SWEEP OPERATION) کے نام پر خشک گھروس

لے فوج میں نائنٹر (DOVE) اور ہارڈ (HAWK) کی، مصلحتیں عام ہیں۔ اول الذکر سے مراد ایسے لوگ جیسے جیسے جو مسلح خوار و نرم مل جوں اور مؤخر الذکر کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنگ خوار و سخت گیر سمجھتے ہیں۔

پر چھاپے مار مار کر زخموں پر نیک چھڑکنے کا تاثر دیا گیا۔

یہ عمل صفائی بھی اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ یہ کام جن لوگوں کے سپرد تھا وہ بنگال اور بنگلہ زبان سے ناواقف تھے۔ وہ گلی نمبر پڑھ سکتے تھے نہ مثبت بنگالیوں کو پہچان سکتے تھے۔ انہیں ہر کام کے لیے مقامی لوگوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا جن میں سے اکثر کے دلوں میں اب بھی عظیم الزمکن رہتا تھا۔ وہ اب بھی یہ عقیدہ سینے سے لگائے بیٹھے تھے کہ کبھی کبھی ان کا بگ بندھو رہا ہو کہ ضرور آئے گا۔ چنانچہ ان کے رویے میں اگر کھلم کھلا مخالفت نہیں، تو واضح بے اعتنائی ضرور دکھائی دیتی۔ فوج کے ساتھ جن لوگوں نے اس آڑے وقت میں تعاون کیا، ان کا تعلق عموماً وادیں بازو کی جماعتوں سے تھا، مثلاً کونسل مسلم لیگ کے خواجہ خیر الدین، کونسل مسلم لیگ کے فضل القادر چودھری، قیوم مسلم لیگ کے خان لے۔ صبور، جماعت اسلامی کے پروفیسر غلام اعظم اور نظام الاسلام پارٹی کے مولوی فرید احمد۔ یہ سب لوگ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ سے شکست کھا چکے تھے جب انہوں نے فوج پر اور فوج نے ان پر انحصار کرنا شروع کیا، تو اکثر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ پٹے ہمارے فوج کی سرپرستی میں ہوا میدان میں آگئے ہیں۔ میں نے ایک سرکاری اجلاس میں ان کے مفید تعاون کو سراہنے کے بعد عرض کیا کہ ان میں میرے نمردوں کے بیانات بار بار نشر کرنے کے بجائے ان کے ایسے لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے جو سیاسی شخصیت بے شک نہ ہوں، مگر اپنے اپنے حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں، تو بہتر ہوگا۔ یہ تجویز فوراً منظور کر لی گئی اور وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے حکم سنا دیا گیا کہ تم سرکردہ شخصیتوں سے بیان حاصل کرو۔

میں جب اپنی ہی تجویز کے پھندے میں چپس گیا، تو یہ جلا کہ یہ کتنی مشکل کام ہے، کیونکہ جو لوگ بلا مجبک تعاون کرنے کو تیار تھے وہ سرکردہ تھے نہ باوقار۔ اور جو سرکردہ اور باوقار تھے وہ آسانی سے تعاون پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اہم شخصیت جو مجھے مشرقی پاکستان کی عدالت عالیہ کے سابق چیف جسٹس مرہٹس مرہٹس سے ملاقات کے دوران پٹن کیا میں ان کا "تعاون" حاصل کرنے میں ان کے دشمن کالونی میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ وہ مجھے نہایت شفقت سے اپنے دارالمطالعے میں لے گئے جہاں دنیا بھر کی جدید جدید کتابیں اور نوادرس محفوظ تھے۔ انہوں نے ان نوادرات سے میری تواضع کی۔ ساتھ ساتھ اپنی عالمانہ گفتگو سے بھی نوازا اور ری سہی کسر دہی، سعدی اور اقبال کے اشعار سے پوری کی۔ اس فضا میں میں نے ان سے تعاون کی درخواست کی، تو وہ مجھے پڑھ گفتگو کے خازن میں لے گئے۔ گفتگو کرنے والا ملائم شخص یکایک باعث وقت لگے لگا۔ انہیں گفتگو کے ایک طویل موڑ سے واپس بلاتے ہوئے جب میں نے اپنی درخواست دہرائی، تو انہوں نے فرمایا: مجھے سوچنے دیجئے۔ میں خاموش ہو گیا تاکہ وہ سوچ لیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر عرض کیا، تو فرمانے لگے: "جی ہاں، میں نے کہا مجھے سوچنے دیجئے۔ میں نے کہا، "تجربہ کل حاضر ہونا چاہیے گا۔" فرمانے لگے: "نہیں، کل نہیں۔ مجھے سوچنے کے لیے کم از کم تین ماہ چاہئیں تاکہ میں اندازہ کر سکوں کہ آپ لوگوں نے واقعی اپنا اقتدار بحال کر لیا ہے یا نہیں۔" ہاں، یہ تو بتائیے آج کل خالینہ کہاں ہے؟

آئندہ سرکاری اجلاس میں جب میں نے اپنی تجویز پر عمل درآمد کے سلسلے میں مذکورہ بالا واقعہ بیان کیا، تو فضا میں سرخروانی سے متعلق ایک صاحب بلے: "یہ بھی کوئی مشکل کام ہے، ہم آج رات ہی مرشد کو اٹھالیں گے اور اس سے حسب نشان بیان لے لیں گے۔" صدر مجلس کی مداخلت پر جسٹس مرشد کو اس عزت سے محروم رکھا گیا۔



جسٹس مرشد واحد انشورنہ تھے جو مختلف خطوط پر سوچتے تھے، خود حکومت کے زیر اقتدار ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ایسے بے شمار افراد تھے جن کے دل کے تار کہیں اوجڑے ہوئے تھے۔ دونوں شعبوں کا ایک ایک واقعہ سن لیجیے۔ آپ کو ان کی ذہنی افتاد کا اندازہ ہو جائے گا۔

دھاکہ میں ۲۵ مارچ کی رات کو فوجی کارروائی کے بعد مجھے حکم ملا کہ ریڈیو کو دوبارہ چلایا جائے تاکہ اس کے ذریعے مارشل لا احکام عوام تک پہنچائے جاسکیں۔ میں نے ریڈیو کے عملے سے کہا کہ وہ سازوں پر دھنیں نشر کرتے رہیں تاکہ سامعین کو اندازہ رہے کہ ریڈیو نشن چل رہا ہے اور جنوں مارشل لا کی طرف سے ہدایات آتی جائیں گی، موسیقی بند کر کے نشر کی جائیں گی اور پھر موسیقی کا سہارا لیا جائے گا۔ انہوں نے ان ہدایات کو سنا اور صدق دل سے ان ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا، لیکن جب میں چلا آیا تو انہوں نے نامی دھنیں بجانا شروع کر دیں۔ واپس آکر انہیں ٹوکا اور کہا کہ آئندہ سے صرف حمد، نعت اور منقبت وغیرہ نشر کیے جائیں۔ انہوں نے اس حکم پر بھی سر تسلیم کیا اور بغیر بار بار نشر کرنے لگے۔

اے مولانا علی، اے شیر خدا میری کشتی پار لگا دینا

یاد رہے کشتی عوامی لیگ کا انتخابی نشان تھا۔ اسی طرح میں نے ٹیلی ویژن کو ہدایت کی کہ وہ قیام پاکستان کا پس منظر اجاگر کرنے کے لیے تحریک پاکستان پر مبنی ڈرامے نشر کرے۔ انہوں نے پہلا ڈرامہ محمد علی جوہر پر مبنی کاسٹ کیا۔ ڈرامے کے شروع میں مولانا جوہر کی تصویر دکھائی گئی، لیکن باقی سارے کاسٹ کا سارا ڈرامہ تحریک آزادی کے فروغ کی نذر ہو گیا۔ کار بار بار اس طرح کے مکالمے بولتے تھے: "آزادی کے جذبے کو کبھی دیا یا نہیں جاسکتا۔" "آزادی قربانیاں مانتی ہے۔" "آزادی کے لیے ماؤں کو اپنے بچے اور بہنوں کو اپنے بھائی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔"

آزادی کے ان جراثیم کو ختم کرنے کے بجائے حکام نے "بنگالیوں کو دباؤ رکھنے" کی پالیسی کو ترجیح دی۔ انہوں نے "عمل صفائی" کو وسیع پیمانے پر جاری رکھا جس کے لیے معلومات کا واحد ذریعہ محبت وطن بنگالی یا بھاری تھے۔ ان میں سے اکثر نے صدق دل سے فوج کے ساتھ تعاون کیا، مگر چند ایک نے ذاتی ریش یا حماقت کی وجہ سے کئی بے گناہ آدمیوں کو بھی مرادیا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

ایک روز صبح وائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ایک سیاسی رہنما ایک نو عمر لڑکے کو ساتھ لے کر مارشل لا ہیڈ کوارٹر کے اتفاقاً برآمدے میں سامنے سے میں آتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے رک رک کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے: "یہ لڑکا میرا بھتیجا ہے جو باغیوں کے کیمپ سے بھاگ کر آیا ہے۔ میں اعلیٰ حکام کو بعض اہم معلومات دینا چاہتا ہوں۔" میں انہیں ایک اعلیٰ حاکم کے پاس لے گیا۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ باغی دھاکہ شہر کے پاس سے بننے والے دریا "بوڑھی گنگا" کے پار کرانی گج کے مقام پر جمع ہیں، لوگوں سے زبردستی روٹی اور پیسے ہوتے ہیں اور آج رات دھاکہ شہر پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

میں واپس چلا آیا اور اس معتبر محبت وطن شہری کی اطلاع پر دہمزد تصدیق کیے بغیر فوراً فوجی کارروائی کی تیاری کا حکم دیا گیا۔ کارروائی کے انچارج افسر سے کہا گیا کہ وہ فوراً ایڈنی ٹوپیں، چھوٹی ٹوپیں، ٹینک ٹینک ٹوپیں اور مطلوبہ فوجی دستے تیار کر کے راتوں رات بوڑھی گنگا کے کنارے پہنچ جائے اور طلوع آفتاب سے ذرا پہلے حملہ کر کے باغیوں کا صفایا کر دے۔

جب یہ کارروائی شروع ہوئی، میں آپریشن روم (OPERATION ROOM) میں تھا جہاں کارروائی کی لمحہ بھر اطلاعات آرہی تھیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے مختلف توپوں کی گھن گرج اور بعد میں خود کار ہتھیاروں کے فائر کی آواز سنی۔ اس کمرے میں موجود کئی افسروں کا خیال تھا کہ ایک ٹالین اور چند توپوں سے شاید یہ معرکہ سرنہ ہو سکے۔ طلوع آفتاب تک غیر یقینی کا تاثر غالب رہا۔ تھوڑی دیر بعد یہ شہرہ سنایا گیا کہ ہماری سہادر فوج نے کسی جانی نقصان کے بغیر باغیوں کے کیمپ پر قبضہ کر لیا ہے۔ شام کو میری ملاقات اس کارروائی کے انچارج افسر سے ہوئی۔ اس نے جو انکشاف کیا اس سے میرا خون مری رگوں میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ اس نے بتایا کہ کرانی گج ایک غریب اور معصوم بستی تھی جس میں زیادہ تر بوڑھے، بچے اور عورتیں تھیں، انہیں خواہ مخواہ غیر متعلقہ اطلاع پر بھجوں کر رکھ دیا گیا۔ اس سانحے کا بوجھ میں عمر بھر اپنے ضمیر پر لیے پھروں گا۔

ادھر فوجی کارروائی زوروں پر تھی اور ادھر ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات ایک زبان تھے کہ صوبے میں حالات تیزی سے معمول پر آ رہے ہیں، کئی بار ایسا بھی ہوا کہ جب ایک گھر عمل صفائی کی زد میں تھا، تو گھر کا ریڈیو کہہ رہا تھا کہ سب اچھا ہے! اس سے یقیناً سرکاری ذرائع نشر و اشاعت پر سب بنگالیوں کا اعتماد اٹھ گیا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو اور دیگر غیر ملکی نشریاتی اداروں کی طرف رجوع کرنے لگے۔ آل انڈیا ریڈیو — خواہ وہ نئی دہلی سے بول رہا ہو یا کلکتہ سے — بنگالیوں کے ذہن میں زہر گھولنے میں پیش پیش تھا۔ یہ ریڈیو بنگالیوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات بھڑکانے اور انہیں "اپنی جان، مال اور عزت کے تحفظ" کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑنے کی ترغیب دے رہا تھا — بہت سے بنگالی جو ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے، کچھ فوجی کارروائی کے تائے ہوئے تھے اور کچھ آکاش وانی کے پڑھائے ہوئے —

جن لوگوں نے ان حالات میں بھی اپنے گھروں میں ڈٹے رہنے کا فیصلہ کیا، انہوں نے اس بات میں مصلحت سمجھی کہ وہ کسی فوجی افسر یا بوردی فرد سے راہ رسم پیدا کر لیں کیونکہ خاکی وردی اور شہوتیاجا بولی ذاتی حفاظت اور بقا کی ضمانت بھی جاتی تھی۔ ایسے واقعات بھی ہوئے کہ کئی کئی حضرات کسی نہ کسی بنگالی کنبے کی سرپرستی میں لگ گئے جس کنبے کو قدرت نے حسن کی دولت سے نوازا تھا، اسے بیک وقت کئی کئی فوجی افسروں کی سرپرستی حاصل ہوئی۔

میں بھی ایک متمول بنگالی گھرانے میں روشناس کرایا گیا۔ اس گھر کا مالک ایک مقامی اخبار کا ایڈیٹر تھا، لیکن اتنا مغرور کہ گزشتہ سوا سال کے دوران میں اس نے کبھی سیدھے منہ مجھ سے بات نہ کی تھی۔ اب وہ سراپا لطف و کرم بن کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں اس کے ساتھ چلوں تاکہ اس کے اہل خانہ کو تحفظ کا احساس ہو، کیونکہ پڑوس میں عمل صفائی سے ان کے دل دہل گئے ہیں۔ میں اس کے ساتھ ہو گیا۔ اس کی والدہ شادی شدہ ہیں اور دیگر اہل خانہ سے تعارف کرانے کے بعد مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ میرا مین روم اور اس کی نو بیاہتا بیوی ساتھ والے صوفے پر براجمان ہوئے۔ میزبان چند لمحوں کی منت منت مانگ کر ہوٹل انٹر کائیٹنیل سے کسی مہمان کو لانے کے بہانے چلا گیا اور میں کمرے میں حسین تر حیدر کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ میں نے سوچا ان لمحوں کو خاموشی کی نذر کر دینا کفرانِ نعمت ہو گا کیوں نہ چنہ پیٹی میٹی بایں ہو جائیں، میں نے گفتگو کا آغاز معذرت سے کرتے ہوئے کہا: "مجھے افسوس ہے کل رات آپ کے پڑوس میں . . . اس نے مجھ کی طرح میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "لا تعذر اور عورتوں پر چڑمانہ حملے کرنے اور ذاتی املاک کو بے تحاشا تباہ کرنے کے بعد اب تمہارا احساسِ ندامت جاگا ہے . . . میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر وہ طوفانی انداز میں کتبی پٹی لگی: "تمہیں شرم آتی چاہیے اپنے کرتوتوں پر،"

مجھے خاکی وردی کے ایک ایک تار سے نفرت ہے، دشتی بن ہر فوجی کے منہ پر رقم ہے..... پتہ نہیں میرا خدا نہیں یہاں کیوں لے آیا۔ تم یقیناً ان درندوں کے قیلے سے ہوجنوں نے گزشتہ شب میری بن کے گھر گھس کر ہر چیز تس تس کر دی تھی.....“

میں نہیں کہنے کے عالم میں اٹھا اور بوجھل قدموں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

نفرت کے اس زہر کو ختم یا کم کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ مریض کے نفسیاتی علاج کو سراسر نظر انداز کر دیا گیا۔ ۲۵ مارچ کے بعد اگر کوئی تعمیری یا مثبت کام ہوا، تو وہ ریلوے لائنوں کی مرمت، کشتیوں کی آمد و رفت، اشیائے ضرورت کی نقل و حرکت، امن و امان کی بحالی وغیرہ تک محدود رہا۔ درحقیقت یہ کام بھی تسلی بخش طور پر پورا نہ ہو سکا، کیونکہ مسائل دیوثیت تھے اور ان سے بچنے والے ہاشیے! وہ بنیادی طور پر مسائل کی وسعت اور گہرائی کے اور اک سے محروم رہے۔ ان کی مثال اس چوہے کی سی تھی جو چلتے ہاتھی پر سوار یہ سمجھنے لگے کہ جس حصے پر اس کا قبضہ ہے، وہی ساری کائنات ہے اور وہی اس کا مالک ہے۔

ہاتھی کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے راولپنڈی سے پانچ ہزار افراد پرنٹل پولیس اور کوئی دو ورجن سی۔ ایس پی افسر بھی گئے یہ ایک بھی بے اثر ثابت ہوئی، کیونکہ ان کی تربیت ایک باقاعدہ انتظامی شعبے کو چلانے تک محدود تھی جبکہ ضرورت لحاظ سے نہ صرف جسم کو بچا کر کے اس میں نئی روح پھونکنے کی تھی۔ بلے شک نوکر شاہی سے سیاحت کی توقع عبث تھی، یہ کام ایسا نالوا اور مدبروں کا تھا۔ مگر افسوس کہ مارشل لا کے خازن میں ایسے پھول نہیں کھلا کرتے۔

## باب ۱۲

# ہمکتی باہنی

۱۹۷۱ء کی جس شورش نے ماہ دسمبر میں پاکستان اور بھارت کے درمیان باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کی اس کی ابتدا مارچ ہی میں ہو چکی تھی۔ اس کی پشت پناہی بھارت کر رہا تھا جس کے آثار شروع ہی سے نظر آرہے تھے۔ فوجی کارروائی کے فوراً بعد بھارت نے عملی حمایت درپردہ اور اخلاقی حمایت سرعام شروع کر دی تھی۔

وزیراعظم اندرا گاندھی نے ۲۷ مارچ کو کوک بھائی تقریر کرتے ہوئے کہا: ”میں ان معزز ارکان کو جنہوں نے یہ دریافت کیا ہے کہ آیا مشرقی پاکستان کے بحران کے متعلق، بروقت فیصلے کیے جائیں گے، یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ہمارے نزدیک بروقت فیصلوں کی بہت اہمیت ہے کیونکہ وقت گزر جانے کے بعد فیصلے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ چار روز بعد ایسی لہان نے جب ذیل قرار داد منظور کی:

”یہ ایوان اُن رہنماؤں کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ ان کی جدوجہد اور قربانیوں کو بھارت کی بھرپور مدد دی اور حمایت حاصل رہے گی۔“

اسی روز بھارت کے ایک اہم ادارے کے سربراہ مشرے۔ کے سبرانیئم نے عالمی امور کی بھارتی کونسل کے زیر اہتمام مذاکرے میں یہ اعلان کیا:

”بھارت کو اب اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس کا مفاد پاکستان کی شکست و ریخت میں ہے اس طرح کا موقع ہمیں کبھی نہیں ملے گا۔“

اس تقریر کے دوران انہوں نے پاکستان کو بھارت کا دشمن نمبر ایک قرار دیا اور موجودہ بحران کو ”صدیوں میں ایک منفرد موقع“ ٹھہرایا۔

عملی حمایت جو درپردہ جاری تھی، اس کا ایک ثبوت بھارتی بارڈر سکیورٹی فورس کے وہ سپاہی ہیں جو سرحد سے کئی میل اندر سملٹ اور جیسور کے علاقوں میں پکڑے گئے۔ بعد میں اسی سرحدی فوج کے اسپیکر جنرل نے اپنے سپاہیوں کو باغیوں کے اولین سرکاری میزبان قرار دیا۔ اس کے علاوہ بھارت کی باقاعدہ فوج کے کئی افسر سادہ کپڑوں میں مشرقی پاکستان میں گھس آئے تھے



اور پاک فوج کے خلاف مزاحمت میں مدد دے رہے تھے۔ ان میں سے دو افسروں نے بعد میں (میری اسیری کے دوران) بڑے فخر سے اپنے ان کارناموں کا اعتراف کیا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بھارت، پاکستان کے اندرونی معاملات میں اس حد تک مداخلت کرتا تو اس نے مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں — جب پاکستان اندرونی خلفشار کا شکار تھا — مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے اسے ہڑپ کیوں نہ کر لیا؟ اس کا جواب ہمیں بھارتی مصنف مہر جرنل (دیشا مرنی ڈی۔ کے پبلیش سے ملتا ہے۔ وہ اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ بھارتی فوج کے سربراہ نے اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ ان دنوں بھارتی فوج تنظیم نو کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ پچاس ارب روپے کی لاگت سے پانچ سالہ دفاعی منصوبہ زیر تکمیل تھا اور بھارت کی جنگی مشین کو مصیبت کرنے کے لیے ابھی اہم اقدامات کرنا باقی تھے۔ اس منصوبے کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

”فوج کی افرادی قوت (منصوبے کے مطابق) ابھی تک نہیں ہوئی تھی، کئی یونٹوں کی نفری کم تھی۔ ریلے کے بعض دستوں کا قیام بھی تھیں۔ تشکیل تھا۔ انتظامی امور اور نقل و حرکت کے وسائل کو بھی آخری شکل دینا باقی تھا۔ فضائی شعبہ میں بگ ۱۲ کا طیاروں کی ساخت کا پروگرام عروج پر نہیں پہنچا تھا۔ علاوہ ازیں فاضل پرنسزوں کی کمی کے باعث بعض اڑاکا سکوارڈنوں کی جنگی صلاحیتیں بھی کمزور رہ گئی تھیں۔ بحریہ میں بھی ساز و سامان کی ترتیب جدید زیر عمل تھی۔ درحقیقت مسلح افواج کو ہر پور جنگ کی تیاری کے لیے چند ماہ کی مدت درکار تھی۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ تھا کہ خود بھارت کے اندر اس کے کئی ڈویژن (حالیہ انتخابات وغیرہ کی وجہ سے) اس امان بحال رکھنے پر مامور تھے۔ اس کی دو ڈویژن فوج مغربی بنگال پر تھی، مگر اس کے بھاری ہتھیار ابھی تک کشمیر میں پڑے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ڈویژن ناگالینڈ اور میزو لینڈ (MIZO LAND) میں تھیں۔ فضا میں کو مشرقی پاکستان پر ہر پور حملہ کرنے کے لیے اضافی ہوائی اڈے درکار تھے۔ سچر میں واقع کڑی گرام کے ہوائی اڈے کو بھی توینس دے کر جنگ کے لیے تیار کرنا باقی تھا۔“

بھارت سے شائع ہونے والی ایک اور کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت کو مشرقی پاکستان پر چڑھائی کرنے کے لیے فوج کا عرصہ درکار تھا۔ کتاب کے دو مصنفین کا کہنا ہے:

”اس کے لیے، ہمیں نو مہینوں کی مہلت درکار تھی تاکہ ہم ہر طرح سے تیاری مکمل کر لیں، عالمی ریلے عائد کو ہموار کر لیں اور (چین کی ممکنہ امداد کے خلاف) روس کی یقین دہانی حاصل کر لیں۔ ان اقدامات کے بغیر حملے کا آغاز ممکن نہ تھا۔“

جب ہم خانہ جنگی میں مصروف تھے تو بھارت مذکورہ بالا تینوں محاذوں پر ہر پور کام کر رہا تھا۔ اس کی مسلح افواج کے سربراہ جلد از جلد اپنی جنگی مشینری کو مصیبت کرنے میں لگ گئے۔ وزارت خارجہ سفارتی محاذ پر سرگرم ہوئی۔ اس نے روس سے دوستی کے معاملے

کی تجویز کو پرانی خانوں سے نکالا اور لاگت کو روس سے باقاعدہ معاہدہ کر لیا۔ عالمی ریلے عائد کو ہموار کرنے کے لیے پنہ گریزوں کے مسئلے کو بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کیا؛ حالانکہ ان میں سے اکثر خود بھارت کی شہ پر اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ ان تیاریوں کے ساتھ ساتھ بھارت نے پاک فوج کی جنگی صلاحیتوں کو کمزور کرنے کے لیے کئی باہنی کو منظم کیا۔ کئی باہنی میں ریڈیو کی ہڈی ساقی ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے باغی افسر اور سپاہی تھے۔ ہندوستان میں ان کی صفوں میں عوامی لیگ کے رضا کار دیوینوری کے طلبہ اور تنوین پناہ گزین بھی شامل کیے گئے۔ ان کی قیادت کرنل (دیشا مرنی ڈی۔ ایم۔ لے جی عثمانی کے سپرد تھی جو اس کے باقاعدہ کمانڈر انچیف مقرر کیے گئے تھے۔

باغی فوج کو سیاسی حمایت مینا کرنے کے لیے عوامی لیگ کی مفروضات کو استعمال کیا گیا جو اب کلکتہ پنچ بک تھی۔ ان قائدین کو جلاوطن حکومت کی شکل دی گئی جس میں تاج الدین، قمرالزماں، منصور علی اور مشتاق احمد خود شامل تھے۔ اس حکومت کا ریشن یہ تھا کہ کئی باہنی کی مسلح جدوجہد اور بھارت کی سرپرستی سے بنگلہ دیش کو آزاد کیا جائے۔

بھارت کے جنگی آقاؤں نے کئی باہنی کے لیے حسب ذیل تین مقاصد مرتب کیے:

سب سے پہلے

وہ سارے مشرقی پاکستان میں پھیل کر پاک فوج کے ساتھ جھڑپوں کا آغاز کرے تاکہ خود غرضانہ کر کے نقل و حرکت معطل ہو کر رہ جائے اور وہ حفاظتی اقدامات کے لیے متعلقہ علاقوں میں مقیم ہو کر رہ جائے۔

اس کے بعد

گوریلہ کارروائیوں کو رفتہ رفتہ تیز کر کے پاکستانی افواج کے مورال کو کمزور کیا جائے تاکہ

آخر کار

اگر پاکستان اس پھیر چھاڑے تو بنگال کی کھلی جنگ پر مجبور ہو جائے تو یہی کئی باہنی بھارت کی باقاعدہ فوج کے لیے مشرقی قیڈ فورس کا کام دے سکے۔

ان مقاصد کو سامنے رکھ کر ایک بھارتی جرنیل کی گرائی میں کئی باہنی کو تربیت دی گئی۔ شروع شروع میں تربیت صرف چار ہفتوں تک محدود تھی جس میں تحریری کارروائیاں کرنے، کمین گاہوں پر گولیاں برسانے، دستی بم پھینکنے اور داخل چلانے کی مشق کرائی گئی۔ بعد میں تربیت کی مدت بڑھا کر آٹھ ہفتے کر دی گئی اور مذکورہ کاموں کے علاوہ تمام ہلکے ہتھیاروں کی تربیت دی گئی۔ اس طرح تین ہزار افراد کو تربیت دے کر ایک منظم اور مسلح فوج تیار کی گئی اور اسے بھارت کی باقاعدہ فوج کے ساتھ شانہ بشانہ لڑانے کے انتظامات کیے گئے۔ ان کے علاوہ مشرقی ہندوستان پر افراط کو گوریلہ جنگ کی تربیت دے کر مشرقی پاکستان میں بھیجا گیا۔

مارچ کی فوجی کارروائی اور دسمبر کی باقاعدہ جنگ کے دوران ہونے والی گوریلہ جنگ اور تخریب کاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:



جون اور جولائی، اس عرصے میں کئی باہنی نے اپنی کارروائیوں کو سرحدی علاقوں تک محدود رکھا جہاں اسے سرحد پار سے بھارتی فوج کی اخلاقی اور مادی امداد ملتی رہی۔ اس دور میں باغیوں میں زیادہ جرأت نہ تھی۔ وہ عموماً چھوٹی موٹی حرکتیں کر کے سرحد پار بھاگ جاتے اور جہاں کہیں خطرے کی بو آتی، فوراً غائب ہو جاتے۔ ان کی زیادہ تر توجہ چھوٹی چھوٹی پٹیاں اڑانے، متروکہ دیوے لائن پر سرنگیں بچانے اور ایک آدھ دھاتی بم پھینکنے پر مرکوز رہی۔

اگست - ستمبر اب ان کی تربیت اور طریق کار خاصا بہتر ہو گیا۔ ان کی ذاتی جرأت اور قائدانہ صلاحیتوں میں بھی نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ اب وہ فوجی قافلوں اور کمپن گاہوں پر حملے کرنے، بحری جہازوں کو ڈوبنے اور اہم سیاسی شخصیتوں کو قتل کرنے لگے۔ ان کارروائیوں میں ڈھاکہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔

(اکتوبر - نومبر) اب وہ سرحدی علاقوں اور صوبے کے اندر بھی بہت متعدد ہو گئے۔ سرحدی چوکیوں پر بھارتی توپ خانے کی مدد سے باقاعدہ حملے کرتے اور اہم شہروں میں نوٹر تحریکی کارروائیاں کرتے۔ اس عرصے میں انہوں نے بعض سرحدی علاقوں میں گھس کر مورچے کھود لیے جہاں سے انہیں نہ ہٹایا گیا۔ بعد ازاں باقاعدہ جنگ کے دوران یہ مورچے بھارتی فوج کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔

مذکورہ تین ادوار میں نہ صرف کئی باہنی کی تحریکی کارروائیوں میں شدت بڑھتی گئی، بلکہ اس کا دائرہ کار بھی وسیع ہوتا گیا۔ اس سے پوری طرح غمہ برآ ہونے کے لیے کئی باہنی کے تربیتی کمپنوں میں بھی تبدیلی متعارف کیا گیا۔ شروع میں ان کی تعداد تیس تھی جو اگست میں چالیس ہو گئی اور ستمبر میں چوراسی تک پہنچ گئی۔ ہر کمپن میں ایک تربیتی مدت کے دوران پانچ سو سے دو ہزار افراد کو تربیت دینے کی گنجائش تھی۔ تمام کمپنوں سے تربیت پانے والوں کی کل تعداد ایک لاکھ تھی۔

ان شہریندوں اور باغیوں کے لیے ہتھیار اور دوسرے جنگی سامان حاصل کرنے میں بھارت کو شروع شروع میں دقت کا سامنا کرنا پڑا، مگر دوسرے معاہدہ دوستی کے بعد یہ مشکل حل ہو گئی۔ فوجی حربے سے متعلق ایک مطالعاتی اور تجرباتی ادارے کی ایک رپورٹ کے مطابق روسی حکومت نے بھارت کو یقین دلایا کہ کئی باہنی کو دیے گئے ہتھیاروں کی جگہ مزید ہتھیار دیے جائیں گے، تو بھارت نے باغیوں کو اسلحے کی سپلائی میں اضافہ کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک برطانوی خاتون صحافی نے جو تازہ تازہ مشرقی یورپ سے آئی تھیں، مجھے بتایا کہ مشرقی یورپ میں دوسری جنگ عظیم کے متروکہ روسی اسلحے کے ڈھیر لگے ہیں اور وہ اب بھارت کو منتقل کیے جا رہے ہیں۔ ہتھیار حاصل کرنے کا ایک اور ذریعہ براہ راست خرید تھا جو بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت بھارت اور روس کی مدد سے غیر ملکی منڈیوں سے خریدتی تھی۔ اس کے لیے بنگلہ دیش کے غیر سرکاری سفیر انگلستان اور امریکہ میں فائدہ اٹھاتے تھے۔

یہ تو تھا سرحد کے اُس باریکی تیار یوں کا حال! آئیے دیکھیں کہ اس چیلنج سے پنپنے کے لیے پاکستان کے وسائل کیا تھے؟

مشرقِ بازو میں پاکستان کے ۱۲۶۰ افراد اور ۴۱۰۰ سپاہی تھے جن کے ذمے ۵۵۱۲۶ مربع میل علاقے کا دفاع تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے مشہور گوریلا لیڈر ٹی۔ ای۔ لارنس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ہر چار مربع میل قطعہ اراضی کی حفاظت کے لیے بیس سپاہی درکار ہوتے ہیں۔ لارنس نے یہ تناسب صحرائی جنگ کے تناظر میں مقرر کیا تھا جہاں جدوجہد کا کافی دور تک جاتی ہے مگر مشرقی پاکستان میں وافر فوجوں اور سہولتوں کی وجہ سے حد نظر خاصی محدود تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں تھوڑے علاقے کے لیے زیادہ نفری درکار تھی۔ لیکن اگر ٹی۔ ای۔ لارنس کے فارمولے سے بھی اندازہ لگایا جائے، تو مشرقی پاکستان کی حفاظت کے لیے ۵۶۴۰ افراد درکار تھے، یعنی دستیاب وسائل سے تقریباً سات گنا زیادہ! ایک غیر ملکی صحافی ڈیوڈ لوٹسک نے مطلوبہ تعداد کا کم از کم اندازہ دو لاکھ پچاس ہزار لگایا تھا۔

ان نامساعد و صدماتی حالات کے باوجود فوج نے باغیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پورے آٹھ مہینے اپنے باؤں میں نعرش ڈالنے دی۔ اس نے اہم جھلکی ہید کوارٹر اور سب ڈویژنل ہیڈ کوارٹر زیمیت تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کو ملتی باہنی سے محفوظ رکھا۔ تین سو شتر سرحدی چوکیوں میں سے دو سو ساٹھ چوکیوں کو اپنے قبضے میں رکھا۔

فوج نے اپنی کارروائی کے لیے بڑے بڑے شہروں میں اپنا اڈہ یا ہیڈ کوارٹر بنارکھا تھا جہاں سے فوجی دستے گزروں کے علاقوں میں باغیوں کی سرکوبی اور تحریکی کارروائیوں کی روک تھام کے لیے جایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں یہ فوجی بڑی پھرتی اور مستعدی سے نقل و حرکت کرتے اور باہنی ان کا مقابلہ کیے بغیر بھاگ جاتے۔ بعد میں تھکاوٹ کے آثار ابھرنے لگے اور ہمارے فوجی صرف اسی وقت کارروائی کرتے جب یہ ناگزیر ہوجاتی خواہ مخواہ اسلی یا نقلی تحریک کاروں کا پھیلنا دیکھتے تھے۔ تیسرے مرحلے (اکتوبر - نومبر) میں وہ عموماً اپنے ہیڈ کوارٹر سے چپک کر رہ گئے اور باہر نکل کر خطرہ مول لینے سے گریز کرنے لگے۔ شورش کے ان آٹھ مہینوں کے مختلف ادوار کا گراف بنایا جائے تو یہ چلتا ہے کہ جوں جوں کئی باہنی کی کارروائیاں بڑھتی گئیں، ہماری دفاعی کارروائیاں کم ہوتی گئیں۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جوں جوں ہماری کارروائیاں کھٹنے لگیں، کئی باہنی کی حرکتیں تیز اور مؤثر ہو گئیں۔

ان کارروائیوں کے مدوجز کے ساتھ ساتھ بنگالی عوام کا رویہ بھی بدلتا رہا۔ وہ عموماً جیتنے والی ٹیم کا ساتھ دیتے تھے۔ جب ہمارے فوجی باغیوں کو مار بھگاتے تو مقامی لوگ ان کا دم بھرنے لگتے، لیکن جوں جوں وہ واپس ہیڈ کوارٹر آجاتے اور باغی متعلقہ علاقوں میں گھس آتے، تو بنگالی اپنے نئے آقاؤں کو خوش آمدید کہتے۔ بعض افراد اتنے ہوشیار تھے کہ انہوں نے بنگلہ دیش اور پاکستان دونوں ممالک کے قومی پرچم ہزار کھے تھے اور حسب ضرورت ایک جھنڈا اپنے مکان پر لہا دیتے تھے۔ صحیح وقت پر صحیح جھنڈے کا صحیح مقام پر ہونا عموماً واضح بلا سمجھا جاتا تھا۔

لیکن سبھی بنگالی اتنے خوش قسمت یا ہوشیار نہ تھے کہ وہ مرغ بادشاہ کو اپنی جان بچا لیتے۔ ان میں سے کئی پاک فوج اور کئی باہنی کی آویزش میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھے۔ نمونے کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں:

ماہ اگست میں ضلع لڑکھلی کے ایک علاقے سے اطلاع ملی کہ وہاں کئی باہنی نے مصیبت ڈھارکھی ہے۔ ایک نوجوان



افسر کو سات سپاہیوں سمیت ان کی سرکونی کے لیے روانہ کیا گیا اور چلتے وقت اسے ہدایت کی گئی کہ وہ طاقت کے بجائے "سیلیقہ اور لچک" سے کام لے کر اس علاقے کو تخریب کاروں سے پاک کر دے۔ سیلیقہ اور لچک کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے وہ سات سپاہیوں سے باہر دھو بیٹھا۔ اطلاع ملنے پر پاک اور کپتان کو کمک دے کر روانہ کیا گیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ باغی فوراً اسلحہ ایندھن کے ساتھ مورچہ بند ہیں اور باقاعدہ معرکہ آرائی پر تیار ہوئے ہیں۔ وقت یہ تھی کہ ان کے مورچے ایک گاؤں میں واقع تھے جہاں سولین لوگ بھی بستے تھے۔ نوجوان کپتان نے دُور سے کئی بار انتباہ کیا، مگر کوئی اثر نہ ہوا، چنانچہ اس نے سارے گاؤں کو گھیرے میں لے کر چاروں طرف سے اس پر گولہ باری شروع کر دی۔ دھوئیں کے بادلوں کے ساتھ تینیں بھی بلند ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا آدمی سفیر جھنڈا اٹھائے باہر نکلا اور اس کی بجیک مانگنے لگا۔ اس کی درخواست فوراً قبول کر لی گئی، لیکن اتنے میں کئی بے گناہ جانیں ضائع ہو گئیں۔

یہ تو تھا باغیوں کو پناہ دینے والوں کا شہر! جو بنگالی پاک فوج سے تعاون کے مترکب پائے جاتے، ان کا شکر کیسے زیادہ عبرتناک ہوتا۔ انہیں نہ صرف ہلاک کر دیا جاتا، بلکہ بعض اوقات ان کی لاشیں درختوں سے ٹانگ دی جاتیں۔ ان حالات میں اہم مسلحہ ہتھیار کا باغیوں کو معصوم شہریوں سے کس طرح الگ کیا جائے۔ ایک موقع پر جنرل نگا خاں کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ سرحد سے ملحق دو میل کی پٹی کو آبادی سے خالی کر لیا جائے تاکہ جو شہر شخص نظر آئے اسے گولی سے اڑا دیا جائے۔ نگا خاں نے یہ تجویز رد کر دی اور وجہ یہ بتائی کہ اس سے آباد کاری کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ ستمبر کے مہینے کے اعلان کے بعد بھارت سے پناہ گزین بھی لوٹنا شروع ہو جائیں گے جن کی آباد کاری بذاتِ خود بہت بڑا مسئلہ ہو گا۔ سرحدی علاقہ خالی کر کے اصفانی سردوں کیوں مول لی جائے؟

چنانچہ بنگالی عوام اور باغیوں کا باہمی رابطہ قائم رہا۔ وہ ایک جیسے کپڑے پہنتے اور ایک جیسے خدوخال رکھتے تھے، اس لیے یہ شناخت کرنا مشکل تھا کہ کون معصوم ہے اور کون شریکِ ادا۔ علامت ہتھیار تھا جو باسانی چھپایا یا اٹھایا جاسکتا تھا، کیونکہ وہاں اونچی اونچی گھاس، موسمی فصل یا جنگلی سنبو بہت تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سنئے: خیرٹلی کے شریکِ راجشاہی کے علاقے روچاپور میں داخل ہو کر لوگوں کو روٹی، رہائش اور نقد رقم دینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ فوجیوں کی ایک ٹولی اس گاؤں کی چھان بین کے لیے روانہ کی گئی۔ تلاش کے باوجود کوئی شریکِ راجشاہی نہ ملا، البتہ ایک کھیت میں کام کرتے ہوئے تین کسان نظر آئے، لیکن بے ضرر کسانوں کو چھپنا سبب نہ تھا، لہذا وہ مایوس ہو کر لوٹنے لگے۔ تاہم تین شخص سے ان کی اچانک ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اسے پکڑ کر پوچھنا شروع کیا، مگر اس نے کوئی مدد نہ کی۔ اسے سنگین دھماکہ دھکی دئی گئی کہ اگر اس نے شریکینوں کا پتہ نہ بتایا، تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس نے تینوں کسانوں کی طرف اشارہ کیا۔ انہیں فوراً حراست میں لے لیا گیا اور ان کی نشاندہی پر اسی کھیت میں سے متعدد دگر بنڈ، دھماکا خیز بم اور جنگلہ دیش کے پرجار کے لیے مطلوبہ اشتہار حاصل کیے گئے۔ یہ تینوں کئی ماہی کے سرگرم رکھنکلے۔

پاک فوج کو دھوکہ دینے کے لیے باغیوں نے اور بھی کئی ہتھکنڈے اختیار کیے مثلاً جیسو سکیتھ میں مینا پول اور راگوناٹھ کے درمیان دو پاکستانی سپاہی گشت کر رہے تھے۔ سامنے سے ایک منفلوک الحال شخص آتا دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں سبزی کا تھیلہ تھا۔ تھیلے سے باہر سبزی دُور سے دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے یہی بجیک ماری اور چلا کر پوچھا، "کون ہو تم؟ تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

اس کے تھیلے کی تلاشی لی گئی، تو اس میں سے تھوڑی کارروائی کے لیے نام فیزا اور دیگر سامان نکلا۔ اسی طرح ایک بار لیٹھنٹ فرخ نے دریلے پر بم پترا کے پاٹ سے ایک کشتی پکڑ لی جس پر بظاہر کوئی حملہ لے ہوئے تھے، لیکن اندر بارودی سرنگیں اور گرینڈ بھرے تھے۔

علاوہ ازیں مداخلت سے بچنے کے لیے باغی عموماً کچے راستوں سے آتے جاتے تھے جبکہ فوجی اکثر کچی ٹریکس استعمال کرتے تھے۔ رنگپور سے ایک باغی نے سرحد پار اپنے ایک رفیق کار کو خط لکھا: "پاک فوج ہمیں کبھی نہیں پکڑ سکتی، کیونکہ وہ عام شاہراہوں کشتیوں کے اڈوں اور بڑے بڑے گھاٹوں کی کھوالی میں مصروف رہتی ہے جبکہ ہم متروک راستے استعمال کرتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ کشتی کی تلاشی لیتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی پچھلی سطح میں کیا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ یہ عموماً امام مسجد اور اس کیٹی کے ارکان کے گھروں پر نظر نہیں رکھتے جبکہ یہی ہماری پناہ گاہیں ہیں۔ ہمارا طریقہ کار کارگزار نہ، مگر ہمارا مقصد عظیم ہے یقیناً فتح ہماری ہوگی۔"

وقت گزرنے کے ساتھ تخریب کاری کی تکنیک میں بھی نفاست آتی گئی مثلاً شروع میں وہ بونی ٹریس اور سیفی والو استعمال کرتے تھے جب انہیں پتہ چلا کہ ہم ان سے بچنے کی تدبیر پاگئے ہیں، ہم عموماً فوجی قافلے کے آگے خالی جھیکڑا یا ریل گاڑی کا خالی ڈبہ چلا دیتے تھے، تو تخریب کاروں نے دُور سے کنٹرول کیے جانے والے REMOTE CONTROL اور بجلی سے چلنے والے دھماکا خیز بم استعمال کرنے شروع کر دیے جن کی مدد سے وہ چلتی گاڑی کو حسبِ فضا اڑا سکتے تھے۔ اسی طرح وہ پہلے ڈانچانے ساتھ لاتے تھے مگر بعد ازاں ڈرائی بیٹری سیل استعمال کرنے لگے، کیونکہ انہیں نارنج وغیرہ میں آسانی لایا جاسکتا تھا۔

بحری علاقوں میں انہوں نے اپنے طریقہ کار کو بہتر بنایا پہلے وہ بارودی سرنگ وغیرہ کسی ساکن جہاز یا کشتی سے باندھ جاتے تھے، مگر بعد میں لیٹ ماہی استعمال کرنے لگے جس کے مزہ پر تھانٹیں لگا ہوتا جو مارا گٹ کے قریب آکر خود بخود اس سے چپک جاتا اور مطلوبہ وقت پر پھٹ جاتا تھا۔ جب یہ کام بھی ناکافی لگا تو انہوں نے بھارت کے تربیت یافتہ غوطہ خور بھیجنے شروع کیے جو زیرِ آب تیرتے ہوئے جہاز وغیرہ کے پاس آتے اور اس سے تباہ کن سرنگ چپکا کر خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ بھارت نے ایسے تین سو غوطہ خور تیار کیے تھے۔ زیادہ عرصہ زیرِ آب رہنے کے لیے وہ عموماً بانس یا لٹکی کی پتی نالی سطح آب پر کھتے جس سے سانس لینے میں سہولت رہتی۔ بعض اوقات وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بانس یا کیلے کے تنے سے بازوئی سرنگ باندھ دیتے جو اپنی منطیسی قوت کی وجہ سے مارا گٹ سے خود بخود لگ جاتی۔

تخریب کاروں کی کارکردگی کی فہرست خاصی طویل ہے، مگر ان کے ہاتھوں ممکن یا جزوی طور پر تباہ ہونے والی چیزوں میں چند جہاز، ۳ پل، ریل کی ۱۲ پٹریاں اور بجلی کی ۹ تنصیبات شامل ہیں۔

اتنا زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے جس جذبے کی ضرورت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے لگا جاسکتا ہے جو راجشاہی کے علاقے روچاپور میں ماہ جون میں پیش آیا۔ تخریب کاری کے شعبے میں ایک نوجوان بنگالی کو پکڑ کر کمپنی ہیڈ کوارٹر میں لایا گیا۔ اس سے

۱ BOOBY TRAP: کسی چیز سے دھماکا خیز یا تباہ کن مواد یا طرح باندھ دیا جانے کے لیے جلاتے ہی چھٹ پڑے۔

۲ SAFETY VALVE: تخریب کاری کی ایسی ترکیب جس میں تخریب کار دُور ہی سے تباہ کن دھماکا کر سکتا ہے۔







# ٹیکان خاں کی واپسی

مشرقی پاکستان میں شور و شہ پارہی اور بچی خاں راولپنڈی میں بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ ۲۵ مارچ کی فوجی کارروائی کا حکم دے کر طویل ذہنی رخصت پر چلے گئے ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہ تھی کہ افواج پاکستان نے خون پسینے سے جو اہلیت حاصل کی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر حالات کو سدھارنے کے لیے کوئی قدم اٹھائیں۔ کیا وہ مشرقی پاکستان کے انجام سے مایوس ہو چکے تھے؟ بچی خاں کی بے عملی کی کئی توہینات کی گئی ہیں، ان میں سے بعض سیاسی تجزیے پر مبنی ہیں اور بعض محض قیاس آرائیاں! ایک توضیح بچی خاں کے وزیر پروفیسر جی ڈیوچو دھری نے دینا کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "ان مبینوں میں بچی خاں فہمی طور پر ناؤف نظر آتا تھا اور مجھ سے بات کرنے سے بھی کتراتا تھا۔" چودھری صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ بچی خاں اتنے حساس طبع تھے کہ انہیں فوج کی بربریت سے گہرا صدمہ پہنچتا تھا اور وہ حیران تھے کہ وہ اس کی تلافی کس طرح کریں۔

اس کے برعکس بچی خاں کے عمل کے ایک مہجر جنرل نے مجھے بتایا کہ چون میں بچی خاں نے ڈھاکہ جانے کا پروگرام بنایا اور وہ راولپنڈی سے روانہ بھی ہوئے، مگر کراچی میں اس کتیا کے چنگل میں ایسے پھنسے کہ ڈھاکہ جانا بھول گئے (غالباً ان کا اشارہ اس خاتون کی طرف تھا جس کی قربت سے صدر مملکت راحت پاتے تھے)۔

بچی خاں کے ٹولے کے ایک سینئر رکن نے بالواسطہ طور پر بچی خاں کے ڈھاکہ نہ آنے کی وجہ یہ بتائی: "جب تک ان ہنگامیوں کے ہوش ٹھکانے نہیں لگ جاتے، ہم ان سے بات نہیں کریں گے؛ آخری وضاحت خود بچی خاں سے ملتی ہے جو انہوں نے ایک صحافی کو دی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا: جب بھی میں ڈھاکہ جانے کا ارادہ کرتا ہوں میرا شاف اس کے خلاف شور مچاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے وہاں جانے سے سودمند نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔"

بچی خاں اگر چاہتے تو ڈھاکہ گئے بغیر بھی ضروری اقدامات کر سکتے تھے، مگر انہوں نے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جس سے صورت حال پر خوشگوار اثر پڑتا۔ مارچ والی فوجی کارروائی اور دہم کی جنگ کے درمیانی عرصے میں بچی خاں نے صرف دو فیصلے کیے۔ ایک جنرل ٹیکان خاں کی تبدیلی اور دوسرے باغیوں کے لیے عام معافی کا اعلان۔ کہا جاتا ہے پہلا اقدام انہوں نے بعض ملکی اور غیر ملکی ہی خواہوں کے اصرار پر اٹھایا تھا، کیونکہ ان کے خیال میں جب تک مشرقی پاکستان کی باگ ڈور ٹیکان خاں کے ہاتھ میں ہے وہاں حالات سدھ نہیں سکتے۔ بچی خاں نے اس تجویز کو تسلیم کرنے کے بعد سب سے پہلے جناب نورالامین کو صوبائی گورنر کا عہدہ پیش کیا، مگر انہوں نے خرابی صحت

کی بنا پر یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر نگاہ انتخاب ڈاکٹر لے ایم مالک پر پڑی جو تعلیم کے لحاظ سے دھڑان سارا پیشے کے لحاظ سے سیاست دان اور عملی طور پر مزدور رہتا تھے۔ انہوں نے کبھی خاں کی پیش کش قبول نہ کر لی۔

یعنی خاں کو یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ ٹکٹا خاں کو گورنری سے ہٹا کر جنرل نیازی کی جگہ کمانڈر ایڈمرنل کمانڈ بنا دیا جائے یا نیازی کی موجودگی میں مارشل لا اینٹرنیٹر قرار کیا جائے تاکہ صوبے میں تین بڑی شخصیتیں ہوجائیں۔ ڈاکٹر مالک گورنری کی کرسی پر۔ جنرل ٹکٹا خاں مارشل لا اینٹرنیٹر کی گدھی پر اور جنرل نیازی سپر سالار کی مسند پر۔ لیکن جنرل یحییٰ خاں نے یہ تجویز مسترد کر دی اور مشرقی پاکستان ڈاکٹر مالک اور جنرل نیازی کے سپرد کر دیا۔

جنرل ٹکٹا خاں اپنی اچانک علیحدگی پر خوش نہ تھے، اس کا اظہار ان کے رویے سے بار بار ہوتا تھا۔ انہیں یکم ستمبر کی شام کو آفیسر میں میں العدائی پارٹی دی گئی جس میں چھاؤنی کے سینئر افسروں نے شرکت کی۔ کھانا ختم ہونے کے بعد جنرل نیازی نے ٹکٹا خاں کو خرگ پیٹ کرنا شروع کیا۔ ٹکٹا خاں گم گم کرسی میں دھنستے رہے۔ جب وہ جوابی تقریر کرنے کے لیے اٹھے تو انہوں نے فرمایا: "میں ہم راج کو اچانک راولپنڈی میں ہٹا کر نئی دہلی سے واپس نہ جانے کا حکم دیا گیا۔ اب دفعہ مجھے یہ ذمہ داریاں ڈاکٹر مالک کے حوالے کرنے کو کہا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، ایسا کیوں ہوا ہے مگر صدر کے فیصلے پر تبصرہ کرنا میرے لیے مناسب نہیں وہی مشکل صورت حال سے واقفیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو مجاہدین چھوڑ کر جا رہا ہوں میری فوج اٹھتی ہو کہ میرے سپرد کیا گیا ہے اسے پائیدار بنانا۔ لیکن آپ کو بڑوں کی مرضی بہر حال آپ حوصلہ کریں آپ کے کمانڈر (جنرل نیازی) بڑے تجربہ کار ہیں وہ آپ کی مناسب رہنمائی فرمائیں گے، البتہ ایک بات یاد رکھیے کہ حالات پر اپنی گرفت دھیل نہ ہونے دینا، ورنہ یہاں آپ کی زندگی اچیرن ہوجائے گی۔"

اگلی صبح انہیں اعلان کرنے کے لیے ہم ایئر پورٹ پہنچے۔ صرف سرکاری افسر موجود تھے۔ مجھے ان کی روانگی کا منظر دیکھ کر ان کی آمد کا سماں یاد آ گیا جب راج کی نوپلی سپر کورہ ہاش ہاش، تازہ دم اور پُر اعتماد شکر اہٹ کے ساتھ جہاز سے اترے تھے۔ آج ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

ٹکٹا خاں کی روانگی کے اگلے روز (۲۳ ستمبر) سپر کورہ نے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس تقریب میں معززین شہر اعلیٰ سرکاری افسروں اور سفارتی سربراہوں نے شرکت کی۔ اسی موقع پر بعض سیاست دان مثلاً خاں لے صبر خاں، فضل اللہ چودھری اور سابق گورنر عبدالمجید خاں بھی نظر آئے۔ تقریب کے دوران میری نگاہ ڈاکٹر لے ایم مالک کے خیف بدن ڈھلکے ہوئے چہرے اور دھڑلانی ہوتی آنکھوں پر مرکوز رہی اور میں سوچتا رہا کہ اس مرد پر کاحوصلہ کتنا جوان ہے کہ اس نے اپنے ذمے وہ کام لے لیا ہے جو ٹکٹا خاں سے نہیں ہوسکا (اور انہیں تبدیل کرنا پڑا)۔

ڈاکٹر مالک کے گورنر بننے سے ڈھاکہ میں کشیدگی اور تناؤ کی فضا خاصی مد تک کم ہو گئی یوں محسوس ہوتا تھا کسی غیر کی جگہ کا ایک فرد آ گیا ہے۔ اگرچہ بنگالی عوام ڈاکٹر مالک سے ایسی عقیدت نہ رکھتے تھے جو انہیں حسین شہید سہروردی مولانا فضل الحق یا خاں احمد غلام الدین سے ملتی، مگر وہ ٹکٹا خاں کی نسبت انہیں یقیناً زیادہ قابل قبول تھے۔ انہوں نے اپنی تقریری کے بعد شہر کی سب سے بڑی مسجد بیت المکرمین نماز جمعہ ادا کی جہاں جنرل ٹکٹا خاں نے کبھی قدم نہ بڑھایا تھا

غیر بنگالی بالخصوص ہماری آبادی میں جنرل ٹکٹا خاں کے جانے سے دم تحفظ کا احساس پیدا ہوا ان کا خیال ٹکٹا خاں کے جانے

سے شریعت اور تیز ہوجائیں گے اور غیر بنگالی آبادی کی جان و مال اور عزت خطرے میں پڑ جائے گی۔ مجھے یاد ہے ہم ستمبر کو ایک ہماری اخبار نویس نے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں مجھے ٹیلیفون کیا، تو میں نے اسے کہا کہ اب تو بنگالی گورنر آ گیا ہے تمہیں رسول انتظامیہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس نے جواب دیا: کون سی رسول انتظامیہ مالک صاحب! ہمارا گورنر تو مغربی پاکستان چلا گیا ہے؟

دوسرے اہم سیاسی فیصلے یعنی عام معافی کا اعلان ہم ستمبر کو ہوا۔ اس اعلان کے مطابق تمام زیر جرات شریعتوں کو ہٹا دیا گیا سوائے ان لوگوں کے جن پر فرد جرم عائد کی جا چکی تھی۔ اگرچہ یہ بنیادی طور پر اچھا فیصلہ تھا، لیکن اتنی دیر سے کیا گیا کہ اس کی افادیت محدود ہو کر رہ گئی، کیونکہ ستمبر تک تمام باغی بھارتی تسلط میں جا چکے تھے اور ان میں سے اکثر ان کے ہاتھوں تربیت لے کر کشتی باہمی میں شامل ہو چکے تھے، اب ان سے پیچھے ہٹنے کی توقع رکھنا عبث تھا، البتہ اگر یہ فیصلہ اپریل کے آغاز میں ہوتا تو اس کے مفید نتائج نکل سکتے تھے، کیونکہ ان دہائی عوامی لیگ کے تقریباً نوے رہنما اچھی تک صوبے کے اندر تھے اور ذاتی تحفظ کی ضمانت پر سامنے آنے اور حکومت سے تعاون کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن اب کلکتہ منتقل ہو کر تھلا وطن حکومت سے عہد ایفا کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ گوریل جنگ اور تخریب کار روایتوں سے بہت سے ضروری بنگالیوں کو اُمید ہو چکی تھی کہ حالات کا پلڑا ان کی طرف ٹھک رہا ہے اور وہ جلد یا بدیر عجیب الزحیٰ کی رہائی اور وطن کی آزادی جیسی نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔

عام معافی کے حکم کے تحت ۲۰۰ افراد کو رہا کر دیا گیا۔ ان میں سے ۱۱۶ قیدیوں کو میرے سامنے جوید پور (جہاں ۲ ای بی نے پاکستانی فوجوں اور ان کے بال بچوں کو ہلاک کیا تھا) کی کوٹھڑیوں سے نکالا گیا۔ یہ وہ شریعت تھے جنہیں جانچ پڑتال کے بعد غنیمت (بے ضرر) قرار دیا جا چکا تھا۔ مزید ۸۰ قیدی دوسرے مقامات پر چھوڑے گئے جو انٹیلی جنس کی اصطلاح میں سیاسی نابل سفید (یعنی مشتبہ مگر بے ضرر) سمجھے جاتے تھے۔ کچھ قیدی ڈھاکہ میں بھی ہلاک ہو گئے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے کبھی باہمی کے کسی نکران یا مفرد سیاسی رہنما نے معافی کے اعلان سے فائدہ نہ اٹھایا سوائے ان منوں میں کہ بعض شریعت وطن پلٹنے والے پناہ گزینوں کا لبادہ اوڑھ کر آزادانہ مشرقی پاکستان میں داخل ہوئے گئے۔ وہ یا تو اسلحہ، بارود، گرنیڈ اور بارودی سرنگیں اپنے ساتھ لاتے تھے یا اندر داخل ہو کر مقررہ جگہ سے یہ چیزیں حاصل کر لیتے تھے۔

حکومت نے وطن واپس آنے والوں کے لیے سرحدوں کے ساتھ ساتھ استقبالیہ کمپ قائم کیے جہاں راشن، نقدی اور طبی امداد کا اہتمام تھا، مگر ان کمپوں میں بہت کم لوگ آئے۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا اعتماد بحال نہیں ہوا تھا۔ وہ ہماری ان خبروں کو محض پراپیگنڈہ سمجھتے تھے کہ حالات معمول پر آگئے ہیں اور بھارت کے اس پراپیگنڈے کو حقیقت گردانتے تھے کہ واپس جانے سے ان کی جان و مال اور عزت خطرے میں پڑ جائے گی۔

بعض بنگالی یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اعلان معافی کا اطلاق عجیب الزحیٰ پر بھی ہوگا۔ اس اُمید کو تعقیدیت ان افواہوں سے مل کر غیر ملکی طاقتیں عجیب کی رہائی کے لیے کبھی خاں پر دباؤ ڈال رہی ہیں۔ ان قیاس آرائیوں کو مزید ہوا جنرل یحییٰ کے ایک با اعتماد جنرل نے ڈھاکہ میں ایسے سوال پوچھ کر دی کہ اگر عجیب الزحیٰ کو جہاں کی طور پر ٹھکانے لگانے کے بجائے سیاسی طور پر ختم کر دیا جائے تو کیا بہتر ہوگا؟ انہوں نے یہ انکشاف کرتے ہوئے کہ عجیب الزحیٰ متحدہ پاکستان سے وفاداری کے عہد پر دستخط کرنے کو تیار ہے، مزید سوال کیا کہ آیا اس سے نام نہاد تحریک آزادی کی ہوا نہیں نکل جائے گی؟ میں نے عرض کیا کہ اول تو عجیب کے انجام کے بارے میں جنرل یحییٰ خاں پہلے ہی اعلان کر چکے ہیں اب وہ اس سے کیسے چھرکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ

مجیب رہائی کے بعد پھر قلابازی نہیں کھائے گا، مزید بحث سے جان چھڑاتے ہوئے جنرل صاحب نے فرمایا: اے جی! میں تو یونہی بحث رائے بحث کے طور پر آپ سے بات کر رہا تھا مگر اسے سچ سمجھ بیٹھے۔

درحقیقت یہ محض بحث رائے بحث نہ تھی، اس کے پیچھے مزور کوئی ہاتھ کار فرما تھا، کیونکہ میں نے ایک بہتر شخص سے سنا کہ ایک دوست ملک نے پاکستان اور بنگلہ دیش کے نمائندوں کی بیڑن ملک ملاقات کروائی ہے اور یہی خاں نے یقین دلایا ہے کہ وہ مجیب الرحمن کی جان بخشی کریں گے مگر وقت کا تعین ان پر چھوڑ دیا جائے۔

انہی دنوں ایک جرمن صحافی مجھ سے ملاقات کے بعد دھاک پہنچا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مغربی پاکستان میں ایک نیا سیاسی تصفیہ زیر غور ہے اور جھٹو نے مجھے یہ تاثر دیا ہے کہ اگر وہ اقتدار میں آگئے تو مجیب الرحمن کو رہا کر دیں گے، کیونکہ مجیب کو سزا دینے کا وعدہ کیجی خاں نے رکھا ہے، جھٹو نے نہیں؟

نئے سیاسی جھوٹے کا ایک منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی ان ۸ نشستوں کے لیے ضمنی انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا گیا جو عوامی لیگ کے مفزور ہونے سے خالی ہوئی تھیں۔ ضمنی انتخابات کرانے کی ذمہ داری پھر جنرل راولپنڈی علی کو سونپی گئی۔ انہوں نے اسے دلائل و ثبوت کی ان سیاسی جماعتوں کو آواز دینے کا ذریعہ سمجھا جو گزشتہ چند مہینوں سے فوج سے تعاون کر رہی تھیں؛ چنانچہ انہوں نے ان جماعتوں کو اپنے زیر نگرین کی فہرستیں پیش کرنے کو کہا۔ انہوں نے دس ذیل دی:

پاکستان جمہوری پارٹی	۴۶
جماعت اسلامی	۴۴
کونسل مسلم لیگ	۲۶
کونشن مسلم لیگ	۲۱
نظام اسلام پارٹی	۱۶

میزان ۱۵۴

مختلف جماعتوں کی طرف سے ۱۵۴ سیٹوں کا مطالبہ کیا گیا جبکہ خالی نشستیں ۸ تھیں۔ سب کو مطمئن کرنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ کیجی خاں کا حکم تھا کہ فوراً لائین (پاکستان جمہوری پارٹی) کو زیادہ سیٹیں دی جائیں تاکہ وہ مرکز میں مخلوط حکومت بنا سکیں۔

جنرل فرمان علی ابھی ناہنگ اور رند میں تناسب کا حساب لگا رہے تھے کہ جنرل پیرزادہ کا حکم ملا، قیوم لیگ کو کم از کم اکیس اور پاکستان پیپلز پارٹی کو اٹھارہ نشستیں دی جائیں۔ اس پر جنرل فرمان علی نے کہا: اس طرح میرے پاس دائیں بازو کی مقامی جماعتوں کو مطمئن کرنے کے لیے گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

”اچھا تو پی پی پی کے لیے اٹھارہ کے بجائے تیرہ سیٹیں کر دو۔“

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کیجی خاں تین سیاست دانوں — یعنی نورالامین، جھٹو اور قیوم خاں — کو بیک وقت وزارت عظمیٰ کا بھانہ دے رہے تھے۔ پتہ نہیں اس ڈرامے کے مرکزی کردار مغربی پاکستان میں کیا کیل کیل رہے تھے، لیکن مشرقی پاکستان میں یہ تاثر عام تھا کہ ضمنی انتخابات سراسر دھوکہ ہیں۔

ضمنی انتخابات میں اپنی جماعت کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے ایک رٹائرڈ ایئر مارشل دھاک تشریف لائے، یکم کتوبر کو شام ساڑھے پانچ بجے ایک اخبار نویس کے ہمراہ میری ان سے ملاقات ہوئی جو خامی ویر جاری رہی۔ انہوں نے ضمنی انتخابات کے متعلق جب میری رائے پوچھی تو میں نے عرض کیا: انٹر کانٹینیٹیئل کی سب سے زیادہ فضا میں ٹھہرنے کے بجائے بہتر ہو گا کہ آپ باہر نکل کر عوام کی یکے کی کا ملاحظہ کریں۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ کلام و تم میں پسے ہوئے عوام کو ضمنی انتخابات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں تو اپنی بقا کی فکر کھائے جا رہی ہے، کیونکہ وہ باری باری پاک فوج کی ہتھی ہاتھی اور رضا کاروں کے عقاب کا نشانہ بن رہے ہیں۔۔۔

”اگر مثلاً اتنا ہی مجبور ہے تو تمہارے خیال میں اس صورت حال سے کون نجات دلا سکتا ہے؟“

”میرے خیال میں یہ جرینوں، فیلڈ مارشلوں اور ایئر مارشلوں کے بس کی بات نہیں۔ اس وقت ملک کو ایک ایسے بلند قامت سیاسی مدبر کی ضرورت ہے جو پوری قوم کو یکجا کر سکے۔“

”میرے خیال میں تو اس کا حل مجیب الرحمن ہے جس کی رہائی بلا تاخیر عمل میں آنی چاہیے۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔“

”مگر وہ تو قدر ہے، یہ سب اسی کا تو کیا دھرا ہے؟“

”اگر تمہاری افواج تمام قاتلوں کو (اعلان معافی کے ذریعے) بخش سکتی ہیں تو انہیں مجیب کی رہائی کا کنڈا گھونٹ بھی ملتی ہے تاہلینا چاہیے، کیونکہ اس نے کسی ایک شخص کو بھی اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کیا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ مغربی پاکستان مجیب الرحمن کی رہائی کی خبر سننے کے لیے تیار ہے۔“

چند روز بعد وہ مجیب الرحمن کے بیوی بچوں کو دلاس دے کر واپس مغربی پاکستان چلے گئے۔

جب دوسرے سیاست دان ضمنی انتخابات کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، جھٹو بار بار اصرار کر رہے تھے کہ اقتدار بلا تاخیر ۱۹۶۰ء کے انتخابات کی بنا پر عوامی نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔ ملک کو درپیش بحران کے پیش نظر کسی کا یہ مطالبہ کئی لوگوں کو بے وقت کی راگنی لگا کر جھٹو کے حامی کہہ رہے تھے کہ قیادت کے بحران کا واحد حل انتقال اقتدار ہے۔

جنرل کیجی نے غیر سرکاری طور پر جھٹو کو اقتدار میں یوں شامل کر لیا کہ انہیں آٹھ روپے کا قاعدہ بنا کر عوامی جمہوریہ چین بھیج دیا۔ اس وفد کے دوسرے ارکان میں پاک فضا کے سربراہ ایئر مارشل رحیم خاں اور فوج کے چیف آف جنرل اشاف لیشینٹ جنرل گل حسن شامل تھے۔ یہ وفد نومبر کے شروع میں پکنگ پہنچا اور چینی قائدین سے برصغیر کی تازہ صورت حال کے متعلق بات کی۔ وہاں سے روانگی سے قبل جھٹو نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا: ”ان مذاکرات سے، پاکستان کے خلاف جارحیت کی روک تھام ہوگئی ہے۔“ اس سے کیجی خاں کے پند

روز پہلے کے اعلان کی تصدیق ہوئی تھی جس میں کہا گیا تھا: پاکستان پر حملے کی صورت میں چین ہماری مدد کرے گا۔

۱۹ نومبر ۱۹۶۰ء کو یوں عید کے موقع پر چند روز کے لیے راولپنڈی آیا تو میری ملاقات وفد کے ایک قریبی ذریعے سے ہوئی جس نے چینی مدد کے بارے میں میرے سوال کے جواب میں کہا: ہاں چینی ہمارے عظیم دوست ہیں۔ انہوں نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ ہم بنگالیوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔“

”تاہم غیر ملکی حمایت کی تلاش میں جن دروازوں پر دستک دی گئی ان میں واشنگٹن بھی شامل تھا۔ وہاں بھی امریکہ کو وہ دوطرفہ معاہدہ



دلیا گیا جو اس نے پہلے مارشل لا سے قبل (چھٹے عشرے میں) کیا تھا۔ وہاں سے جو جواب ملا وہ بھی یہی جواب سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ ان دو عظیم طاقتوں کے ہائے میں پروفیسر جی ڈبلیو چودھری لکھتے ہیں،  
"پکی خال نے مجھے لیکن اور چینی قائدین سے اپنی خط کتابت دکھائی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بنگالیوں سے سیاسی تعصیف کے آرہے تھے بلکہ"

## باب ۱۴

# بحران کی دہلیز پر

ملکی اور غیر ملکی سیاست سے بحرانی صورت ڈرانے دھری۔ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ یوں لگتا تھا ان کا رخ پہلے سے متعین ہو چکا ہے اور اب دھارا اسی رخ پر بہتا رہے گا۔ خود ڈھاکہ میں زندگی خاصی تلخ ہو گئی تھی۔ مشکل ہی سے کوئی دن ایسا گزرتا تھا جب لوٹ مار، آتش زنی، سیاسی قتل یا بھجپنے کی کوئی نہ کوئی واردات نہ ہوتی۔ مثلاً ۲۳ اکتوبر کو دن دہائے مشرقی پاکستان کے سابق گورنر منجم خاں کو ان کے گھر میں ہلاک کر دیا گیا۔ چند روز بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کی حدود میں ایک صوبائی وزیر کی کار کو بجک سے اڑا دیا گیا۔ پھر چوری کی ایک کامیابی تھیں مادہ لاڈر اسے قومی جیل کے کرشل ایریا میں کھڑا کر دیا گیا اور وقت مقررہ پر یہ سارا مادہ پھٹ پڑا جس سے پانچ افراد ہلاک اور تیرہ زخمی ہو گئے۔ اگلے روز اسٹیٹ بینک کی پرنسپل عمارت میں بم پھٹا۔ اس سے اگلے روز گورنر ہاؤس کے ساتھ والی عمارت میں ٹیلی وژن اسٹیشن کی بالائی منزل کو گم لگ گئی۔

یہ واقعات اپنی جگہ پر بہت اہم تھے، مگر جب روز روز کا معمول بن گئے، تو لوگوں نے ان میں دلچسپی لینا بند کر دی؛ چنانچہ تحریک کاروں نے مقامی اور غیر ملکی لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے انٹر کانٹیننٹل سوشلسٹ کمیونٹی کی طرف متوجہ کیا۔ وہاں مسل خانے میں مقتول مقتدر میں انہیں مادہ رکھ کر اسے آگ لگا دی جس سے ہوٹل کا مقبول ترین حصہ دھڑم سے گر پڑا۔ کئی ہفتوں تک مرقت کا کام جاری رہا اور ہر آنے جانے والا پوچھتا: یہ کیا ہوا ہے؟ یوں بالواسطہ طور پر کئی باہمی کی تشویر ہوتی رہی۔

۱۱ اکتوبر کو تحریک کاروں نے اپنی کارروائیوں میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا۔ وہ ڈھاکہ شہر میں چھوٹی توہیں (مارٹرز) لے آئے۔ اس کا اندازہ مجھے ۱۱ اکتوبر اور ۱۲ اکتوبر کی درمیان رات کو شہر سے چھاؤنی کی طرف جلتے ہوئے ہوا۔ جب میں ہوائی اڈے کے پاس پی آئی اے کے نزدیک پہنچا، تو یکے بعد دیگرے دو بم فائر ہونے کی گونج سنائی دی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی ایک بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے جیب دیوار کی آڑ میں کھڑی کر دی اور دھماکوں کی آواز سے اندازہ لگانے لگا کہ ان کا رخ کدھر ہے؟ "قتیش" پر معلوم ہوا کہ شہر کے شمالی حصے سے مارٹر کے گولے ہوائی اڈے اور چھاؤنی کے طبقے حصے پر پھینکے گئے ہیں لیکن مارٹر میں نشانہ باندھنے کے لیے سائٹ (SIGHT) نہ ہونے کی وجہ سے ہم مارٹر گٹ سے دُور جا گئے ہیں۔ اس تجربے سے مقامی انتظامیہ کو یقیناً تشویر لاحق ہوئی، کیونکہ آئندہ سائٹ چال کر کے ہم نشانہ پر بھی پھینکے جا سکتے تھے۔

ڈھاکہ کے مضافات میں تحریک کاروں کے کئی گڑھ تھے، کیونکہ عمل صفائی (SWEEP OPERATION) شہر دن تک چھوڑ دینے کی وجہ سے یہ علاقے باغیوں کے لیے نسبت محفوظ تھے۔ مضافات کے حال کا اندازہ آپ اس واقعے سے لگا لیجیے؛  
"ڈھاکہ سے باہر سدھیر گنج پادرباؤس تھا جہاں سے سبکی کے نام مختلف اطراف کو جاتے تھے۔ تحریک کاروں نے یہ تار کاٹ کر

بھارت نے بھی انہی دلوں اپنی سفارتی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں اسے ہماری نسبت زیادہ کامیابی نصیب ہوئی۔ اس نے پہلے ہی روس سے معاہدہ دوستی کر لیا تھا جو درحقیقت ایک دفاعی معاہدہ تھا جس کی شق نمبر ۶ اور شق نمبر ۷ کے ذریعے بھارت کسی وقت بھی روس سے فوجی مدد طلب کر سکتا تھا۔ اس معاہدے کے دفاعی پہلوؤں کی تصدیق بھارتی جنرل ڈی۔ کے۔ پیلٹ کے مضمون مطبوعہ ہندوستان مانگر، مورچہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۱ء سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے لکھا: اس معاہدے میں فوجی مقاصد بھی پنہاں ہیں۔

جوئل جوں آفتی پر جنگ کے بادل گھر سے ہوتے گئے، اس معاہدے کے تحت بھارت اور روس کے درمیان باہمی تعاون کی رفتار بڑھتی گئی۔ پہلے روس کے نائب وزیر خارجہ نکولائی فرودین کی قیادت میں ایک پانچ رکنی وفد دہلی آیا، پھر روسی فضائیہ کے سربراہ کی سرکردگی میں ایک اور چھ رکنی وفد بھارت پہنچا اور آخر میں روسی وزیر دفاع مارشل گریگوریو خود تشریف لائے اور جنگی تیاریوں کا ہفت نفس جائزہ دیا۔ انہی دنوں یہ خبر بھی سننے میں آئی کہ دہلی میں ایک دفتر رابطہ قائم کیا گیا ہے جس میں روسی ماہرین اور ہوا باز منتقل طور پر متعین کیے گئے ہیں۔

بھارت کا اصل گٹھ جوڑ تو روس سے تھا، مگر اس نے دیگر اہم ممالک کی حمایت کو بھی نظر انداز نہ کیا؛ چنانچہ وزیر داخلہ اندرا گاندھی ۲۴ اکتوبر کو امریکہ، انگلستان اور مغربی جرمنی روانہ ہوئیں۔ ان کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ اگر وہ ان ممالک کو بھارت کی حمایت پر آمادہ نہیں کر سکتیں، تو کم از کم انہیں پاکستان کی مدد کرنے سے باز رکھ سکیں گی۔ وہ یقیناً اپنے مؤخر الذکر مقصد میں کامیاب ہوئیں۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان مسلح تصادم کے روز افزوں امکانات کو ساری دنیا تشویش کی نظروں سے دیکھ رہی تھی، مگر تباہی کو روکنے کے لیے کوئی مثبت اقدامات نہیں کیے جا رہے تھے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چھتیسویں اجلاس میں اندرونی معاملات میں بھارتی مداخلت کے خلاف پاکستان کی شکایت پر غور کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ سرحدوں پر کشیدگی کم کرنے کے لیے وہاں اقوام متحدہ کے مصرن متعین کر دیے جائیں۔ پاکستان نے عالمی برادری کا یہ فیصلہ مان لیا، مگر بھارت نے اس سے صاف انکار کر دیا۔ فی الحقیقت بھارت کو ایسی کوئی تجویز نہ بھاتی تھی جو حالات کو سدھانے کے لیے مفید ثابت ہو سکے، کیونکہ اگر حالات سدھر گئے، تو صدیوں کا سنہز موقع ہاتھ سے نکل جائے گا!

بھی کی پہلانی منقطع کر دی، مرگت کے کام کے لیے مغربی پاکستان سے واپس اکا عملہ منگوا گیا جس میں دو اسسٹنٹ انجینئرز، ایک لائٹ انجنئر، ایک فورڈ مین اور ایک لائن مین شامل تھے۔ یہ جماعت ۳۰ اکتوبر کو کام میں مصروف تھی کہ کئی باہنی نے ان پر دن دھاڑے حملہ کر کے پانچوں کے پانچوں افراد کو موقع ہی پر ہلاک کر دیا۔ ایک کی لاش (اسسٹنٹ فورین بدالسلام) وہ لڑائی کے طور پر ساتھ لے گئے، باقی چار لاشیں اگلے روز پانچ بجے شام مغربی پاکستان روانہ کر دی گئیں۔

دھاکہ اور اس کے مضافات سے صوبے کے باقی حصوں کی طرف بے ہمتے اکثر احساس رہتا کہ ہم دشمن کے علاقے (ENEMY TERRITORY) سے گزر رہے ہیں، لہذا ہر شخص عموماً اپنے ساتھ حفاظتی دستہ رکھتا۔ بعض اوقات اس حفاظتی دستے پر بھی لڑتے ہیں، لڑائی ہوئی مگر لڑائی کا دبا بانی اسے دیکھ کر پروش ہو جاتے۔ اگر کوئی افسر بغیر وعافیت اپنی منزل پر پہنچ جاتا تو وہ سکون کا سانس لینا اور عموماً اسے ایک نمایاں کامیابی کے طور پر اپنے دوستوں سے فخریہ بیان کرتا۔

اندرون صوبہ جرن فوجی کمانڈروں کو نظم و نسق اور امن و امان بحال رکھنے کی ذمہ داری دی گئی تھی، ان کا کام بڑا پیچیدہ اور مشکل تھا۔ ان کے فرائض میں متعلقہ علاقوں میں صنعتی اداروں، جنگوں، تارگروں اور دیگر اہم تنصیبات کی حفاظت کے علاوہ علاقے کو شہر پسندوں سے پاک رکھنا تھا، مگر ان کے وسائل صرف ایک تالیف (چھ سات سو افراد) یا ایک کمپنی (سوڑیڑھ سو افراد) تک محدود تھے۔ وہ اس افرادی قوت کو چھوٹی چھوٹی ٹیموں میں تقسیم کرنے کے مختلف مقامات پر بھیج دیتے تھے۔ ٹیمز کی جتنی چھوٹی ہوتی یا غیروں کے لیے اتنا ہی تڑولہ ہوتی۔ اگر وہ انہیں ٹیموں میں تقسیم کرنے کے بجائے ایک جگہ جمع رکھتے، تو زیادہ تر علاقہ شہر پسندوں کے رحم و کرم پر ہوتا۔

افراد قوت کی اس کی کٹ پورا کرنے کے لیے نیم فوجی ٹیموں سے کئی افراد لیے جاتے جن میں رضا کار (مغربی پاکستان)، پولیس ریجنرز اور ایسٹ پاکستان پولس آرڈر فز شامل تھے۔ جانت جانت کی یہ فہمی کبھی بھی ذہنی اور جسمانی طور پر فوجی یونٹ کی طرح متحدہ فورس نہ بنی۔ ان کا مورال بھی عموماً نیچے ہی ہوتا۔ انہیں عام طور پر فوجی پلاٹوں کے ساتھ ملا دیا جاتا تھا کہ نسبتاً زیادہ تعداد دیکھ کر باہمی جی ہڑت نکال اور خود ان میں بھی اعتماد پیدا ہو۔

اگرچہ اس حکمت عملی سے بعض چوکوں پر متعین فہمی دس سے بڑھ کر تیس ہو گئی مگر طاقت کا سرچشمہ وہی دس افراد ہے جو باقاعدہ فوج سے تعلق رکھتے تھے نیم فوجی ٹیموں کے افراد کو جہاں بھی فوج سے عملہ کوئی ذمہ داری سونپی گئی وہ بالعموم قابل اعتماد ثابت نہ ہوئے کبھی تو کئی باہنی اور بھارتی فوج کی مشترکہ لیٹار سے ان کے قدم اکڑ جاتے اور کبھی وہ محض بزدلی اور کہیں کہیں ملک حرامی کی وجہ سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ (ملک حرامی کی وجہ بعد میں معلوم ہوئی جب پتہ چلا کہ کئی باہنی کے کئی افراد رضا کاروں میں بھرتی ہو گئے تھے)۔ اولاً لڑائی کی ایک مثال ۲۹ اکتوبر کے ایک واقعے سے جاتی ہے جب نواب گنج تھلے پر باغیوں نے حملہ کر دیا۔ وہاں تین ۲۹ رضا کاروں میں سے ۲۲ بھاگ گئے اور سات پکڑے گئے۔ تھلے پر کئی باہنی کا قبضہ ہو گیا۔ اسی طرح کھانگ تھانے میں، ۵۰ بنگالی پولیس مین تھے جنہیں تھانے کی کٹی (آئی ایس ایس سی) نے "سفید" دے کر (ضرر) قرار دیا تھا اور وہ ۴۴ تھلے والے اعلان معافی کے بعد اپنی ملازمت پر بحال کر لیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ مغربی پاکستان پولیس اور ایسٹ پاکستان ریجنرز کے تیس سپاہی تھے۔ ۲۸ اکتوبر کو اس تھانے کے بنگالی سپاہی اچانک بھاگ گئے۔ وہ آئندہ شب واپس آگئے مگر کئی باہنی کی ملک کے ساتھ۔ انہوں نے آتے ہی شہنشاہ مارا اور تیس کے تیس مغربی پاکستان سپاہی شہید کر دیے۔ یوں یہ تھانہ بھی شہر پسندوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اسی طرح کی حوالہ دیتے نوکلی فرید پور، تنگنیل اور دیگر اضلاع میں بھی ہوئیں۔

سرحدوں کے قریب کئی باہنی کا کام اور بھی آسان تھا، کیونکہ وہاں بھارتی آقاؤں کی توہیں سرحد سے ان کی بھر پور اعانت کرتی تھیں اور وقت ضرورت بھارتی فوج سرحدوں کے اندر بھی داخل ہو جاتی تھی۔ بھارتی توہیں کی گولہ باری کا سلسلہ جون میں شروع ہوا اور تخریب کاری کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا، حتیٰ کہ اکتوبر میں شاید ہی کوئی دن گزرتا جب سیکڑوں بھارتی گولے پاکستان کی سرزمین پر نہ پھٹتے۔ سرکاری اندازے کے مطابق ایک دن میں مختلف سائز کے پانچ سو سے دو ہزار گولے برستے۔ اس گولہ باری کے چار مقاصد تھے: (الف) اس سے امن کی حالت کو بتدییج جنگ میں بدلنے کی بھارتی پالیسی میں مدد ملتی تھی جس کا پہلا مرحلہ سرحدوں کو گرم رکھنا تھا۔

(ب) سرحدی علاقوں میں تخریب کاریوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

(ج) سرحد کے ساتھ ایسی جگہوں پر قبضہ ہو جاتا تھا جو باقاعدہ جنگ کے دوران مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔

(د) پاکستان فوج سرحدوں کو نظر انداز کر کے اندرون صوبہ صفائی پر مکمل توجہ نہیں دے سکتی تھی۔

بھارت کو اس حکمت عملی سے روکنے کے لیے پاکستان نے ۲ دسمبر (باقاعدہ جنگ کا اعلان) سے پہلے کوئی ٹوٹر کارروائی نہ کی۔ صرف اخباری اور سفارتی ذرائع سے بیچ بیکار جاری رکھی مگر کسی نے اس پر کان نہ دھرا، چنانچہ بھارت نے سرحدی علاقے میں بہت سے مڑوں ٹیلوں اور جنگی نقطہ نگاہ سے مفید مقامات پر قبضہ کر لیا، جن کا مجموعی رقبہ تقریباً تین ہزار مربع میل بنتا تھا۔ اس کے باوجود صدر ملک کو ۱۲ اکتوبر کی نشری تقریر میں اس بات پر اصرار تھا کہ آپ کی بہادر افواج وطن کی مقدس سرزمین کے ایک ایک انچ کے دفاع کیلئے پوری طرح مستعد اور تیار ہیں؟

قوم کو دھوکا دینے والے کچلی خاں و اشخاص نہ تھے، جنرل نیازی اس میدان میں ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ انہوں نے متنبہ اعلان کیا: اگر جنگ چھوڑی، تو میدان کارزار بھارت کی سرزمین بنے گی۔ اسی جنرلی کیفیت میں وہ کبھی آسمان اور کبھی ملک کے رقبہ کرنے کی دھمکی دیتے۔ میں نے رائے عامہ کے نقطہ نظر سے ان سے گزارش کی کہ آپ ایسی بے پرکی نہ ڈالیں، کیونکہ اس سے بجا توقعات برحق ہیں جنہیں آپ کبھی پورا نہیں کر سکیں گے۔ اس پر انہوں نے کئی کتاب سے شاہجہاد بھلے دھار یا کہ دھوکہ دہی بھی جنگ جیتنے کا ایک گڑبے۔ خواہ شیطانی سہی؟

انہی دنوں (۲۴ اکتوبر) انہوں نے مجھے صبح صبح اپنے دفتر میں طلب فرمایا اور پوچھا:

"تمہارے دوست (جنرل نیازی) نامہ نگار کیا کہتے ہیں؟"

"اُن کا خیال ہے کہ جنگ چھڑنے کو ہے؟"

"میں بھی اس کے لیے تیار ہوں میرے دفاعی انتظامات مکمل ہیں، شہر ہزار تربیت یافتہ افراد پوزیشن میں ہیں۔ میرے ہاتھ بٹے مضبوط ہیں...."

"... مگر فضائیہ اور بحریہ کی حمایت تو محدود ہے؟"

"کوئی بات نہیں، میں نے فضائیہ اور بحریہ کی مدد کے بغیر جنگ لڑنے کا منصوبہ بنایا ہے؟"

"... پھر بھی میرا خیال ہے کہ اندر اور باہر دونوں طرف دشمن ہے اس سے بچنے کے لیے آپ کے پاس وسائل بہت محدود ہیں، مجھے ڈر ہے کہ...."

کس چیز کا ڈر ہے؟ ...

مجھے ڈر ہے کہ جنگ کی صورت میں سرحدوں کے باہر اور سرحدوں کے اندر دشمن کو آپس میں ملنے کے لیے ہماری پتلی سی فحاشی لائن میں سوراخ ڈالنا ہوگا جو زیادہ مشکل نہیں کیونکہ اس کی حیثیت سینڈیچ میں پتلے سے قلعے جیسی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر خطرے کی بات یہ ہے کہ بھارتی شگاف ڈالنے کے لیے سرحد کے جس نقطے کو منتخب کرنا چاہے کہ کتنا ہے، کیونکہ پہل اس کے ہاتھ میں ہے۔ ...

اوتے تہائے خدشات سرسبز بنیاد ہیں۔ ہم افروزی قوت کا حساب لگا کر یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں۔ ہر تہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جنگیں جرنیلوں کے زور سے جیتی جاتی ہیں یا سپاہیوں کی تعداد سے نہیں۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ جرنیلیں کا زور کیا ہوتا ہے؟ صبح وقت پر، صبح مقام پر افواج کی صحیح تعداد کو متعین کرنا۔ یہ جملہ سن کر مجھے لمحے بھر کو یہ احساس ہوا کہ شاید جرنل نیازی کی یہ شہرت کہ انہوں نے زندگی میں کبھی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا مبالغے پر مبنی ہے۔

بڑباننے کی جو طرح جرنل نیازی نے والی وہ ان کے کئی ماتحتوں نے بھی اپنائی۔ میں مشرقی پاکستان کے اندر مختلف دوروں پر جرنل نیازی کے ساتھ گیا۔ ان موقعوں پر ہر جگہ متعلقہ بھرتیوں اور متعلقہ بریگیڈیئر ان کو صورت حال (بریٹنگ) سے آگاہ کرتے۔ بریٹنگ میں عموماً وسائل، مشن اور تقسیم وسائل کے ذکر کے بعد تان اس پر ٹوٹی کہ اگر وسائل محدود اور حالات نامساعد ہیں تو کوئی بات نہیں سنا آپ میرے سیکٹر کے متعلق کوئی فکر نہ کریں۔ جب تک میں یہاں ہوں دشمن کو ناکوں چنے چہرہ اڈوں گا۔ اس طرز گفتگو کو عموماً بھاری اور اس کے برعکس کلمات کو بڑبڑاتی تصور کیا جاتا تھا۔ بجائے ہاں اتنی اخلاقی جرأت ابھی پیدا نہیں ہوئی کہ بڑبڑا کا داغ لے کر کبھی کوئی حق گوئی سے کام لے۔

فوجی کمانڈر اپنے سینئر کمانڈروں کی نظروں میں نوکری بننے کے لیے خواہ کچھ بھی کہتے حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ آٹھ مہینوں کی مسلح شورش کی وجہ سے ہمارے سپاہیوں کی کارکردگی کا نصف تک متاثر ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں نہ صرف انہیں (مارشل لا اور آئی۔ ایٹ ڈیوٹی کی وجہ سے) پیشہ وارانہ تربیت جاری رکھنے کا موقع نہیں ملا تھا، بلکہ ان کو ایک دن کا بھی آرام اور سکون نصیب نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے کئی سپاہیوں کو جوتے، جرابیں اور چارپائیاں تک میسٹرز تھیں۔ نفسیاتی عذاب پر حالت اور بھی دگر گول تھی۔ ان میں سے جو سوچ بوجھ رکھتے تھے وہ یہ کہنے لگے تھے کہ اگر بنگالی ہمارے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہیں تو ان کو طاقت کے زور سے اپنے ساتھ رکھنے کا کیا فائدہ؟ اور جو ان پڑھ سپاہی مغربی پاکستان سے یہ سن کر گئے تھے کہ حق اور باطل کی جنگ ہو رہی ہے اور کافر کو اس کی حرکتوں کا مزہ پکھانا ضروری ہے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کا سامنا تو بنگالی مسلمانوں سے ہے، ہندو تو شاید وفادار ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہ ان تھے کہ یہ کیسا حق و باطل کا معرکہ ہے جس میں مسلمان کو مسلمان کا سامنا ہے۔ ان مادی اور نفسیاتی عناصر نے اکثر سپاہیوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آیا ان حالات میں جان کی قربانی دینا واقعی عظیم کارنامہ ہے جس کے عوض شہادت کا تہہ حاصل ہوگا۔

فوجی معرکہ گئے ہیں کہ کسی بھی کمانڈر کی ۵۰ فیصد قوت اس بات پر صرف ہونی چاہیے کہ اس کے زیر کمان افسرین اور سپاہیوں کی سوچ انداز کیا ہے۔ مگر ہمارے ہاں اس نفسیاتی پہلو کو سرسبز نظر انداز کیا جاتا رہا۔ صرف زیر کمان سپاہیوں کے سر اور اظہاروں کے بٹ گئے برکتھا گیا۔ وہ جانتے تھے مسلح شورش کو کچلنے میں ہمارے ۲۲ افسر ۱۳۴ جوئیر کیشڈ افسر اور ۳۵۵۹ سپاہی جان کی قربانی دے

اندرونی گزبڑ کر دینے کے لیے کارروائی INTERNAL SECURITY

چکے ہیں مگر اس بات کا انہیں کوئی احساس نہ تھا کہ باقی بچنے والوں میں سے کتنے مذہبی طور پر جنگ سے الگ ہو چکے ہیں۔ نفسیاتی اثر اور مواصلات میں کمی کا اثر سپاہیوں کی کارکردگی میں بھی نظر آنے لگا۔ شروع شروع میں وہ بڑی مستعدی اور باجائزاری سے شہرینوں کا کھوج لگانے اور ان کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرتے، مگر بعد میں صرف بوقت ضرورت گشت پر نکلتے اور وہ بھی بے دلی سے۔ پھر ایک وقت (اکتوبر/نومبر) ایسا بھی آیا کہ ہفتہ ہفتہ بھر کوئی فوجی دستہ متعلقہ علاقے میں نظر نہ آتا۔ منورہ تین واقعات حاضر ہیں، نومبر کے شروع میں بھارتی فوج کی نمبر ایک ناگابائلیں کے سپاہی جیسور سیکٹر کے علاقہ دھرماد میں گھس آئے۔ پہلی رات انہوں نے تشریف میں گزار دی۔ دوسری رات بھی چوکس رہے۔ مگر کئی دن اور کئی راتیں گزرنے کے بعد انہیں کسی نے نہ چھڑا، حالانکہ ان کے مورچے سرحد سے ڈیڑھ میل اندر واقع تھے۔ ۱۲ نومبر کو ہمارا ایک فوجی دستہ چاناک اور دھرماد نکلا، تو پتہ چلا کہ ہمارے علاقے میں دشمن مورچے کھوئے بیٹھا ہے۔ اگلی رات ان پر حملہ کر کے انہیں وہاں سے بھگایا گیا اور چار سپاہیوں کو پکڑ لیا گیا جو جنگ کے آخر تک ہمارے پاس رہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ کو میلا کے جنوب میں بلوئیا کے مقام پر پیش آیا جہاں ۱۰ نومبر کو چاناک پتہ چلا کہ اس غمزدار سرحدی علاقے کا آدھا حصہ دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے۔ آگے آگے ملتی باہتی والے مورچہ بند ہیں اور پیچھے ان کی پشت پناہی کے لیے بھارتی سپاہی بیٹھے ہیں۔ انہیں وہاں سے پسپا کرنے کے لیے کئی دنوں تک وسائل اور مالیات اکٹھے کیے جاتے رہے۔ بالآخر انہیں وہاں سے مار بھگایا گیا۔

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ جیسور سیکٹر میں بوسہ رو کے مقام پر ہوا جہاں ۱۳ نومبر کو بھارتی سپاہی گھس آئے۔ انہیں وہاں ہمارا نام و نشان ملا، تو انہوں نے آہستہ آہستہ جموں کو شیر بلیں اور نمبر ۲ سکھ لائٹ بلیں جمع کر لیں۔ ہمیں ان کی موجودگی کا علم ۱۹ نومبر کو ہوا، چنانچہ جیسور سیکٹر کے انچارج بریگیڈیئر محمد حیات کو یہ علاقہ دشمن سے خالی کرانے کا حکم دیا گیا، چنانچہ ۲۲ ایف ایف اور ۱۲ ایف ایف کی دو کمپنیوں سے دشمن پر حملہ کر لیا گیا جو ناکام رہا۔ ہمیں ہماری نقصان اٹھانا پڑا۔ ۲۸ ایف ایف کو اپنا زیادہ تر جنگی ساز و سامان چھوڑ کر اپنی جان بچانا پڑی۔ اس حادثے سے ایک طرف یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارے سپاہیوں کے پاسے ثبات میں لغزش آگئی ہے اور دوسری طرف یہ واضح ہو گیا کہ دشمن نے شوقیہ مورچے نہیں کھوئے اس کا ارادہ وہیں جمے رہنے کا ہے، چنانچہ اسے پسپا کرنے کے لیے ایک اور کوشش کی گئی جس کے لیے ڈویژن کے زیر کمان ۲۱ پنجاب (آر اینڈ ایس) اور ۴ پنجاب کو مستعار لیا گیا۔ انہیں دو جماعتوں الف اور ب میں تقسیم کر کے بالترتیب لیفٹیننٹ کرنل امتیاز ڈولائی اور لیفٹیننٹ کرنل شریف کے سپرد کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں توپخانے کی ایک فیلڈ جرنٹ اور ٹینکوں کا ایک ہکا ڈن بھی دیا گیا۔

مذکورہ بالا فوج کے ساتھ منصوبے کے مطابق ۲۱ نومبر کو صبح چھ بجے حملے کا آغاز ہوا۔ شروع میں پیش قدمی کی رفتار حوصلہ افزا رہی، لیکن جوں ہی ہمارے فوجی دستوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے وہاں چھبے ہوئے دشمن کے ٹینک ان پر آگ برسانے لگے ساتھ ہی سرحد پار سے دشمن کی توپوں کے گولے بھی کھل گئے۔ ہمیں اتنی مزاحمت کی توقع نہ تھی، کیونکہ ہمارے ماہرین کی نظر میں اس علاقے میں ٹینک نہیں آسکتے تھے۔ ہم بے خبری میں مارے گئے۔ آٹھ وقت میں پاک فضائیہ سے مدد طلب کی گئی جو فوراً پہنچ گئی، مگر دوسرے بھارتی طیارے بھی فضا میں آ گئے۔ دشمن کا پلہ بھاری رہا۔ ہمارے دو طیارے اور چھ ٹینک تباہ ہو گئے۔ دشمن اپنی جگہ پر ڈنڈا مارا۔ حملہ ترک کر دیا گیا، البتہ دشمن کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے اس کے سامنے فوجی دستے متعین کر دیے گئے۔ دشمن نے اپنی ہی جیوبی یا مصلحت

کی وجہ سے ۲ دسمبر تک مزید پھیلنے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہ کی جس سے یہ ڈھنڈورا پیٹنے کا موقع مل گیا کہ ہم نے ۲ دسمبر تک دشمن کو دیں روکے رکھا۔

دشمن کو دیں بند رکھنے کے لیے اس کے تینوں جانب جو حصار باندھا گیا وہ خالص فوجی نقطہ نظر سے نامناسب تھا، کیونکہ اس حصار بندی میں جیسور سیکٹر میں متعین ہماری فوج کا بیشتر اور طاقت و حصہ صرف ہو گیا تھا جس سے سرحد کے باقی حصوں کے دفاع کے لیے بہت کم نفری رہ گئی تھی۔ اگر دشمن حصار پر مامور فوج کو متحالی پھیر چھاڑ میں مصروف رکھ کر کسی اور حصے پر حملہ کر دیتا تو اس کا کام بہت آسان ہو جاتا، مگر دشمن نے ہماری اس کمزوری سے فائدہ نہ اٹھایا کیونکہ اس وقت تک بھارت کے مقاصد محدود تھے۔ وہ صرف مختصر وقت پر اور مناسب حالات میں بھرپور پیش قدمی کر کے مشرقی پاکستان کو نگھٹا چاہتا تھا۔ وہ قبل از وقت اپنے ارادوں سے پردہ سرکھانا نہیں چاہتا تھا۔

۱۱ نومبر کو بوسہ کے مقام پر ہمیں جو واقعہ پیش آیا اسے جنرل نیازی کے ہیڈ کوارٹر (ایسٹرن کمانڈ) نے بڑھا پڑھا کر پیش کیا۔ میں ان دنوں مغربی پاکستان آیا ہوا تھا میں نے راولپنڈی میں یہ خبر سنی کہ دشمن نے جگ طیلوں بکتر بند گاڑیوں اور توپخانے کی مدد سے بوسہ (جیسور) پر حملہ کر دیا ہے، حالانکہ حقیقت حال یہ تھی کہ دشمن ایک ہفتہ پہلے سے وہاں موجود تھا اور ہم نے اسے ہٹا کر کی کوشش کی تھی جس میں ہم ناکام رہے تھے۔

اسی ہفتے (۲۰ نومبر تا ۲۵ نومبر) ایسٹرن کمانڈ نے واویلا کیا کہ بھارت نے چار اور مقامات یعنی ضلع سلٹ میں ذکی گج اور انگرام ضلع دیناج پور میں ملی اور ضلع رگپور میں پانچا گڑھ پر بھی بھرپور حملہ کر دیا ہے۔ درحقیقت دشمن سرحد کے ساتھ ساتھ چند اہم مقامات پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ باقاعدہ جنگ چڑھنے پر اسے پیش قدمی کرنے میں سہولت ہو، مگر ایسٹرن کمانڈ نے اسے بھرپور جنگ کا آغاز قرار دیا تاکہ ایک تو میسور میں ۳۸ ایف ایف کی طرح سلٹ اور رگپور میں متعلقہ فوجی یونٹوں کی ہپائی کا جواز مل سکے، دوسرے جی ایچ کیو پر واضح ہو جائے کہ ٹائیگر نیازی کتنے دباؤ کا کس پامردی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

جیسور سلٹ اور رنگ پور سیکٹر میں ان جھڑپوں کے بعد جنرل نیازی وہاں تشریف لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے پسا ہونے والی یونٹوں کو بڑا بھلا کہا اور یہ فیصلہ صادر فرمایا: آئندہ کوئی فوجی دستہ یا یونٹ اس وقت تک پسپا نہیں ہوگی جب تک کہ اس کی تین چوتھائی نفری زخمی یا شدید زخمی نہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں بھی پسپائی جی اوسی کی ذاتی اجازت کے بغیر نہیں ہوگی (بعد میں ان احکامات کی توثیق تحریری طور پر بھی کی گئی)۔

جنرل نیازی ۲۲ نومبر سے ۲ دسمبر تک تقریباً روزانہ سرحدی علاقوں کے دورے پر جاتے رہے۔ مجھے یاد ہے ۲۷ نومبر کو وہ بقی تشریف لے گئے جہاں غیر ملکی صحافیوں کی ایک جماعت بھی پہنچی ہوئی تھی۔ یہ جماعت درحقیقت سرکاری طور پر وہاں بھیجی گئی تھی تاکہ بھارتی جارحیت کی تازہ واردات دیکھ سکے (چند روز پہلے بھارتی حملے کے دوران دشمن کا ایک ٹینک تباہ ہو کر جارس علاقے میں رہ گیا تھا، وہیں ایک غیر ملکی اخباری کانفرنس شروع ہو گئی جو تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی۔ اخباری کانفرنس کے آخر میں ایک صحافی نے پوچھا:

آپ کے خیال میں بھرپور جنگ کب شروع ہوگی؟

جنرل نیازی نے ہنسنے کی پلیٹ سے اپنا سر اٹھاتے ہوئے فرمایا:

میرے لیے بھرپور جنگ تو پہلے ہی شروع ہو چکی ہے! ان کے اس جواب پر کسی کو اعتبار نہ آیا، کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ اگر بھارت نے فضائیہ، ٹینک اور توپ خانے سے بھرپور جنگ شروع کر دی ہوگی تو جنرل نیازی تین پلیٹ ہین ٹکوں کے بعد اخبار نویسوں سے پچھلے بازی کرنے کے بجائے کسی تہہ خانے میں بیٹھ کر رو رہے ہوتے۔

صحافیوں کی یہ جماعت جب تباہ شدہ بھارتی ٹینک دیکھنے روانہ ہوئی تو جنرل نیازی نے ڈھاکہ روانگی کا ارادہ کیا۔ انہیں ہرگز خدشہ نہ تھا کہ ان کے پہلی کا پٹر پر کہیں بھارتی جیٹ نہ چھپٹ پڑیں۔ وہ ہنستے کھیلتے ایک نوجوان خاتون صحافی کو پہلی کا پٹر میں بٹھا کر ڈھاکہ لے آئے تاکہ فلیگ اسٹاف ہاؤس میں اسے رات کو خصوصی انٹرویو دے سکیں۔



حصہ سوئم  
جنگل

# شکست کی تیاری

اگرچہ جنرل نیازی نومبر کے آخر میں اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے دعویٰ کر چکے تھے کہ وہ بھارت سے بھرپور (ٹوٹل) جنگ لڑ رہے ہیں، مگر میدان جنگ میں ان کی سپاہ کی تنظیم و ترتیب سے اس کی نفی ہوتی تھی۔ ان کے زیرِ کمان تمام فوج چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر ۷۰ کلومیٹر سرحدوں کے ساتھ ساتھ بکھری ہوئی تھی جو تخریب کاروں، شہر سپدوں اور سرحدی جھڑپوں کے لیے تو فوڑوں ہو سکتی تھی مگر بھرپور جنگ کے لیے نہیں کیونکہ اس کے تقاضے کچھ اور تھے۔ یہ تقاضے کیا تھے اور ان سے عہدہ براہِ رہنے کے لیے کونسی دفاعی حکمت عملی مناسب تھی، اس کا جائزہ لینے سے پہلے آئیے اس خطہ زمین پر ایک نظر ڈال لیں جس کا دفاع جنرل نیازی کے سپرد تھا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کوئی ۱۰۰ کلومیٹر فاصلہ تھا مشرقی بازو میں اطراف سے بھارتی علاقے میں گھرا ہوا تھا۔ پورے جنوبی طرف علیحدگی تھی جس پر بھارتی بحریہ کا غلبہ تھا اور وہ آسانی اس کی ناکہ بندی کر سکتی تھی۔ صرف جنوب مشرقی سرحد پر ایک چھوٹی سی پٹی تھی جو برما کی طرف کھلتی تھی، مگر یہ علاقہ پہاڑوں اور جنگلوں کی وجہ سے دشوار گزار تھا۔ یہاں میزو قبائل اور جنگی درندوں کا دور دورہ تھا۔ اس علاقے میں چوری چھپے تخریب کاری، شہر آگیزی یا محدود گوریلا کارروائی تو ممکن تھی مگر روایتی انداز میں ٹینکوں اور توپوں کی جنگ بعید از قیاس تھی۔

باقی صوبہ زیادہ تر آبی نوعیت کا تھا جسے دریائے جہنا، دریائے گنگا اور دریائے مگھنا نے چار واضح حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر حصے میں چھوٹے چھوٹے دریا، نالے اور جمیلیں تھیں جنہیں فضا سے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی ماہر فنکار نے مختلف لکیروں، چوکوروں اور ٹکڑوں سے ایک شاہکار ترتیب دیا ہے۔ ان دریاؤں اور نالوں سے جو زمین بچی تھی اسے درختوں، فصلوں اور جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں دو بڑے جنگل تھے جو سندربن (جمبورو کے قریب) اور ماہو پور (انگلینڈ کے قریب) میں واقع تھے۔ ان میں اچھی خاصی فوج پناہ لے سکتی تھی اور اسلحہ اور ایندھن کے بڑے ذخائر آسانی سے چھپائے جاسکتے تھے۔

مشرقی پاکستان میں موسم کا مزاج متلون تھا۔ سردیاں اور گرمیاں مختصر اور برسات طویل ترین۔ بارشیں عموماً اپریل میں شروع ہو کر اکتوبر تک جاری رہتیں مگر سرکاری لحاظ سے موسم برسات مئی سے ستمبر تک شمار ہوتا تھا۔ شاید ہی کوئی موسم برسات گزرا ہو جس میں سیلاب کی لیغار نہ ہوتی ہو۔ عموماً ہر سال وسیع علاقہ زیرِ آب آ جاتا اور کشتیوں کے علاوہ آمد و رفت کے تمام ذرائع مضبوط ہو کر رہ جاتے۔ سیلاب اترنے کے بعد بھی خاصے خاصے عرصے تک زمین اتنی سیلی سیلی رہتی کہ وہاں فوجی مقاصد کے لیے وسیع پیمانے پر ٹرکوں یا ٹینکوں کی نقل و حرکت ناممکن سمجھی جاتی۔

زمین کی یہ دیوانہ مانی اور برسات کی یہ فراوانی اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ بھارتی حملے کے لیے بہترین مہینے دسمبر سے مارچ ہوں گے۔ بھارت نے ہاتھ پر ہاتھ دھرے ان مہینوں کا انتظار کرنے کے بجائے اس عرصے کو بہت مفید (اس کے نقطہ نظر سے طریقے سے گزارا۔ اس نے ایک طرف ہماری افواج کو ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا دینے کے لیے ملتی باہنی کو استعمال کیا اور دوسری طرف اپنی عسکری قوت کو زیادہ منظم اور موثر بنانے پر پوری توجہ دی۔

آئیے ایک نظر بھارت کی اس عسکری قوت پر بھی ڈال لیں جس کا ہمیں مشرقی پاکستان میں سامنا تھا۔ بھارت کی آٹھ ڈویژن تازہ دم فوج مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر صف آرا تھی (دو ڈویژن چین کی طرف متعین تھے، مگر بوقت ضرورت ان کا رخ بھی مشرقی پاکستان کی طرف موڑا جاسکتا تھا)۔ ان آٹھ ڈویژنوں میں سے دو مغربی بنگال میں تھے تاکہ وہ حکم ملنے پر جمشید پور کی طرف پیش قدمی کر سکیں۔ یہ ۲ کور کے ماتحت تھے۔ ہمارے شمال مغربی علاقے پر چڑھائی کے لیے تین ڈویژنوں پر مشتمل ۳۳ کور تھی، عین شمال میں ۱۰ اکویون کیڈیشن زون تھا جو ایک لڑاکا ڈویژن کے طور پر لڑنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی کمان ایک میجر جنرل کے سپرد تھی۔ رہ گئی مشرقی سرحد تو وہاں بھارت کے تین ڈویژن پڑے تھے جن کی کمان ہم کور کے حوالے تھی۔ ہر ڈویژن کے ساتھ جو ٹینک اور توپچانہ ضروری ہوتا ہے، وہ بھی موجود تھا۔

اس کے علاوہ بھارت کے پاس رسالے اور آرٹلری کی کئی رجمنٹیں تھیں جن کی تفصیل یہ ہے:

- (الف) فیلڈ رجمنٹ (توپچانہ) : ۸ توپیں (بعد میں ۹۰ کر دی گئیں)  
(ب) میڈیم رجمنٹ (توپچانہ) : ۱۰ توپیں (بعد میں ۱۲ کر دی گئیں) ان توپوں میں روسی ساخت کی ۱۳۱ ملی میٹر دھانے والی توپیں بھی شامل تھیں جو ۳۰ کلومیٹر تک مار کرتی تھیں۔

(ج) ٹی ۵۵ ٹینک : ایک رجمنٹ

(د) پی ٹی ۶ ٹینک : ایک رجمنٹ اور دو ہکواڈرن

(۵) شرمن ٹینک : ایک رجمنٹ

ہمارے ٹینک رات کو استعمال نہیں ہو سکتے تھے، مگر بھارت کے اکثر ٹینکوں میں انفرا ریڈ نشیے نصب تھے جن کی مدد سے انہیں تاریکی میں بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح اس کے بعض ٹینک پانی میں تیز کر کا ڈب غور کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں بھارت کے پاس معقول تعداد میں کبوتر بند گاڑیاں تھیں جن کی مدد سے بیک وقت دو پلٹنوں کی نفری گولیوں کی بجھاؤ سے محفوظ رہ کر میدان جنگ میں نقل و حرکت کر سکتی تھی۔

بھارت کی فضائی قوت اسی ہکواڈرنوں (ایک ہکواڈرن میں عموماً ۸ اٹالے ہوتے ہیں) پر مشتمل تھی جس میں بگ ۲۱، کینبرا (دبیار)، ایس لو (لڑاکا بمبار) اور سینٹ (زمینی ٹانگ دینے والے پٹیلے شامل تھے۔ ان طیاروں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے بھارت نے مشرقی پاکستان کے ارد گرد ہوائی اڈوں کا جال بچھا دیا تھا۔ دریاؤں کی رکاوٹ عبور کرنے کے لیے بار بار دریا پار سے اوپر ہیلی کاپٹر مہیا کیے گئے تھے۔

لے بھارتی توپچانے کی ایک رجمنٹ میں عموماً ۱۰ توپیں ہوتی ہیں جن کے ٹینکوں کی رجمنٹ ۵۴ ٹینکوں (چار ہکواڈرنوں) پر مشتمل ہوتی ہے۔

بھارت کی بحری قوت میں سب سے قابل ذکر اس کا (AIRCRAFT CARRIER) یعنی طیارہ بردار بحری بیڑہ تھا جسے "وکرانت" (VIKRANT) کہتے تھے۔ اس میں دیکھ بھال کرنے والے چھوٹے اے، ہم اسمذری عقب (لڑاکا بمبار) اور آبدوزوں کے غلاف استعمال ہونے والے تین ہی ہاک طیارے شامل تھے۔ اس بیڑے کی حفاظت کے لیے معقول تعداد میں ڈسٹرکٹر (DESTROYER) اور فریگٹ (FRIGATES) تھے۔ اس کے علاوہ بھارتی بحریہ کے پاس چار بڑے جنگی جہاز (ریاس برہم پترا، کامورتا اور کرماراتی)، دو آبدوزیں (نندھاری اور کالواری)، ایک ٹرینیں صاف کرنے والا جہاز اور پانچ مسلح کشتیاں (رگن لوٹ) تھیں۔

اس بری، بحری اور فضائی قوت کے علاوہ بھارت کے پاس ایک چھاترہ بردار بریگیڈ، تین بریگیڈ گروپ، بارڈر سیکورٹی فورس کی ۲۴ پلیٹنیں اور ایک لاکھ "ملکتی باہنی" تھی۔ بھارتی قوت میں، میں نے اس بنگالی آبادی کا ذکر نہیں کیا جو کسی پلٹن یا "باہنی" میں بھرتی ہونے کے بجائے اپنے اپنے کھنڈوں میں تھی مگر اس کی ہمدردیاں بھارت اور اس کی لڑاکا ملتی باہنی کے ساتھ تھیں۔

اوپر بھارت کی صرف اس عسکری قوت کا ذکر کیا گیا ہے جو خالصتہً مشرقی پاکستان کے محاذ پر متعین تھی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان کے پاس (مشرقی پاکستان میں) صرف تین انفنٹری ڈویژن تھے جو ضروری ساز و سامان سے بھی پوری طرح لیس نہ تھے۔ پاکستان ایئر فورس کا صرف ایک ہکواڈرن ڈھاکہ میں تھا جس میں ۱۶ اینی بیٹلرے تھے۔ ہوائی اڈہ بھی ایک ہی تھا جس کے خراب یا تباہ ہونے کی صورت میں سارے جہاز بیکار ہو سکتے تھے۔ ڈھاکہ چھاؤنی کے شمالی جانب زیر تعمیر اڈہ بھی قابل استعمال نہ ہوا تھا۔ اگر اس آٹے وقت میں مزید طیارے وہاں بھیج بھی دیے جاتے تو ہوائی اڈوں کی کمی کے پیش نظر ان کی افادیت مشکوک ہو کر رہ جاتی۔ ہمارا کل بحری سرمایہ ایک ریئر ایڈمرل اور چار مسلح کشتیوں (رگن لوٹ) پر مشتمل تھا۔ یہ کشتیاں پندرہ بیس سال پہلے سنگاپور کی روک تھام کے لیے خریدی گئی تھیں۔

یہ بھی ہماری عملی دفاعی پوزی، اس میں اضافہ کرنے کے لیے رضا کاروں، مجاہدوں، ہکواڈرن اور ایئرلٹ پاکستان سول آرڈر سرنارای بی سی لے ایف) کی نیم عسکری نفری کھٹی کی گئی جس کی کل تعداد ۳۷ ہزار بنتی تھی کسا جاتا ہے وسائل کی کمی کی وجہ سے پورا کر دیتا ہے مگر اس میدان میں بھی ہماری عزت جزل نیازی جیسے آدمی کے ہاتھ میں تھی۔

لے بنگ بھارت کے وسائل ہم سے کئی گنا زیادہ تھے، مگر غور طلب بات یہ تھی کہ وہ انہیں کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا؟ دوسرے لفظوں میں بھارت کے عوام، کیا تھے؟ اگرچہ آج یہ سوال لایعنی معلوم ہوتا ہے کہ بونگ جنگ کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے، مگر ان دنوں اس سوال کا جواب اتنا واضح نہ تھا۔ بہت سے فوجی دماغ اس ٹوہ میں بیٹھے تھے کہ دشمن کے ارادوں کو قبل از وقت بھانپ کر دفاعی اقدامات کیے جائیں۔ ان کی سوچ بچار کا پچھڑا یہ تھا کہ بھارت مشرقی پاکستان کے ایک حصے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تاکہ اسے اپنے علاقے میں شمولیت کا نام دے کر اس پر بنگالی پناہ گزینوں کو آباد کر دے۔

اس بھارتی مقصد کو غور نہ کر کے مشرقی پاکستان میں موجود فوج کو سارے صوبے خاص طور پر سرحدی علاقوں میں بکھیر دیا گیا تاکہ ملتی باہنی یا اس کے سرپرست کسی قابل ذکر خطہ زمین پر قبضہ نہ کر لیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے سپاہیوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھارت کو آٹھ ماہ تک اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا، مگر کیا واقعی بھارت اسی مقصد کے لیے کام کر رہا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ بھارت سارے مشرقی پاکستان کو ٹھپ کرنے کے لیے پلے تھا اور سرحدی علاقے میں چھوٹی چھوٹی جنگوں پر قبضہ کرنے کی بھارتی کوشش اس کے عظیم منصوبے کی پہلی کڑی تھی۔

بھارتی عوام کا غلط اندازہ لگانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ جنرل نیازی پر یا جی ایچ کیو پر؟ اس سوال کا خلاصہ جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات کا کھوج لگایا جائے کہ جی ایچ کیو نے جنرل نیازی کو "بشن" کیا دیا تھا یہ بات صیغہ راز میں نہیں کہ ایٹرن کمانڈر مشرقی پاکستان کے دفاع کا فرض سونپا گیا تھا اور یہ بات ایٹرن کمانڈر کے کمانڈر (جنرل نیازی) پر چھوڑ دی گئی تھی کہ وہ اس بشن کو پورا کرنے کے لیے دشمن کے عوام کا اندازہ لگائے اور انہیں ناکام بنانے کے لیے فوجی اسٹریٹجی وضع کرے۔

مشرقی پاکستان کے مخصوص حالات میں بہترین فوجی اسٹریٹجی کیا تھی؟ اور جنرل نیازی نے کس اسٹریٹجی کو اپنایا؟ ایسے اس مسئلے پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں مشرقی پاکستان کے دفاع کے چار طریقے تھے،

اول: تمام تر توجہ دھاک پر مرکوز کر دی جائے اور جیتنے و نائل دستیاب ہیں انہیں استعمال میں لا کر دھاک کے گرد دفاعی حصار بنادیا جائے جغرافیائی لحاظ سے یہ دفاعی حصار تین ٹپے دریاؤں (جنا، برہم پتر اور سیگنہ) کے کناروں پر استوار کیا جاسکتا تھا۔ اس حکمت عملی کے دو واضح نقصان تھے۔ ایک یہ کہ ہر چیز اس دفاعی حصار پر مرکوز کرنے سے مشرقی پاکستان کا بیشتر حصہ جس میں جیسور، کشتیا، راجشاہی، لوگرہ، رنگ پور، سلط، گومیلا اور چٹاگانگ شامل تھے، کسی مزاحمت کے بغیر دشمن کے قبضے میں چلا جاتا۔ دوسرا یہ کہ اس دفاعی حصار کو ٹوڑنے کے لیے بھارت کو شکل چار ڈویژن فوج درکار ہوتی اور وہ باقی چار ڈویژن آسامی مغربی مہاراشٹر منتقل کر دیتا جہاں ہمیں زندگی میں پہلی بار (اور شاید آخری مرتبہ) قریب قریب عدوی برابری حاصل ہوتی تھی۔ یہاں یہ بات محلے بھر کی کہ ہم قیام پاکستان سے کہتے آئے تھے کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہوگا، اس لیے مغربی مہاراشٹر بھارتی فوج کی بھرمار اس قومی اسٹریٹجی میں رکاوٹ کا باعث بن سکتی تھی۔

دوم: اپنے سارے وسائل سرحدوں کے دفاع پر لگا دیے جائیں اور دباؤ پڑنے پر بوقت ضرورت آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا جائے حتیٰ کہ ہم دھاک کے ارد گرد جمع ہو جائیں۔ بظاہر ایک معقول تدبیر تھی لیکن دو وجوہ نے اسے ناقابل عمل بنا دیا تھا۔ ایک تو بھارت کی فضائی برتری کی وجہ سے دن کے وقت پسپا ہونا مشکل تھا، دوسرے رات کو جگہ جگہ گئی باہمی کا سامنا کرنا پڑتا۔ سوم: اس مکتبہ فکر کے مطابق مشرقی پاکستان کا بہترین دفاع اس میں تھا کہ کسی ایک جگہ کو آخری دم تک بچانے کے بجائے متحرک جنگ کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اس نقطہ نظر میں قباحت یہ بھی کہ اس بھاگ بھاگ میں بھارتی فوج اور مکتی باہنی کے تعاون سے زمین ہمارے لیے تنگ ہو سکتی تھی۔ صوبے کے اندر اور باہر مخالفت کے پیش نظر یہ اسٹریٹجی مناسب نہ تھی۔

چہارم: اس طریقہ کار کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ سرحدی شہروں خصوصاً ان شہروں کو جو حملہ آور کے راستے میں پڑتے تھے "دفاعی قلعوں" میں تبدیل کر لیا جائے۔ ان میں طویل لڑائی کے لیے راشن، ایندھن اور دیگر جنگی سامان جمع کر لیا جائے اور ارد گرد دوسرے کھود لیے جائیں تاکہ اوپر سے دشمن جتنی ضرر بھی لگاتا جائے، انہیں بلا نقصان سہا جائے اور وقت ضرورت اپنی دفاعی قلعوں کو بنیاد بنا کر دشمن پر حملہ بھی کیا جائے۔ یہ طریقہ کار اگرچہ بہت پرانا اور کسی حد تک فرسودہ تھا، مگر موجودہ حالات میں اس میں دو فوائد تھے۔ ایک یہ کہ اس طرح وسیع علاقہ کسی مزاحمت کے بغیر دشمن کے چلے کرنے کے بجائے اس کا ہلکا جگہ دفاع کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے ناکافی وسائل کو مخصوص مقامات پر جمع کر کے مؤثر دفاع کی صورت پیدا کر سکتے

تھے۔ خیال تھا اول تو دشمن کو ہر دفاعی قلعہ فتح کر کے آگے بڑھنا پڑے گا جو آسان کام نہ ہوگا اور اگر اس نے سے بغیر مفتوح "چھوڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی، تو اسے ہر وقت پیچھے سے حملے کا ڈر رہے گا تیسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ ہر قلعہ کو محصور کر کے آگے بڑھے گا جس کا مطلب ہوگا اسے ہر قلعے کو محصور کرنے کے لیے معقول تعداد میں فوج تعینات کرنا پڑے گی اور پیش قدمی کے لیے مزید بفری درکار ہوگی یعنی دشمنی فوج لگانا پڑے گی۔ اس حکمت عملی کو فوجی جبراً عموماً "ہار کے چھوڑے" اور "آہرن" سے تشبیہ دیتے ہیں یعنی چھوڑا حملہ کرنے والے کا اور آہرن حملہ سنے والا۔ اس کی حمایت میں عوامی دلیل دی جاتی ہے کہ چھوڑا چلانے والے بازو تھک جاتے ہیں مگر "آہرن" نہیں ٹوٹتی۔

مذکورہ بالا طریقوں میں سے جنرل نیازی نے طریقہ نمبر ۴ منتخب کیا اور سرحد کے قریب جدید جدید شہروں کو دفاعی قلعوں میں بدل دیا۔ ان شہروں میں جیسور، جندیہ، لوگرہ، رنگ پور، جمال پور، نمین سنگھ، سلط، بہار بازار، گومیلا اور چٹاگانگ شامل تھے۔ ہر دفاعی قلعے میں ۴۵ دن کا راشن اور ۹۰ دن کا گولہ بارود جمع کر لے گا کیا گیا۔ ان کے علاوہ بعض شہروں اور قصبوں کو مضبوط مقام (STRONG POINT) کا درجہ دیا گیا۔ یہ مقامات عام شہروں سے زیادہ اور دفاعی قلعوں سے کم دفاعی صلاحیت رکھتے تھے۔

ان دفاعی قلعوں پر مبنی ایٹرن کمانڈ نے جو فوجی اسٹریٹجی وضع کی، اُس کے نمایاں خدوخال یہ تھے:

(۱) سرحدی چوکیوں پر متعین ہمارے فوجی اُس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک کہ مقامی جنرل آفیسر کمانڈنگ انہیں پسپا ہونے کا حکم نہیں دیتا۔

(ب) پسپا ہوتے ہوئے حتیٰ الامکان مزاحمت کی جائے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت میں کم سے کم زمین ہاتھ سے جائے، اور (ج) بالآخر مبنی فوج واپس آکر دفاعی قلعوں میں موجہ بند ہو جائے اور آخری وقت تک لڑتی رہے۔

جنرل حمید (چیف آف ٹاٹ) جب دھاک آئے تو انہیں اس منصوبے کی تفصیلات پیش کی گئیں۔ انہوں نے اصولی طور پر اتفاق کیا۔ بعد میں یہ منصوبہ جی ایچ کیو روانہ کیا گیا جہاں مشیہ وارنہ نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیا گیا۔ اس منصوبے کو درج ذیل تصریحات کے ساتھ منظور کر کے ایٹرن کمانڈ کو نوادیا گیا:

(۱) راجشاہی کے سامنے سرحد پار انگلش بازار پر حملے کی گنجائش پیدا کی جائے۔

(ب) فرخاند کو تباہ و برباد کرنے کے لیے چھاپہ مار فوج کے اقدامات کو منصوبے میں شامل کیا جائے۔

(ج) چٹاگانگ میں ایک پلٹن ضرور رکھی جائے تاکہ وہ سمندری راستے سے آنے والی کسی کمک کو وصول کر سکے۔

(د) دھاک کو مشرقی پاکستان کے دفاع کی کئی سمجھا جائے۔

ایٹرن کمانڈ نے حسب لکھ ان تصریحات کو اصلی پلان میں شامل کر لیا اور جی ایچ کیو کو تعمیل ارشاد سے آگاہ کر دیا۔ اب یہ اندازہ لگانا باقی تھا کہ دشمن کے حملے کا رخ کس طرف ہوگا یعنی کس جانب سے وہ پوری طاقت سے حملہ کرے گا اور کس طرف سے اضافی کوشش کرے گا۔ اس رخ کا اندازہ کرنا بہت ضروری تھا، کیونکہ اسی کے مطابق دفاعی فوج کو بھی متعین کرنا تھا۔ اس سلسلے میں فوجی رواج کے مطابق مختلف مفروضوں (مفروضہ نمبر ایک، مفروضہ نمبر دو، مفروضہ نمبر تین اور مفروضہ نمبر چار) کو زیر بحث لایا گیا اور اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ اصلی اور بڑا حملہ فلک کی جانب جیسور سیکٹر میں ہوگا اور ذیلی اقدام (مشرق میں) تری پور کے علاقے سے گومیلا سیکٹر میں ہوگا۔ اسی سوچ کے مطابق تمام وسائل کو حسب ذیل طریقے سے بانٹ دیا گیا:

(۱) جلیسور سیکٹر

اس سیکٹر میں ایک ڈویژن (نمبر ۹) تھا جس کی کمان میجر جنرل محمد حسین انصاری کے سپرد تھی۔ اس ڈویژن میں دو بریگیڈ تھے۔ ۱۰۰ بریگیڈ اور ۵۰ بریگیڈ۔ ان کے ہیڈ کوارٹر بالترتیب جلیسور اور جندہ میں واقع تھے۔ پیدل فوج کے علاوہ اس ڈویژن کے پاس توپخانے کی دو رجمنٹیں اور (دید بانی اور ملک رسائی کے لیے) ایک آرائیڈ ایلین بائیلین تھی۔

(۲) شمالی بنگال

اس محاذ پر میجر جنرل نذیر حسین کا سولہواں ڈویژن تھا جس کا ہیڈ کوارٹر ٹاٹور میں تھا۔ اس ڈویژن میں بھی دو بریگیڈ تھے۔ ایک بریگیڈ (۲۳) رنگ پور میں تھا اور دوسرا (۲۵) بوگرہ میں۔ اس ڈویژن کے پاس رسالے اور توپخانے (فیلڈ) کی ایک ایک رجمنٹ اور ہلکی توپوں (مارٹر) کی دو بیٹریاں تھیں۔

(۳) مشرقی سرحد

مشرقی سرحد کا دفاع میجر جنرل عبد المجید قاضی کے سپرد تھا جو ۱۴ ڈویژن کی کمان کر رہے تھے۔ اس ڈویژن کا ایک بریگیڈ (۲۷) مہمن سنگھ میں تھا اور دوسرا (۲۱۲) سلٹ میں، اس کے علاوہ جنرل قاضی کے پاس توپخانے کی ایک رجمنٹ، مارٹر توپوں کی دو بیٹریاں اور چار ٹینک تھے جنرل قاضی کا مستقل ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ تھا۔

(۴) چٹاگانگ سیکٹر

اس سیکٹر کا دفاع بریگیڈیئر عطا کے سپرد تھا جس کے پاس ۹۳ بریگیڈ تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر چٹاگانگ میں واقع تھا۔ مذکورہ بالا تقسیم کے بعد اندازہ ہوا کہ زمین زیادہ ہے اور سپاہی تھوڑے، چنانچہ ان کی کمی کو پورا کرنے کے لیے نیم عسکری جمعیت یعنی محاذوں، رضا کاروں، سکاؤٹوں، پولیس اور ای پی سی اے ایف کی نفی کو بھی متعلقہ جرنیلوں کے حوالے کیا گیا تاکہ وہ اپنے اپنے دفاع کو مزید "کھنکھن" کر سکیں۔ جنگ کے دوران جب دباؤ پڑا، تو ہماری دفاعی لائن میں بھی نفی سب سے کمزور نکلی۔

جب جنگ کے بادل گہرے ہونے لگے تو جنرل نیازی نے دشمن کو ڈھاکہ دینے کے لیے دو عبوری ڈویژن ہیڈ کوارٹر اور چار عبوری بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کھڑے کر دیے۔ ایک ڈویژن ہیڈ کوارٹر کا انچارج ای پی سی اے ایف کے ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل جمیل کو بنایا گیا جو پہلے ہی ڈھاکہ میں تھے اور دوسرا ہیڈ کوارٹر میجر جنرل رحیم خاں کی قیادت میں چاند پور روانہ کر دیا گیا۔ جنرل رحیم ان دنوں جنرل نیازی کے نائب کے طور پر ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

۴ ڈویژن کا ۲۷ بریگیڈ جو مہمن سنگھ میں مقیم تھا، اسے مشرقی سرحد پر ہر بار بازار متعلق کر دیا گیا، مگر اس کی ایک پلٹن مہمن سنگھ میں روک لی گئی۔ ایک اور پلٹن لا کر ایک نیا بریگیڈ (ذریعہ قیادت بریگیڈیئر قادر) تشکیل دیا گیا۔ جنرل جمیل کے پاس یہ ایک بریگیڈ اور اپنی نیم فوجی (ای پی سی اے ایف) نفی تھی۔

۵۳ بریگیڈ آڑے وقت میں ڈھاکہ کے دفاع کے لیے مخصوص تھا۔ نیازی نے اسے فینی میں جنرل رحیم کے زیر کمان کر دیا جنرل رحیم کے ڈویژن کا دوسرا بریگیڈ (۱۱۷) ۴ ڈویژن سے لیا گیا جو کوسیل میں مقیم تھا اب بھی وہیں رہا۔ اس طرح جنرل رحیم کے پاس فینی

لے ایک بیٹری میں موباء ۱۲ ہلکی توپیں ہوتی ہیں۔

اور کوسیل والے دو بریگیڈ آگئے۔

جہاں تک ۴ عبوری بریگیڈ ہیڈ کوارٹروں کا تعلق ہے، ان کا ذکر الگ باب میں آئے گا۔ جنرل نیازی کو اپنی ان عبوری تخلیقات پر بڑا فخر تھا، وہ اکثر اپنا پخلا ہونٹ چباتے ہوئے دعوے کرتے کہ "جب دشمن کو ان ہیڈ کوارٹروں کا پتہ چلے گا، تو وہ بوکھلا اٹھے گا" کراؤں رات اتنی زیادہ فوج کہاں سے آگئی، یقیناً اس سے اس کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور وہ حملے کا ارادہ ترک کرے گا۔ پتہ نہیں ان حریفوں سے جنرل نیازی دشمن کو دھوکا دے رہے تھے یا اپنے آپ کو کیونکہ وطن کے دفاع کے لیے جو نفی پہلے موجود تھی اب بھی وہی رہی۔ ہیڈ کوارٹر بنانے سے اس کی کارکردگی میں کوئی حیرت انگیز تبدیلی نہ آئی۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹر تو رکنا اگر مشرقی پاکستان میں چڑیاں اور گڑے بھی معمول سے زیادہ نظر آتے، تو اس کی اطلاع ملتی باہمی اور بھارتی فوج کو بل جاتی تھی۔

مزید نفی حاصل کرنے کے لیے جنرل نیازی نے نومبر کے وسط میں میجر جنرل جمیل اور اپنے چیف آف اسٹاف بریگیڈیئر باقر صدیقی کو راولپنڈی بھیجا۔ اس دور کی ٹیم نے جی ایچ کیو کو بتایا کہ ساری سرحدوں پر دشمن کا دباؤ بہت بڑھ گیا ہے، کئی سرحدی علاقے دشمن کے قبضے میں جا چکے ہیں، موجودہ وسائل نا کافی ثابت ہو رہے ہیں اس لیے مزید دو ڈویژن فوج مشرقی پاکستان بھیجئے جائے۔ جی ایچ کیو کے لیے سوچنے کا مقام یہ تھا کہ ان دو ڈویژنوں سے مشرقی پاکستان کی دفاعی صلاحیت میں کتنا اضافہ اور مغربی پاکستان کی جنگی قوت میں کتنی کمی واقع ہوگی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دو ڈویژن بھیجنے کے بجائے آٹھ پلٹنیں ڈھاکہ بھیج دی جائیں۔ ان میں سے پانچ پلٹنیں نومبر کے آخری عشرے میں ڈھاکہ پہنچ گئیں اور ان کے فوراً آٹھ بجے بحرے کر کے مختلف کمانڈروں میں تقسیم کر دیے گئے۔ ان پلٹنوں کی نہ صرف وحدت اور لگائٹ لوٹ گئی، بلکہ ان کی جنگی صلاحیت بھی خاصی متاثر ہوئی۔ ایک کمپنی کہیں دوسری کہیں اور بائیلین ہیڈ کوارٹر کہیں باقی تین پلٹنیں بھی باقی تھیں کہ ۳۰ دسمبر کو جنگ چھڑ گئی اور مہینہ انصاری رابطہ منقطع ہو گیا۔

۹ نومبر کو عید الفطر تھی، عید کا چاند نظر آنے کے بعد راولپنڈی سے پیغام آیا کہ انٹیلی جنس کی تازہ اطلاع کے مطابق عید کے روز حملے کا خطرہ ہے۔ مزید انکشاف کیا گیا کہ اس حملے کا زور کوسیل کی جانب ہوگا اور ذیلی اقدام جلیسور سیکٹر میں روپڑ پر ہوگا۔ جی ایچ کیو نے ایسٹرن کمانڈ کو مشورہ دیا کہ وہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اپنے دفاعی انتظامات میں ضروری رد و بدل کرے۔ جنرل نیازی نے اس مشورے پر کوئی عمل نہ کیا، حالانکہ اس کی ساری نفی ملتی باہمی اور شرپسندوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جگہ جگہ بکھری ہوئی تھی اور باقاعدہ جنگ کے لیے ان کی ترتیب نو ضروری تھی، البتہ نئی اطلاع کی روشنی میں جنرل نیازی نے اپنی ساری دفاعی پوزیشن کا جائزہ لیا، تو اندازہ ہوا کہ مشرقی سرحد پر کوسیل اور فینی کے درمیان ہماری حالت نرم ہے۔ اگر حالہ مشرق ہی سے آ رہا ہے، تو غالباً اس کا رخ بھی نرمی میں ہوگا۔ یہی وہ خطرہ تھا جس کے پیش نظر جنرل نیازی نے ڈھاکہ میں مقیم ۵۳ بریگیڈ فوراً فینی روانہ کر دیا گیا۔ ۲۰ نومبر کو جنرل رحیم بھی چند اسٹاف آفسر اور بہت سے جنگی لفٹننٹ لے کر چاند پور پہنچ گئے جنرل رحیم اس علاقے کے دفاع کے بارے میں خاصے فرائض تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایک بریگیڈ کوسیل میں ہے اور دوسرا فینی میں۔ دونوں کے درمیان اگر دشمن نے سردیا، تو اسے دبا کر کھل دیا جائے گا۔ اطلاع جلیسور سیکٹر کے انچارج میجر جنرل انصاری کو بھی متوقع خطرے سے آگاہ کر دیا گیا۔

خوش قسمتی سے دشمن نے عید کے دن بھر پور حملہ نہ کیا، البتہ بعض سرحدی علاقوں پر پہلے کی نسبت دباؤ بڑھ گیا۔ اس دباؤ کو

# یوم الحساب

بھر پور حملے کا نام دینا اور اسے کامیابی سے رکھنے کو ایک کارنامہ قرار دینا حقائق کے بالکل برعکس ہے حقیقت یہ ہے کہ اس روز دشمن اپنی عسکری قوت کو حرکت میں نہیں لایا تھا۔ ڈھاکہ شہر پر ایک بھی ہوائی حملہ نہ ہوا، کہیں بھی بھارتی طیاروں کی گڑگڑاہٹ سنائی نہ دی، بلکہ سائے صوبے میں لیں ریل گاڑیاں، کشتیاں اور موٹر لائنیں حسب معمول چلتی رہیں اور تو اور خود جنرل نیازی روزانہ کے معمول کے مطابق صبح سویرے سیلی کا پٹر پر روانہ ہوتے اور دن بھر چکن ٹکے، کھا کر شام کو بحیرہ عافیت کسی خاتون صحافی کو "خصوصی انٹرویو" دینے کے لیے ڈھاکہ لوٹ آتے، حالانکہ جب ۳۰ دسمبر کو بھر پور جنگ شروع ہوئی تو چوتھے دن ہی جنرل نیازی ہلک ہلک کر رونے لگے جس کا تفصیل ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔

انہی دنوں (۱۰ دسمبر) کا ذکر ہے کہ جنرل نیازی نے اخبار نویسوں کو اپنی دفاعی جنگ کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میرے سپاہی کھلے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح سرحدوں تک پھیلے ہوئے ہیں وہ آہستہ آہستہ سکڑا کر ایک ٹکے کی شکل اختیار کر لیں گے اور پھر دشمن کا جبراً توڑ دیں گے" ساتھ ہی انہوں نے اپنے ماتحت کمانڈروں کو حکم دے دیا کہ جب تک سرحدی چوکی پر متعین نفری میں تین چوتھائی شہید یا زخمی نہیں ہو جاتے، کوئی فرد پیچھے نہ ہٹے۔ مجھے یہ آرڈر عجیب لگا، کیونکہ جس ہاتھ کی تین چوتھائی انگلیاں ٹوٹ جائیں، اس ہاتھ سے کٹا کیسے بن سکتا تھا میرا تو ایک ناخن بھی زخمی ہوا تو پوری طرح ہتھی بند نہیں ہوتی۔ میرا خیال خام سہی مگر اہل نظر بھی کہتے ہیں کہ جنرل نیازی نے اپنی "دفاعی صلاحیتوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا" ان کی صلاحیتوں سے قطع نظر امر واقعہ یہ ہے کہ وہ یہ ہرگز تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ وہ اپنی فوج کو تسلیم کے دانوں کی طرح سرحد کے ساتھ ساتھ بکھیر کر اپنی شکست کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔

۳۰ دسمبر بڑا تاریخی دن تھا۔ ملک کے لیے بھی اور جنرل نیازی کے لیے بھی ملک اس روز بھارت کی دوسری بھر پور جارحیت کا شکار ہوا اور جنرل نیازی اس دن آخری مرتبہ ڈھاکہ سے باہر نکلے۔ وہ یمن سنگھ تشریف لے گئے تھے شام کو واپس آئے، تو میں اپنے دفتر میں بیٹھ کر اخبارات کے لیے دن بھر کی روداد لکھنے لگا۔ پانچ بج کر دس منٹ پر بریگیڈیئر باقر صدیقی کا فون آیا۔ وہ خاصے جھنجھلائے ہوئے تھے۔ انہوں نے چھوٹے ہی کہا: "تم کیسے پریس آفسر ہو؟ ریڈیو پاکستان نے جنگ چھڑنے کی خبر نشر کر دی ہے اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں؟" میں نے بجا جت سے کہا: میں سمجھ رہا تھا جنگ کی خبر سب سے پہلے آپ بتائیں گے۔"

"چھوڑو باتیں نہ بناؤ، فوراً ٹیک ہیڈ کوارٹر پہنچو۔"

ٹیک ہیڈ کوارٹر ایک چھتار درخت تلے زمین کھود کر بنایا گیا تھا۔ اس میں تین چار میٹر گہرے چھوٹے کمرے تھے جن کی چھت پر گلاس ٹیوبس ڈال کر اسے ہوا بازوں سے چھبانے کی کوشش کی گئی تھی، میں کوئی پھرنے نیچے اتر کر ایک تنگ گیلری میں داخل ہوا اور دونوں جانب تین تین کمرے چھوڑ کر سیڈھا آپریشن روم میں پہنچ گیا۔ یہ کمرہ نسبتاً بڑا تھا۔ اس کی دیواروں پر مختلف سیکٹروں کے فوجی نقشے لگے تھے۔ ایک طرف دو میزوں پر کوئی نصف دوین ٹیلیفون اور وائرلیس سیٹ لگے تھے۔ ایک انصر صرف ٹیلیفون سننے پر مامور تھا۔ یہ کمرہ مشرقی پاکستان میں تمام فوجی کارروائیوں کا محور تھا۔ احکام یہاں سے جاتے تھے اور مختلف حصوں سے صورت حال کی خبریں بھی یہیں موصول ہوتی تھیں۔

جس وقت میں آپریشن روم میں داخل ہوا، جنرل نیازی چیدہ چیدہ افسروں سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے ٹھنڈی بٹون اور سلٹی رنگ کی بشرط پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں ریشمی رد مال (ہیکارٹ) تھا۔ ان کی پشت دیوار کی طرف تھی۔ تیس بیٹیس حاضرین میں میجر جنرل رافو فرمان علی اور ریئر ایڈمرل محمد شریف بھی شامل تھے جنرل نیازی گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ محدودی جگہ میں ٹہلتے بھی جھلتے تھے۔ ان کے چہرے پر پریشانی یا نگران کے کوئی آثار نہ تھے، البتہ ماحول اتنا گھمبیر تھا کہ ان کے منہ سے جملہ نکلنا سیدھا دل میں اتر جاتا تھا۔ ان کے خطاب کا لب لباب یہ تھا کہ اب تمام بندشیں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب

لشہ ٹیک ہیڈ کوارٹر انگریزی الفاظ TACTICAL HEADQUARTERS سے لایا ہے جنگ کے دوران فوجی کمانڈر اپنے مستقل ہیڈ کوارٹر سے ٹیک ہیڈ کوارٹر منتقل ہو جاتے ہیں جنرل نیازی کا ٹیک ہیڈ کوارٹر چھانڈی کے اندر ہی اپنے مستقل ہیڈ کوارٹر سے ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

ہیں بین الاقوامی سرحدیں پار کرنے کی آزادی ہے۔ اب بادل چٹھ چکے ہیں۔

سامعین کے چہروں سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل و دماغ پر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ وہ گزشتہ آٹھ ماہ سے شریپندوں کے خلاف صفت آرا تھے، گمراہ پابندی کے ساتھ کہ ان کے تعاقب میں بین الاقوامی سرحد پارچہ زن آنے پانے اب بین الاقوامی سرحد کا تقدس پامال ہو چکا تھا۔ ان کے خیال میں اب دونوں پریوں کو آزادی ہوگی اور فیصلہ ہو کر ہے کہ غلطی کی وجہ یہی تھی کہ اب تک مغربی پاکستان کی سرحدیں خاموش تھیں، صرف مشرقی پاکستان کی پٹانی ہو رہی تھی خیال تھا کہ اب ہمارا تنومند بازو بھی اپنا زور دکھائے گا اور ہم پر ہونے والے ظلم و استبداد کا بدلہ لے گا۔ اب بھارت کو پتہ چلے گا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہوگا۔ کے کیا معنی ہیں۔

تقریر کے بعد سب لوگ چلے گئے، تو جنرل نیازی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اعلان جنگ کے موقع پر ان کی طرف سے آرڈر آف دی ڈے یا فرمانِ امروزی تیار کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تاکید کی کہ ان کے زیرِ کمان افسروں اور جوانوں پر دو باتیں واضح کی جائیں۔ ایک یہ کہ اب دشمن جہاں بھی ملے جہد بھی ملے، سرحدوں کا خیال کیے بغیر اسے تس تس کر دیں اور دوسری بات یہ کہ آخری دم تک دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں، کیونکہ فرار یا جان بچا کر بھاگنے کی تمام راہیں سد ہوئیں۔ میں چلنے لگانوں نے فرار والا جملہ کٹوا دیا۔

میں اسی شام فرمانِ امروزی کا مسودہ تیار کر کے ان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے مسودے سمیت مجھے بڑی سیر یا قدرتی کے حوالے کر دیا، مگر وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس کی لوک پاک نہ سنوا سکے۔ بات اگلے روز چار بجی مسودہ منظور ہوا اس کی نقلیں بنیں اور تمام محاذوں پر افسروں اور جوانوں کو بھیجنے کا اہتمام ہونے لگا، مگر اب محاذ تک پہنچنے کے تمام راستے سد ہو چکے تھے۔ واحد ذریعہ پہلی کاپٹر تھے، لیکن ان کی تعداد کم اور ان کے کام زیادہ تھے، چنانچہ یہ پلندہ ڈھا کہ ہی میں پڑا ہوا اور بالآخر وہیں نذرِ راکش کرنا پڑا۔

مغربی پاکستان کے محاذ پر جنگ کی ابتدا پاک فضائیہ کے حملوں سے ہو چکی تھی جس کا جواب یہ پیش کیا گیا کہ پہل بھارت نے کی ہے اور پاکستانی جیٹ طیارے جوابی کارروائی کے لیے سات بھارتی اڈوں پر تباہی بھجوا کر گئے ہیں۔ ان کے بعد ہماری بڑی فوج بھی پیش قدمی کر چکی ہے۔ یہ ساری باتیں ہمیں ریڈیو پاکستان کے ذریعے پہنچیں۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے بھرپور جنگ کا پہلی بار احساس ۳ اور دسمبر کی درمیانی رات و ذبح کر چالیس منٹ پر ہوا جب بھارتی طیاروں نے ڈھا کہ ایئر پورٹ پر بمبار کیا۔ اس وقت اڈے سے متوڑی دور اپنے مکان کی بالائی منزل میں سو رہا تھا۔ بھارتی طیاروں اور ہماری طیارہ شکن توپوں کی گھن گرج سے میری آنکھ کھل گئی میں پلنگ سے اٹھ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا جہاں سے ایئر پورٹ کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔

رات چاندنی کو معصوم بچے کی طرح گود میں لیے انسان کی تباہ کاریوں کا مشاہدہ کر رہی تھی اور اوپر جھیل جھیل کرتے ستارے خاموش تماشا بنے بیٹھے تھے۔ زمین اور آسمان کے درمیان گولیوں اور گولوں کی بھرپور تھی۔ ٹریسنگ گولیوں کی روشنی تیزی سے آنکھوں کے سامنے سے گزرتی اور دھماکوں کی آواز بار بار کانوں سے گزرتی تھی۔ گزرتی گزرتی بھارتی طیارے بے ضمیر رُوح کی طرح بے قرار بھرتے اور ہماری طیارہ شکن توپیں نفرت کے شعلے ان پر پھینکنے کی کوشش کرتیں۔ یہ منظر تو پختے تک جاری رہا۔ ادھر سورج نکلا اور ادھر

بنگلہ زرک گیا جیسے چور شرفا کے جاگنے سے پہلے پہلے اپنا کام مکمل کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔

حملہ ختم ہونے کے بعد میں نے جماعت بنائی، استری شدہ وردی پٹی اور ٹیک سٹیڈ کارٹر چل دیا۔ وہاں کوئی خاص سرگرمی نظر نہ آئی سوائے صبح کی کانفرنس کے جس کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصر نظر بھر کر بحریہ اور فضائیہ کی کارکردگی پر بھی ڈالیں لیکن جنگ کا جائزہ لینے وقت یہ اندازہ رہے کہ ہماری نیوی اور ایئر فورس کو کیا ہوا؟

جنگ کی پہلی زدیاں فضائیہ پر پڑی۔ بھارت کے جدید طیاروں کا مقابلہ ہمارے پڑنے سید طیاروں اور صاحبِ کمال ہوا بازوں نے خوب ڈٹ کر کیا۔ جدید اور قدیم کے علاوہ تعداد کے لحاظ سے مقابلہ ایک اور دس کا تھا۔ ہمارے پاس طیاروں کا ایک سکواڈرن اور جوہر دن کا گولہ بارود تھا۔ بھارت کے پاس کم از کم دس سکواڈرن اور ان گنت اسلحہ تھا۔ ہمارے جہازوں نے پہلے دن ۳۲ فضائی معرکوں میں حصہ لیا اور مجموعی طور پر تیس ہزار راکٹیں چلائے۔ یہ فضائیہ کی تاریخ میں ایک دن میں ایونیشن کا سب سے زیادہ خرچ تھا۔ فضائیہ کے علاوہ دیگر جہازوں نے بھی ایک دن میں ستر ہزار گولیاں اور گولے بھجوا دیے۔ اس سے حکام بالا کو تشویش ہوئی کہ اگر ایونیشن کے پورے خرچ کی یہی شرح رہی تو تمام ذخیرے سات سے دس دن میں ختم ہو جائیں گے۔ ان دنوں اندازہ یہی تھا کہ ہمیں ایک طویل جنگ لڑنا پڑے گی جس کے لیے ایونیشن کے خرچ میں کفایت شعاری برتنا ضروری ہوگی، چنانچہ ایونیشن کے اسراف پر پابندی لگادی گئی اور صرف ضرورت کے مطابق طیاروں اور توپوں کو فائر کرنے کا حکم دیا گیا۔ اسے قدرت کی تم غلطی کہیں کہ اس طرح بچائے ہوئے ایونیشن کے ذخائر کو چند روز بعد آگ لگا کر ضائع کرنا پڑا۔

پہلے دن کے فضائی حملے میں بھارتی فضائیہ کے دس بارہ طیارے تباہ ہوئے، مگر وہ ڈھا کہ ایئر پورٹ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ صرف چار بم ایئر پورٹ کے نواح میں گرے جس سے ہماری جنگی صلاحیت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس بارہ راست مہماری کوبے سود سمجھ کر ہندوستان کو اپنی فضائی ایسٹریجی بدلنا پڑی اور اس نے ہمارے مواصلاتی نظام کو دہم برہم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس مقصد کے لیے وہ بگ ۲۱ کی جگہ ایس ۷ (SU-7) اور ہنٹر (HUNTER) طیارے فضائی لے آیا۔ یہ طیارے حدود پر اپنی بڑی فوج کی مدد کے علاوہ گھاٹوں، پتھروں اور سافز واکشٹیوں پر حملے کرنے لگے۔ اس لائحہ عمل سے ڈھا کہ ایئر پورٹ پر دباؤ بھگم ہوا جس کی وجہ سے ۵ دسمبر کو ہماری فضائیہ کو کوسلا اور چند دوسرے علاقوں میں اپنی بڑی فوج کی اعانت کا موقع ملا۔ مشرقی علاقوں میں بھارتی فضائیہ سے براہ راست ٹکرائے گئے، کیونکہ ہمارے طیاروں کو سرحدوں تک جانے اور واپس آنے میں اتنا وقت اور اتنا ایندھن خرچ کرنا پڑتا تھا کہ فضائی جنگ کے لیے ان میں بہت کم سکت رہ جاتی تھی۔ (ان کی کل فضائی صلاحیت صرف ۳۵ منٹ تھی)۔

پانچ دسمبر کا سارا دن اور پھر اگلی رات ہماری توپوں اور طیاروں نے دشمن کے جہازوں کو ایئر پورٹ پر پھینکنے نہ دیا لیکن ۶ دسمبر کی صبح ہمارے سیریک سرحدی محاذ سے واپس آئے اور ایئر پورٹ پر فضائی ہجماے (COMBAT AIR PATROLLING) کے لیے اڑنے والے تھے کہ ہندوستان کے دس بگ ۲۱ طیارے اُڑ گئے۔ ہماری طیارہ شکن توپوں نے انہیں لٹکا، مگر بے سود۔ وہ رُوحی ساخت کے پانچ پانچ سو گولہ گرام دونی چم گئے ان میں کامیاب ہو گئے جن میں سے دو بم رن وے (RUNWAY) پر پڑے۔ ان بموں کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ وہ پہلے سیدھے زمین میں دھنس جاتے اور پھر چند لمبے بعد پھٹتے جس سے متاثرہ زمین میں بہت بڑا شگاف پڑ جاتا۔ یہ دونوں بم ایک دوسرے سے کوئی بارہ سو میٹر کے فاصلے

پر گھرے اور دونوں جھگول پر وسیع اور گہرے شگاف چھوڑ گئے ہر گواہ تقریباً بیس میٹر گہرا اور بیس میٹر چوڑا تھا۔ اس نقصان کی وجہ سے رن وے قابل استعمال نہ رہا۔ مرمت کا کام بڑی تندہی سے شروع کیا گیا۔ فضائیہ اور فوج کے ایم۔ ای۔ ایس کے محکمے اس کام میں جُست گئے۔ مقامی انجینئرنگ بنالین کے جوانوں اور چند ہماری ضروریوں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اوپر سے بھارتی فضائیہ پے پے جھلکے کرتی رہی اور اصرار یہ لوگ دریائی و ففوں میں مصروف کار رہے۔ عین میدان جنگ میں کام کرتے کرتے گیارہ آدمی ہلاک اور بیس زخمی ہو گئے۔

اگلی رات (۱۱ مارچ) دسمبر کی درمیانی شب (گڑھوں کو بھرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ چھ سے گھٹے گھنٹے کام کرنے کی مہلت مل جائے تو رن وے قابل استعمال ہو جائے گا مگر بھارتی طیاروں کے تابڑ توڑ حملوں کی مدافعت کا کام صرف طیارہ شکن توپوں کے سپرد تھا کیونکہ ہمارے جہاز پرواز سے عاری تھے۔ دشمن کی لینا کا میاب رہی اور رن وے کے اہم مقامات پر تین اور شگاف پڑ گئے جنہیں پُر کرنے کے لیے مزید ۳۶ گھنٹے درکار تھے۔ اتنی طویل مہلت کہاں ملتی ہو کوشش جاری رہی مگر ہم رن وے مرمت کر کے دوبارہ اپنی فضائیہ کو اڑنے کا موقع فراہم نہ کر سکے۔ گویا دسمبر کی صبح سے ہماری فضائیہ پیکار ہو کر رہ گئی۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے دشمن کے کم از کم ۲۲ اور زیادہ سے زیادہ ۲۴ طیارے تباہ ہوئے جن میں سے سات ہماری فضائیہ نے مار گرائے اور باقی ہماری طیارہ شکن توپوں کا شکار ہوئے۔

ڈھاکہ ایئر پورٹ سے کوئی ۵ کلومیٹر شمال میں گرینولڈ ایئر پورٹ زیر تعمیر تھا جس کا مرکزی رن وے مکمل ہو چکا تھا مگر دیگر سہولتیں مفقود تھیں۔

پرانے اور نئے ہوائی اڈوں کے ناکارہ ہوجانے کے بعد یہ تجویز بھی زیر غور آئی کہ ڈھاکہ ایئر پورٹ کے قریب ایوب نگر (دارالحکومت ثانی) کی وسیع سرکوں کو رن وے کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اگر وہاں سے ہمارے سیورٹیاں پرواز کر سکیں مگر اتر نہ سکیں، تو کم از کم دشمن کو نقصان پہنچا کر پیرائٹوں کے ذریعے چھلانگ لگادیں۔ اس تجویز کے حامیوں کا کہنا تھا کہ اپنے سیورٹیاں زمین پر کھڑے کھڑے دشمن کے حوالے کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ انہیں دشمن پر تباہی برسانے کے بعد ضائع کر دیا جائے۔ جب یہ تجویز پاکستان ایئر فورس ڈھاکہ کے میس کمانڈر کو پیش کی گئی تو انہوں نے نفی وجوہات کی بنا پر اسے قابل عمل قرار دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں ہماری فضائیہ کا کردار ختم ہو گیا۔

اب ڈھاکہ میں فضائیہ کے لڑاکا پائلٹوں کا کوئی تصرف نہیں رہ گیا تھا؛ چنانچہ انہیں ایک دوست ملک کے توسط سے مغربی پاکستان مجبوراً لایا گیا جہاں ہماری فضائیہ ابھی سرگرم تھی۔ دس پائلٹ ۸۰ چھوٹے اور ۹۰ دسمبر کو ڈھاکہ سے روانہ ہوئے پیچھے بلی کا پٹروں کے پائلٹ اور ان کے اسٹرکٹر رہ گئے۔ ان کے علاوہ آرمی ایوی ایشن کے پائلٹ اور سیل کا پٹر بھی ڈھاکہ ہی میں رہے۔

پن۔ اے۔ ایف کو اس مختصر رول پر کوئی افسوس نہ تھا، کیونکہ امن کے زمانے میں یہ بات تسلیم کی جا چکی تھی کہ موجودہ وسائل کے مطابق ہماری فضائیہ جنگ کے زمانے میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ فعال نہ رہ سکے گی۔ یہاں وہ ۲۴ گھنٹے جی لیے۔ بیان کی سخت جاتی حوصلے اور فنی مہارت کا کمال تھا۔

پاک فضائیہ کی عدم موجودگی میں ڈھاکہ کے فضائی دفاع کی ساری ذمہ داری ہماری طیارہ شکن توپوں پر آن پڑی جو مشرقی

پاکستان میں سب سے پہلے گرجیں اور سب سے آخر میں خاموش ہوئیں۔ میں نے کچھ وقت ان بہادر توپچیوں کے ساتھ بھی گزارا۔ مجھے یاد ہے دو سوپ توپ چلچلا رہی تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ ہمارے توپچی مجوری ٹوپیاں پہنے کھلے میدان میں دشمن کے جہازوں کے منتظر تھے جوئی بھارتی طیارے نمودار ہوتے یہ فوراً توپ کا دھانڈا ان کی سیدھ میں کرتے، جلدی جلدی شانہ بانہ جتے اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ گولوں کی بوچھاڑ کر دیتے۔ ادھر آگ کی حدت، ادھر ایمان کی حرارت اور ہر گرم گرم میدان جنگ، اُروح کو گرا دینے والا عجب منظر تھا۔ میں نے جنگ کے انتہائی نازک وقت میں جو لمحے ان توپچیوں کے ساتھ گزارے میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

مشرقی پاکستان میں ہماری بحریہ کی حالت فضائیہ سے چنداں بہتر نہ تھی۔ اس کی کل طاقت کو میلا، راجشاہی، جیسور اور سلٹ نامی چار کشتیوں پر مشتمل تھی۔ ریزر ایڈمرل محمد شریف ان کے سربراہ اعلیٰ تھے۔ یہ کشتیاں درحقیقت بحری راستوں سے اسمگلنگ کو روکنے کے لیے خریدی گئی تھیں۔ ان پر ۴۰/۶۰ ملی میٹر کی ٹوپیوں نصب تھیں اور ہر کشتی کے عملے کی تعداد ۲۹ تھی۔ ان کی زیادہ سے زیادہ رفتار ۲۰ ناٹ (بحری میل) تھی۔

ریزیر ایڈمرل شریف نے جنگ سے پہلے اپنے "وسائل" میں اضافہ کے لیے مقامی طور پر مزید کشتیاں حاصل کر لی تھیں جن میں سے بعض پر ۱۲ ملی میٹر بھارتی مشین گن اور بعض پر ۵۰ ایم ایم یا ۳۰ ایم ایم بروننگ مشین گن لگی تھیں۔ یہ کشتیاں شریف دوس کے تعاقب یا سرکوبی کرنے کے لیے بہت مفید تھیں مگر ان کا بھارتی بحری بیڑے سے کوئی مقابلہ نہ تھا جس میں ایئر کرافٹ کیئریر (AIR CRAFT CARRIER) کے علاوہ کئی ڈسٹرائی (DESTROYER) اور فریگیٹ (FRIGATE) شامل تھے۔

پاک بحریہ کو ایک ناممکن کام کا سامنا تھا۔ وسائل محدود اور فرائض غیر محدود۔ صوبے کے اندر ہزاروں میل لمبے دریاؤں اور نالوں کو سرپینڈوں سے پاک رکھنے کے علاوہ اس کے ذمے ہمارے چھ سو کلومیٹر طویل ساحل سمندر کا دفاع بھی تھا جو برما کی سرحد پر واقع تنگنا (TEKNAF) سے لے کر مغربی بنگال کے پاس پسر (PASSAR) تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کراچی اور چٹانگ کے درمیان ہزاروں میل آبی گزرگاہیں تھیں جہاں پر بھارت کو بالادستی حاصل تھی۔

جنرل نیازی کی طرح بلند ہانگ دعوے کے بجائے ریزر ایڈمرل شریف نے حقیقت پسندی سے کام لیا اور بڑی اور بحری سطح پر اپنے اعلیٰ افسروں کو جنگ سے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ ان حالات میں نیوی سے کسی قسم کے موثر دفاع کی توقع نہ رکھنا۔ انہوں نے محدود وسائل کے پیش نظر صرف چٹانگ اور کھٹنا کے قریب منگلا کے بحری اڈوں پر تو توجہ دی اور باقی ساحل سمندر اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ چٹانگ کے دفاع کے لیے ایک ساحلی دفاعی بیٹری قائم کی گئی جس کے پاس دو توپیں تھیں۔ توپ کا دھانڈا صرف ۴ انچ تھا اور اس کی مار بارہ ہزار میٹر تک تھی۔ چٹانگ ایئر پورٹ کی حفاظت کے لیے رضا کاروں کی مدد سے بنگالی طور پر ایک طیارہ شکن بیٹری کھڑی کی گئی اور چٹانگ کے ساحلی علاقے پر نظر رکھنے کے لیے مین بنالین رکھی گئی۔

منگلا پورٹ کا دفاع ایسٹ پاکستان سول آرمد فورسز کی ایک کمپنی کے سپرد تھا۔ بحریہ کی طرف سے وہاں چند کشتیاں (GUNBOAT) رکھی گئی تھیں جن میں سے اکثر بنگالی طور پر مشین گن فٹ کر کے مسلح کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں ۲۵ پونڈ وزن کی گولے والی دو توپیں تھیں۔ یہ تھی کل پونجی جس سے یہیں ایک بھر پور جنگ لڑا جاتی۔



۳ دسمبر کو جب اچانک جنگ چھڑ گئی، تو کشتیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ راجشاہی نامی کشتی چٹاگانگ کے مستقر سے نکل کر سینڈیپ کی 'آبنا' (CHANNEL) میں گھوم رہی تھی 'سہٹ' کسی فتنی غزالی کی وجہ سے بے کار کھڑی تھی صرف 'کومیل' گودی میں چاق و چوبند موجود تھی۔

بحریہ کے ہیڈ کوارٹر (ڈھاکہ) سے یہ حکم پہلے ہی جاری کیا جا چکا تھا کہ جنگ چھڑنے کی صورت میں تمام کشتیاں بندرگاہوں کے محفوظ ٹھکانوں میں سمٹ آئیں۔ ۳ دسمبر کو اعلان جنگ کے بعد کشتیاں تو بندرگاہ میں آگئیں، لیکن ان ۲۳ غیر ملکی جہازوں اور سات کو سٹروں (COASTERS) کا کیا بنے گا جو کھلے سمندر میں ٹنگر انداز تھے۔ انہیں نہ بندرگاہ کے اندر سویا جاسکتا تھا اور نہ وہاں سے غائب کیا جاسکتا تھا۔ ان کو کسی قسم کی ہدایت دینے کے لیے کوئی مواصلاتی رابطہ بھی نہ تھا، کیونکہ وہ اپنے دائرہ میں سیٹ صرف مقررہ وقت پر کھولتے تھے۔ رابطے کی واحد ترکیب یہ تھی کہ کوئی جیالابھت کرے اور ذاتی طور پر جا کر ان کو تازہ صورت حال سے آگاہ کرے، چنانچہ بحریہ کا ایک جہاز سالانہ چند جہازوں کو ساتھ لے کر ایک کشتی پر روانہ ہو گیا وہ فروڈا ہر جہاز کے پاس گیا، اس کے کپٹن کو کشتی کی صورت حال سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ اپنی سلامتی کے لیے اپنے اپنے ملک کے جھنڈے سر بلند کر لیں۔

چٹاگانگ میں جنگ کا دھماکا ۳ دسمبر کی درمیانی رات کوئی دو بجے سنائی دیا جب دشمن کے جہازوں نے تیل کے ایک ذخیرے کو تندر آتش کر دیا۔ اگلے روز علی البیغ ایک ہلکا سا بے ضرر طیارہ آہستہ آہستہ سمندر سے شہر کی طرف بڑھنے لگا۔ چٹاگانگ ایئر پورٹ پر متعین طیارہ شکن میزوں کے نو آموز رضا کاروں نے سوچا کیا بے جان سی شے پرائیویشن ضائع کرنا ہے، کوئی جیٹ طیارہ آئے گا، تو مقابلے کا مزہ بھی آئے گا۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب یہی بے ضرر طیارہ ریفاٹری کو بھجک سے اڑا گیا۔ اس کے بعد پانچ کینبرا (CANNBERRA) طیاروں کا ایک پرانوار ہوا جس کو سمندر رضا کاروں نے نشانہ بنایا اور ان میں سے دو کو مار گرایا۔

اسی اثناء میں یہ غیر مصدقہ اطلاع ملی کہ گزشتہ رات دشمن 'قطبہ' جزیرے پر اتر گیا ہے۔ یہ جزیرہ چٹاگانگ کے قریب ہی تھا اور دشمن کے وہاں اترنے سے چٹاگانگ کو خطہ لاحق ہو سکتا تھا، چنانچہ چٹاگانگ پورٹ کے انچارج کو ڈور لے سوچا کہ اگر دشمن دروازے پر دستک دے رہا ہے، تو کشتی کشتیوں (GUN BOATS) کو بچا بچا کر رکھنے کا کیا فائدہ؟ چنانچہ اس نے 'کومیل'، 'بلور گھاٹ' اور 'راجشاہی' کو اس مشن کے ساتھ روانہ کر دیا کہ وہ صورت حال کا جائزہ لیں اور حسب ضرورت کارروائی کریں۔

جب 'راجشاہی' مقررہ مقام پر پہنچی، تو اسے دشمن کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ یہ ابھی وہیں تھی کہ اوپر سے دشمن کے چار ہسٹریک حملہ آور ہو گئے۔ 'راجشاہی' نے اپنی ۴۰/۶۰ کی میز توپ سے انہیں دُور رکھنا چاہا، مگر ناکام رہی۔ اٹالس کو چھ ضربیں آئیں جن سے انجن کو لگ لگ گئی اور پانی بھی غیب غیب اندر آنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ آگ اور پانی جو ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دشمن چلے

لے گئے تھے۔ دن میں دوسرے دن اور بعد میں ایک مرتبہ، جی ایچ کیو سے مغربی محاذ کی صورت حال (انچورڈ مارگل) کے ذریعے

آئے ہیں آج ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت تعاون پر اتر آئے ہیں تاکہ اس بے چاری کشتی کو تباہ کر دیں۔ 'راجشاہی' کے کپٹن اور اس کے ساتھیوں نے اسے بچانے کی جان کوڑ کو کوشش کی۔ اس جدوجہد میں کپٹن سمیت پانچ آدمی زخمی ہو گئے جن میں سے ایک چل بسا، مگر انہوں نے بہت نہ ہاری اور پانی اور آگ سے برسرِ پیکار رہے۔ دشمن کے طیارے کن لوٹ سے شعلے بجھاتے دیکھ کر واپس چلے گئے۔ پورٹ کے عملے کی کوششیں بالآخر بار آور ثابت ہوئیں اور 'راجشاہی' کو بچا لیا گیا۔ 'کومیل'، 'راجشاہی' سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی، لیکن یہ بھی اس کی مدد کو نہ پہنچ سکی، کیونکہ خود اس پر دشمن کے نوٹیلارے ٹوٹ پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانٹ نشانہ بازی میں دوسرے سے سہولت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے ہر حملے کے بعد کشتیوں ڈول جاتی تھی جیسے کمزور حریف طاقتور باکرہ کا گھونسا کھا کر اڑھٹا جاتا ہے۔ 'کومیل' کے عملے کے کئی ارکان بھی زخمی ہو چکے تھے، مگر انہوں نے اسے بچانے کی کوشش جاری رکھی۔ اچانک ہوائی جہاز کا ایک نشانہ سیدھا تیل کی ٹینکی میں آگ لگا جس سے اس میں آگ لگ گئی، تھوڑی دیر میں یہ آگ پھیل کر اس حصے میں پہنچنے والی تھی جہاں بارود کے چھ سو گولے رکھے تھے، چنانچہ کپٹن نے حکم دیا کہ 'کومیل' کو چھوڑ کر اپنی اپنی جان بچا لی جائے، لہذا دو افسروں اور ۲۱ ارکان پر مشتمل عملہ حفاظتی بیٹیوں سمیت سمندر میں نڈو گیا۔ ادھر کودنے سے پانی اچھلا اور ادھر بازو دو آگ لگ جانے سے دھماکے دار شعلہ بلند ہوا۔ 'کومیل' کے پرچے اڑ گئے۔

تیسری کشتی 'بلور گھاٹ' جو ہوائی حملوں سے محفوظ رہی، 'کومیل' کے عملے کو اٹھانے اور چٹاگانگ پورٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گئی۔

نکھنا کے قریب منگلا پورٹ نیبھ چھوٹی اور غیر اہم تھی۔ وہاں دفاعی جمیٹ بھی کم تھی بحری طاقت میں سے صرف جیو گن بوٹ وہاں تھی۔ باقی پانچ کشتیاں وہیں جو ہنگامی طور پر وسائل بڑھانے کی خاطر تیار کی گئی تھیں۔ ان میں سے دو تو جنگ کے پہلے روز ہی تباہ ہو گئیں اور باقی تین قریب ترین جنگ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئیں۔

جہاں تک بحری جنگ کا تعلق ہے، پاکستان بحریہ ۲۴ گھنٹوں ہی میں دم توڑ گئی، البتہ ساحلوں پر سپرہ دینے دفاعی قلعوں کا دفاع کرنے اور صوبے کے اندرونی جہازوں اور ساز و سامان کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے میں یا بحری وقت تک فعال رہی۔

جب فضائیہ اور بحریہ جنگ کے ابتدائی ایام ہی میں اپنا اپنا کردار ادا کر کے میدان جنگ سے غائب ہو گئیں، تو ساری فترت درازی جنرل نیازی اور ان کے زیرِ نگرانی بیٹا لیس ہزار ریگولر فوج اور ہتر ہزار نیم عسکری نفری پر ان پڑی۔ اب جنگ کا فیصلہ دو باتوں پر تھا، فوج کی جہانی بہادری اور اس کے کمانڈر کی اخلاقی جرأت! آئیے پہلے جنرل نیازی کی ایک جھلک دیکھتے ہیں، جنرل نیازی ہر روز صبح ۸ بجے آپریشن روم میں جیدہ چیدہ افسروں کا کانفرنس بلاتے۔ وہ ہر افسر سے خندہ پیشانی سے پیش آتے اور بول چال اور حرکات و سکنات سے بالکل نارمل لگتے، البتہ ایک بات ذرا عجیب سی لگتی کہ وہ مشرقی پاکستان میں جنگ پر توجہ دینے کے بجائے شروع شروع میں مغربی پاکستان میں زیادہ دل چسپی لیتے رہے۔ انہوں نے آپریشن روم کی مغربی دیوار پر مغربی پاکستان محاذ کا بہت بڑا نقشہ لگوا رکھا تھا جس پر وہاں کی جنگ کی صورت حال دکھانے کے لیے چھوٹے پین لگے تھے۔ دن میں دوسرے دن اور بعد میں ایک مرتبہ، جی ایچ کیو سے مغربی محاذ کی صورت حال (انچورڈ مارگل) کے ذریعے

دھاکہ پہنچتا تھا۔ ایک افسر کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ اس سنگل میں درج اطلاع کو نقشے پر سرخ اور سبز رنگ لگا کر واضح کر دیا کہ سرخ  
پہن دشمن کی پوزیشن ظاہر کرتے تھے اور سبز ہماری —

میں جنرل نیازی کی اس میٹنگ میں روزانہ حاضری دیتا۔ حالانکہ میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا میں  
نے دیکھا کہ مغربی پاکستان کی مشرقی سرحد سے چند سنگی میٹر دور دھاکہ کی جانب، تین چار سبز رنگ لگے تھے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ  
ہمارے قدم دشمن کی سرزمین پر ہیں۔

۴ دسمبر کو دوسرے قریب میں آپریشن روم میں داخل ہوا تو سارا ماحول خوشی سے چمکتا ہوا پایا جیران تھا کہ چند گھنٹوں  
میں کون سا میدان مار لیا ہے؟ پتہ چلا: امرتسر فتح ہو چکا ہے اور فیروز پور فتح ہونے والا ہے۔ ہماری فوجیں اس کے قریب جوار  
میں پہنچ چکی ہیں۔

میں نے پوچھا: اگر یہ خبر درست ہے تو جی ایچ کیو سے آنے والے سنگل میں اس کا ذکر کیوں نہیں؟  
ایک صاحب بولے: اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک وہاں ہماری پوزیشن مستحکم نہیں ہو جاتی، جی ایچ کیو اس کا  
دعویٰ نہیں کرنا چاہتا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میں جنرل نیازی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر پہلوافوں کی طرح ڈنڈ  
پیلنے لگے۔ انہوں نے طعنے کے انداز میں کہا: ”دیکھا تم نے؟ جب میں کہا کرتا تھا کہ اگر جنگ چھڑی، تو میدان جنگ دھاکہ  
کی زمین بنے گی، تو تم مجھے غیر ضروری خوش فہمی نہ پیدا کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے، مگر اب دیکھ لو، اگر زمین نہیں، تو میدان بڑا بھائی  
مغربی پاکستان، تو جنگ کو ہندوستان کے علاقے میں لے گیا ہے۔“ اس کے فوراً بعد انہوں نے ٹیلیفون کھاکر گورنر مالک کو بھی  
یہ خوشخبری سنائی کہ جنرل صاحب! چچاؤنگا کا کیا حال ہے؟

جنرل نیازی نے حکم دیا کہ امرتسر فتح ہونے کی خبر مشرقی پاکستان کے کونے کونے میں تمام فوجیوں تک پہنچادی جائے کیونکہ  
”اس سے ان کے مورال پر خوشگوار اثر پڑے گا۔“ ایڈمرل شریف نے کہا: بہتر ہو گا کہ پہلے اس خبر کی تصدیق کرائی جائے۔ میں سب  
سے جو خبر تھا مجھے ہی حکم ملا کہ پتہ کر دیکھیں کہ کون سے آئی؟ میں نے ساتھ والے آپریشن روم سے پوچھا۔ جواب ملا پی اے ایف میں  
دھاکہ کے آپریشن روم سے اطلاع آئی ہے۔ سنا ہے وہاں پشاور سے ایئر فورس کے کمانڈر انچیف نے ہاٹ لائن پر اطلاع دی  
ہے۔ میں نے دھاکہ میں ٹیلیفون کیا اور کہا: کیا آپ نے امرتسر اور فیروز پور کے متعلق خبری ہے؟

”جی ہاں“

”کہاں سے اطلاع آئی؟“

”ایئرٹن کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے“

جب دھاکہ میں اس خوش خبری کا کھوج نہ مل سکا، تو راولپنڈی ٹیلیفون کھڑکائے گئے۔ وہاں سے بھی اس کی تصدیق نہ

ملے یہ گورنر اے۔ ایم۔ مالک کا آبائی گاؤں تھا جو جیو رسی کیڈ میں سرحد سے چند میل اندر واقع تھا۔ اس دن بھارتی فوجیں وہاں

پہنچ چکی تھیں۔

ہو سکی۔ بالآخر یہ خبر سرسبز بنیاد رکھی۔ خوشی کی جولہ اچانک اٹھی تھی، وہ فوراً یاس میں ڈوب گئی۔  
اگلی صبح ۸ بجے کانفرنس ہوئی۔ سبز رنگ وہیں تھے جہاں پہلے روز تھے۔ ریڈیو پاکستان پر کان لگائے کہ شاید کوئی تازہ خبر  
سننے میں آئے۔ وہاں بھی ہر ٹیبلٹ میں یہی جملہ سننے میں آتا: ہماری بہادر افواج اپنے دے سے مضبوط کر رہی ہیں! ایک صاحب  
رنگ لگا کر کہا: انہیں آؤ دیکھئے بیچو تاکہ جلدی سے یہ کام پٹا کر آگے بڑھ سکیں۔

۴ دسمبر کو جنرل نیازی مغربی محاذ سے مایوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے صبح کی کانفرنس میں جی ایچ کیو سے آمدہ تار کے  
اقتباسات پڑھوائے بند کر دیے اور دیوار پر سے مغربی پاکستان کے نقشے ہٹوا دیے۔ وہ دوبارہ مشرقی پاکستان کے خول میں سٹ  
آئے جہاں تاریکیاں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

مشرقی پاکستان کے نقشوں پر سبز اور سرخ رنگ کے بجائے اسی رنگ کی پینلوں سے لکیریں کھینچ کر پاکستانی اور ہندوستانی  
افواج کی پوزیشن دکھائی گئی تھی۔ سبز تیرہ ہماری پسپائی اور سرخ تیرہ دشمن کی چڑھائی کی نشاندہی کر رہے تھے۔  
آئیے ان تیروں کے چکر دوں سے کل کر خود محاذ جنگ پر چلیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ جنگ کا رنگ کیا ہے

## باب ۱۱

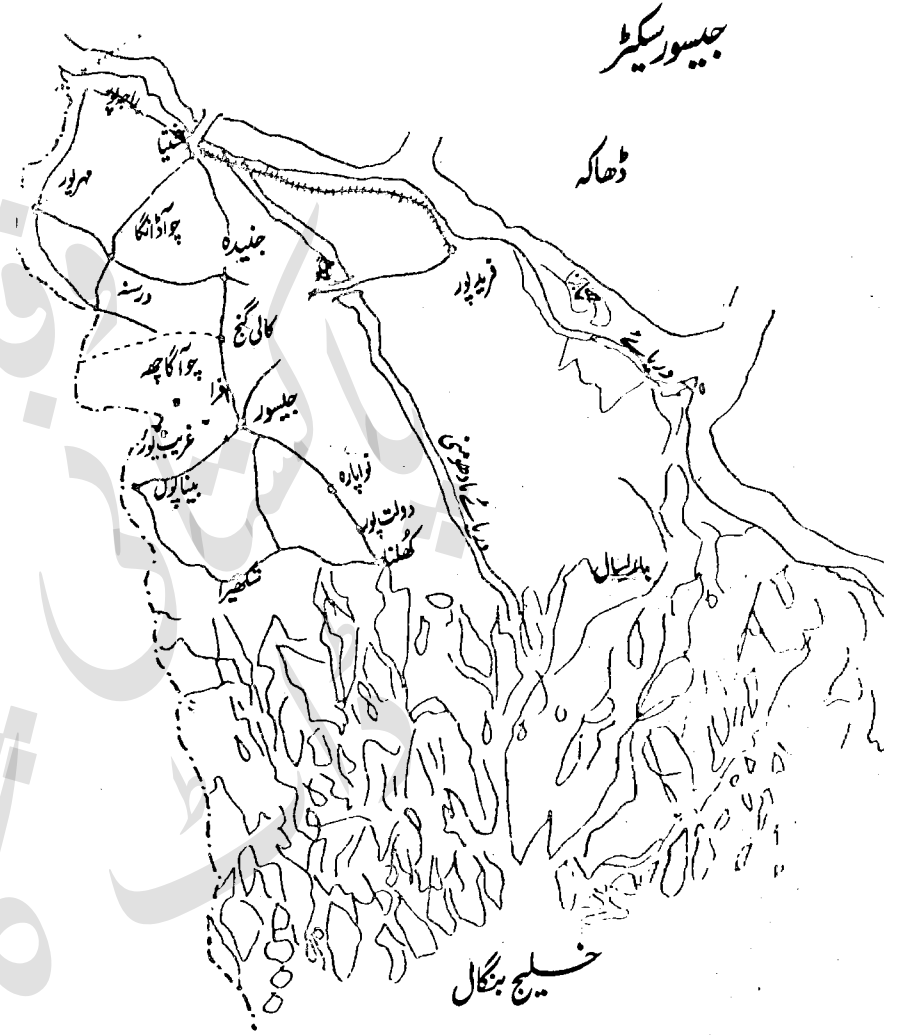
### جیسور سیکٹر (۹ ڈویژن)

جیسور سیکٹر مشرقی پاکستان کا جنوب مغربی علاقہ تھا جس کے شمال میں دریائے گنگا، مشرق میں دریائے میکھنا اور جنوب میں خلیج بنگال بھی مغربی جانب مغربی بنگال کی مشرقی سرحد لگتی تھی۔ اس علاقے کے اہم شہر کلٹنا، جیسور، جیندہ، بشتیا، بارسیال اور فرید پور تھے۔

اس سیکٹر کا بارڈر چھ سو کلومیٹر کے لگ بھگ تھا، اندرونی مواصلاتی نظام خصوصاً سڑکیں اور ریل کی سڑکیاں شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی تھیں اور ان کا فاصلہ بین الاقوامی سرحد سے کمین تیس اور کمین ساٹھ کلومیٹر بنتا تھا جنوب سے شمال کی طرف جاتے ہوئے اس سڑک پر اہم شہر کلٹنا، جیسور، جیندہ اور کشتیا پڑتے تھے۔ اس کے علاوہ دو سڑکیں جیسور اور جیندہ سے مشرق کی طرف جاتی تھیں جنہیں بوقت ضرورت فوجی کارروائی کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ جیسور اور جیندہ سے مشرق میں ایک چھوٹا سا دریا "مادھوتی" بہتا تھا جو دفاعی نقطہ نظر سے بہت مفید تھا۔ مجموعی طور پر سارا سیکٹر میدانی تھا جس میں آزادانہ طور پر فوجی گاڑیوں کی نقل و حرکت ہو سکتی تھی، البتہ ٹینکوں کے لیے اسے ناموزوں سمجھا جاتا تھا، کیونکہ راستے میں کئی چھوٹے بڑے نالے پڑتے تھے۔

دریائے گنگا کے جنوبی کنارے میں بین الاقوامی سرحد پر ایک چھوٹی سی جگہ تھی جسے راجہ پور کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس سے لے کر نیچے (جیسور سے شمال مغرب میں) درسنہ تک کا علاقہ بریگیڈ ۹ کے ماتحت تھا جنہوں نے اپنے ۵ بریگیڈ کا ہیڈ کوارٹر جیندہ میں بنا رکھا تھا۔ جیسور سیکٹر کا پچھل نصف حصہ یعنی درسنہ سے خلیج بنگال تک بریگیڈ ۹ کے ماتحت تھا جس کے پاس تھا جن کا (۱۰۶) بریگیڈ ہیڈ کوارٹر جیسور میں تھا۔ یہ دونوں بریگیڈ ۹ ڈویژن کے زیرِ نگرانی تھے جس کے جی او سی میجر جنرل محمد حسین انصاری (جنگا گنگہ فیم) تھے۔ زمانہ امن میں ان کا ہیڈ کوارٹر بھی جیسور میں تھا، لیکن جنگ شروع ہونے سے چند دن پہلے وہ دریائے مادھوتی اور جیندہ کے درمیان منگورہ کے مقام پر منتقل ہو چکے تھے۔ دو بریگیڈوں کے علاوہ اس ڈویژن میں ای پی سی لے ایف کے سپاہی اور رضا کار وغیرہ بھی تھے جن کے ذمے کلٹنا کا دفاع تھا۔ وہاں کے کمانڈر کرنل فضل حمید تھے۔

جنرل نیاز نے مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے دفاعی قلعوں، پرنسپی جس اسٹریٹیجی کا انتخاب کیا تھا، اس کے تحت اس سیکٹر میں جیسور اور جیندہ کو منسوں کی حیثیت حاصل تھی جبکہ کشتیا اور کلٹنا وغیرہ اہم مقام (STRONG POINT) سمجھے جاتے تھے۔ دفاعی منصوبہ یہ تھا کہ دشمن کو پہلے تو راجہ پور، درسنہ، بینا پول اور دیگر سرحدی مقامات پر روکا جائے اور پھر آہستہ آہستہ "تھوڑی سے تھوڑی زمین زیادہ سے زیادہ وقت میں" چھوڑتے ہوئے دفاعی قلعوں میں آجائے اور پھر وہاں آخری دم تک ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ قیاس یہ تھا کہ دشمن جیسور اور جیندہ میں سے اول تو دونوں یا پھر ایک قلعے کو سخر کرنے کے بعد ہی آگے



بین الاقوامی سرحد  
سڑکیں  
ریلوے  
دریا

بڑھنے کی سوجھ بگاڑ، ور نہ ہندو کا اتنا دلدادہ کہاں کہ وہ اپنے پیچھے ایک ایک قلعے میں ایک ایک بریگیڈ کی پروا کیے بغیر سیدھا ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی کرے۔ یہ بھی خیال تھا کہ اگر اس نے کسی قلعے کو فتح کرنے کے بجائے اسے محض محصور کرنے پر اکتفا کیا تو حصار باندھنے والی فوج محصور فوج (یعنی ایک بریگیڈ) سے کم نہ ہوگی، یعنی جیسو سیکٹر میں اگر اس نے دفاعی قلعوں کو محصور کر کے آگے بڑھنا چاہا، تو اس کے دو بریگیڈ (یعنی ایک ڈویژن) تو حصار بندی میں صرف ہوجائیں گے، آگے بڑھنے کے لیے اسے علیحدہ فوج درکار ہوگی جو وافر تعداد میں اس کے پاس موجود نہ تھی۔

ہمارے تخمینے کے مطابق بھارتی جیسو سیکٹر میں تین لاکھوں سے حملہ کر سکتا تھا:

(ا) کلکتہ سے بمبائول اور جیسور

(ب) کشن گڑھ سے دسرنہ اور چوڑا لنگا

(ج) مرشد آباد سے راجپور اور کشیتا

فوجی ذہن عموماً حملے کا رخ متعین کرتے وقت ریل و وسائل کے ذرائع کو بہت اہمیت دیتے ہیں، لہذا مذکورہ بالا تین راستے ہی بھارتی تعداد میں ٹرکوں توپوں اور ٹینکوں کی آمد و رفت کے لیے استعمال ہو سکتے تھے، لیکن بھارتی منصوبہ بندیوں کی داغ بیلجی کہ انہوں نے متوقع راستوں میں سے کسی کو بھی نہ اپنایا۔ انہوں نے باقاعدہ جنگ سے پہلے ہمارے علاقے میں جہاں جہاں قدم چما رکھے تھے، وہیں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ آپ کو یاد ہوگا ۱۲ نومبر کو جیسو سیکٹر میں ایک چھڑپ ہوئی تھی جس میں ہمارے چھ ٹینک اور دو سویدر طیارے تباہ ہو چکے تھے اور ایٹرن کمانڈ نے شور مچایا تھا کہ بھر پور جنگ چھڑ گئی۔ یہ واردات بوہرہ یا غریب پور کے مقام پر ہوئی تھی جہاں راتوں رات بھارت نے قبضہ کر لیا تھا اور ہم اسے پسپا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ہم نے صرف اتنا کیا تھا کہ ڈویژن کے وسائل کام میں لاتے ہوئے دشمن کے مورچوں کے سامنے حصار باندھ دیا تھا تاکہ وہ آگے نہ بڑھنے پائے۔ یہ بریگیڈیر محمد حیات کے ۱۰۰ بریگیڈ کا علاقہ تھا، دوسرا سرحدی علاقہ جو باقاعدہ جنگ سے قبل دشمن کے قبضے میں ہوا چکا تھا، دسرنہ کے قریب جہنم نگر تھا جو بریگیڈر منظور کے ۵۰ بریگیڈ میں واقع تھا جنگ چھڑنے پر جیسو سیکٹر میں دشمن نے انہی مقامات سے آگے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ آئیے پہلے بریگیڈیر محمد حیات کے علاقے کا حال دیکھیں۔

غریب پور کے مقام پر ۱۵۰ مربع کلومیٹر علاقہ بھارت کے قبضے میں تھا۔ وہاں سے جیسو سیکر ٹوپ کے گولے کا فاصلہ بیشک ۱۱۱ کلومیٹر بنتا تھا۔ نومبر والے واقعہ کے بعد اگرچہ دشمن نے پیش قدمی روک لی تھی مگر وقتاً فوقتاً جیسو سیکر کی طرف گولے پھینک کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا رہتا تھا۔ ۱۳ نومبر کو بھر پور جنگ چھڑنے کے بعد گولہ باری میں مزید شدت آگئی اور دشمن نے حصار توڑ کر آگے بڑھنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہماری طرف سے تین پلٹنیں یعنی ۱۲ پنجاب، ۲۱ پنجاب اور ۲۲ ڈیٹری فورس کی ایک کمپنی اسے روکے ہوئے تھی جن کی پوزیشن بڑبڑاٹھ آر (R-8) اور راجپور کے علاقے میں تھی۔ دشمن نے گھیراؤ کر جیسو سیکر کی طرف بڑھنے کی کوشش کی، مگر ہماری فوج نے زبردست مزاحمت کی۔ دشمن بار بار اس حصار سے سرگرم تھا اور ہر بار پسپا ہو کر اپنے کچھار میں دب جاتا۔ یہ رسائی ساتھ گھنے جھاری رہی، گویا ۱۴ دسمبر کی صبح تک دشمن اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

لے یہ دونوں مقامات قریب قریب تھے۔

اسی حصار پر جیسو سیکر کے دفاع کا انحصار تھا، کیونکہ اگر ایک دفعہ بند ٹوٹ جاتا، تو ریل سیدھا جیسو میں رکتا، کیونکہ درمیان میں کوئی دفاعی لائن نہ تھی، بلکہ زیادہ تر توپیں ناک بات بریگیڈ کے جیسو سیکر کے دفاعی قلعے میں راشن اور ایندھن تو وافر مقدار میں تھا، مگر وہاں لڑنے والے نہ تھے۔ وہی سپاہی جو سرحد کے ساتھ تنگے ہوئے تھے، اُنہی کو واپس آکر جیسو سیکر کے ارد گرد مورچے سنبھالنے تھے۔ یہ سپاہی جیسو سیکر سے قریب ترین مقام پر مینا پول (۳۳ کلومیٹر) اور بعد میں مقام پر سنگھیرہ (۶۰ کلومیٹر) میں تھے۔ بریگیڈیر محمد حیات جو ایک عمدہ فوجی کمانڈر سمجھے جاتے تھے، اس نکتے کو بخوبی جانتے تھے کہ اگر غریب پور، الاحصار ٹوٹ گیا، تو سرحدوں سے سپاہی واپس لاکر جیسو سیکر کا دفاع منظم کرنے سے پہلے دشمن جیسو میں داخل ہوجائے گا۔ بہت سے ذرائع نے تصدیق کی ہے کہ انہوں نے جنگ چھڑنے سے پہلے اپنے جی اوسی میجر جنرل ایم۔ ایچ۔ انصاری کو اس خطرے سے آگاہ کیا تھا اور اجازت چاہی تھی کہ وہ سرحدوں سے کچھ نفری واپس لاکر جیسو میں رکھ لیں تاکہ دشمن کو کم از کم اتنی دیر کے لیے روکھا جاسکے کہ باقی نفری جیسو پہنچ جائے جنرل انصاری نے ۵۰ کلومیٹر پیچھے ہٹنے کو گورہ کے مقام پر بیٹھے تھے، اس اقدام کی اجازت نہ دی کیونکہ جنرل نیازی نے کہہ رکھا تھا کہ جب تک تین چوٹھائی آدمی شہید یا زخمی نہ ہوجائیں سرحدوں سے کوئی پیچھے نہ ہٹے۔

بریگیڈیر حیات نے یہ سرکاری حکم مان لیا، لیکن اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ غریب پور کا حصار ٹوٹنے کے بعد جیسو میں قلعہ بند ہونے کے بجائے کھلنا کی طرف سپاہی ہر نامفید ہوگا تاکہ سرحدی علاقوں میں پھیلی ہوئی نفری کو اکٹھا کرنے کا وقت مل سکے۔ اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے جنگ سے قبل اہم تھاہاروں کا ایندھن جیسو سیکر سے کھنا منتقل کر دیا تھا۔ یہ کارروائی جنگی منصوبے کے سراسر منافی تھی۔ دفاعی منصوبے میں کہا گیا تھا کہ سرحدوں سے سپاہیوں کو جیسو اور "جندیہ" کے دفاعی قلعوں میں پھر پور لڑائی لڑی جائے گی اور اگر لفظں محال ان قلعوں کو چھوڑنا پڑا، تو سپاہی منگورہ کی طرف ہوں گے نہ کھلنا کی طرف۔ بریگیڈیر حیات کے افسروں کا کہنا ہے کہ منگورہ یا ماہوتھی کی طرف پسپائی کا کسی منصوبے میں ذکر نہ تھا، اس لیے منصوبے کے منافی کارروائی کا الزام سراسر غلط ہے، جبکہ ایٹرن کمانڈ کے بریگیڈیر یا واقعہ یعنی کا کہنا ہے کہ یہ بات زبانی طور پر جنرل انصاری کو بتائی گئی تھی اور تحریری طور پر اس کا ذکر دفاعی منصوبے میں اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ جو نیزہ اسٹریٹیجی کی طرف دیکھنا شروع نہ کر دیں۔

پسپائی کا تعین کس طرف اور کس سطح پر کیا گیا تھا، اس سے قطع نظر بریگیڈیر حیات نے کھلنا کو ترجیح دی اور جنگ کے تیسرے روز (۵ دسمبر) ایک پٹھان کمانڈنگ آفیسر کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا: "دیکھنا، ہمیں سوتے ہوئے پکڑے نہ جانا، اگر ہمیں جیسو چھوڑنا پڑا، تو ہمارا رخ منگورہ کی طرف نہیں کھلنا کی طرف ہوگا۔"

ادھر بریگیڈیر حیات اپنی پسپائی کا رخ متعین کر رہے تھے اور ادھر دشمن گھیراؤ نے کی سرٹو لوشن کر رہا تھا۔ اس نے جنگ کے ابتدائی دنوں میں ہمارے سپاہیوں کو پیچھے دھکیل کر اپنے گلے کا طوق ڈرا وسیع کر لیا تھا، مگر مکمل طور پر گھیراؤ نے نہیں کامیاب نہ ہوا تھا۔ گھیراؤ کھلا ہونے کے بعد اب ہماری پلٹنوں کی دفاعی لائن قائم کھولا، سنوٹش نگر اور امرت بازار کی سیدھ میں آگئی تھی۔ گھیرے کی نئی پوزیشنوں کی وجہ سے ساتھ والی پلٹن (۲۲ الیف ایف) کی پوزیشن کو بھی بدلنا پڑا۔ اس پلٹن کی ایک کمپنی کو جو مینا پول کی سرحدی چوکی پر تھی، چھ کلومیٹر پیچھے سارچہ کے مقام پر منتقل کر دیا گیا اور دوسری کمپنی جو راکھونا تھ میں تھی اسے بھی پیچھے ہٹا کر جھنگر گاؤں میں متعین کیا گیا۔ گویا مجموعی طور پر ہمارا حصار سرحد سے اور پیچھے آگیا تھا۔

بریگیڈیر حیات کے بریگیڈ (۱۰۰) کو بھارت کے ڈویژن کا سامنا تھا۔ اس نے چھ دسمبر کو حصار ٹوڑنے پر اپنی پوری طاقت

صرف کر دی، پہلا دھوا دھوا صبح کے وقت بولا جو نام رکھا، دوسرا حملہ ۱۱ بجے کے قریب کیا، جو بے اثر ثابت ہوا، البتہ دوپہر کو اس کی تیسری کوشش جدوی طور پر کامیاب ہو گئی۔ اس کا ہراول دستہ ہماری ایک پلاٹن (تقریباً ۳۰ آدمی) کو روندنا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بد قسمتی سے اس شگاف کو پُر کرنے کے لیے فالتوفری دستیاب نہ تھی۔ جوپایا جہاں موجود تھے، انہیں وہاں سے ہٹانے سے ایک اور شگاف پیدا ہو سکتا تھا چنانچہ پنجاب کے سینکڑوں کمانڈر (نائب سالار) میجر جی نے حبیبور میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی کہ ہماری دفاعی لائن میں شگاف پڑنے سے دشمن کے ٹینک اور کبوتر بند گاڑیاں حبیبور/جنیدہ روڈ کی طرف دوڑی جا رہی ہیں۔ بریگیڈیر حیات کو یہ پیغام کوئی تین بجے سپر (۹ دسمبر) ملا۔ ۲۲ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل ٹمس اُس وقت اُن کے پاس تھے۔ بریگیڈیر حیات نے ٹمس سے کہا کہ وہ اپنی پلٹن کو مینا پول/حبیبور روڈ سے ہٹا کر کھٹنا/حبیبور روڈ پر "نواں پارہ" کے مقام پر لے جائیں اور ایک کمپنی کو حبیبور شہر کے چوک میں چھوڑ جائیں تاکہ باقی پلٹنوں کو صحیح سمت میں جانے میں رہنمائی کر سکے۔ پسپائی۔ جانب کھٹنا۔ کی اطلاع وائٹس پر باقی پلٹنوں کو بھی دے دی گئی۔

بریگیڈیر حیات اور ان کے ہیڈ کوارٹر نے ساڑھے پانچ بجے شام حبیبور کو خیر باد کہا، جب وہاں دشمن کا نام و نشان تک نہ تھا۔ انہوں نے کھٹنا کی طرف روانگی میں اتنی عجلت دکھائی کہ حبیبور میں مدفون ایمونیشن کے ذخیرے بھی نذر آتش نہ کر سکے بغیر ملکی صحافیوں نے جو بھارتی افواج کے ساتھ تھے، مجھے بتایا کہ انہوں نے ہالے بریگیڈ کمانڈر کا خالی خیرہ کھاجس کی ایش ٹریے میں آدھا جلا ہوا سگریٹ رکھا تھا، وہاں کھڑکوں کے دفتر دیکھے جہاں ٹاپ کی شینوں میں ابھی تک کاغذ چڑھے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اتنی عجلت کا کوئی جواز نہ تھا، کیونکہ یہ ہیڈ کوارٹر چھ دسمبر کی شام کو خالی کیا گیا اور بھارتی دستے ۷ دسمبر کی دوپہر کو حبیبور میں داخل ہوئے۔ دراصل بھارتی اندھا دھند حبیبور میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا، اس کا خیال تھا کہ اس "دفاعی طلوع" کو مسخر کر لے میں بڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لیے وہ اگرچہ ۱۱ دسمبر کی شام یا سپر کو اس کے گرد و نواح میں پہنچ چکا تھا، مگر داخل ہونے سے پہلے بھر پور تیاری ضروری سمجھتا تھا۔

بریگیڈیر حیات کے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ چھ دسمبر کی شام کو حبیبور سے منگورہ جانے والی سڑک دشمن کے قبضے میں جا چکی تھی اس لیے اس طرف پسپائی میں زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم تاثر حقیقت کے برعکس ہے کیونکہ رات گئے اسی راستے سے ہمارے کئی افسر منگورہ گئے اور انہیں وہاں دشمن کے کوئی آثار نظر نہ آئے لیفٹیننٹ کرنل احسان جو اسی رات سے گزرتے بتاتے ہیں کہ انہوں نے راستے میں اپنی ملٹری پولیس کے دستے دیکھے جن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ حبیبور سے منگورہ جانے والی ٹریفک کی رہنمائی کریں۔ انہیں جب جگہ سڑک کے مرمت شدہ حصے نظر آئے تاکہ ٹریفک بلا رکاوٹ گزر سکے۔ اس کے علاوہ حبیبور سے جنیدہ جانے والی سڑک پر بھی چھ دسمبر کی رات کو ۱۰ بجے تک ہمارے آدمی بلا روک ٹوک گزرے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر بریگیڈیر محمد حیات دلی طور پر منگورہ کی طرف ہٹنا چاہتے، تو وہ ہٹ سکتے تھے۔

آئیے ذرا دیکھیں کہ بریگیڈیر حیات نے جو راستہ اختیار کیا، اُدھر کیا پیش آیا۔

۹ اور ۷ دسمبر کی دینی رات ۱۰، بریگیڈ کے لیے بڑی بھگدڑ کی رات تھی۔ اس بریگیڈ میں جتنی نفری تھی، اُسے پتہ تھا کہ اگر اپنا

ہرنا پڑا، تو حبیبور جانا ہو گا۔ ان میں سے کوئی بھی کھٹنا جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اکثر نے "نواں پارہ" کا پہلے بھی نام تک نہ سنا تھا۔ افسر کھٹنا کی طرف مراجعت میں پوشیدہ حکمت سے نا آشنا تھے۔ وہ حکم کے بندھے ہوئے بھاگ بھاگ حبیبور پہنچے جہاں چوک میں ۲۲ ایف ایف کی کمپنی (مجر باہر) نے انہیں کھٹنا کی راہ پر ڈال دیا۔ اس بھگدڑ میں ایک ایرینس گاڑی "نواں پارہ" کے بجائے "غریب پور" کی طرف دوڑتی نظر آئی۔ اُسے روک کر ڈانٹا گیا کہ "بھٹو، تمہیں آتنا بھی اندازہ نہیں کہ نواں پارہ کدھر ہے، تم مخالف سمت میں مڑنا اٹھا لے چلے جا رہے ہو" ڈرائیور نے منہ دیکھ کر جواب دیا "سر مجھے سمت کا اندازہ ہے، مگر میں غریب پور سے زخمیوں کو نکالتے وقت بعض سپاہیوں سے وعدہ کر آیا تھا کہ انہیں دوسرے پھرے میں لے جاؤں گا، وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

۷ اور ۱۰ بریگیڈ کو دراصل ایک ہی جہت میں نواں پارہ نہیں پہنچنا تھا۔ اسے راستے میں سب سے پہلے سنگ میل نمبر ۳ پر روکا گیا۔ وہاں اُس کے قدم نہ جم سکے، تو وہ سنگ میل نمبر ۵ پر چاٹا لگا، وہاں دشمن کو آتے دیکھا، تو مزید پانچ میل پیچھے ہٹ گیا پہلا معرکہ آہر کو سنگ میل نمبر ۲۰ پر پڑا اور پھر ایک ہی جہت میں سنگ میل نمبر ۹ (دولت پور) تک پسپا ہو گیا۔ وہاں اس نے دشمن کا دھڑلہ مقلدہ کیا۔ ۹ دسمبر کی صبح کو یہ بریگیڈ دولت پور چھوڑ کر کھٹنا جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ دھاک سے جنگ بندی کی اطلاع آگئی مجموعی طور پر دیکھا جائے، تو بریگیڈیر حیات نے یہ پرائیویٹ جنگ بڑی مہارت سے لڑی اور وہ دشمن کا ایک ڈویژن اپنے تعاقب میں دولت پور تک لے جانے میں کامیاب ہو سکے۔

کھٹنا کا ہنگامی بریگیڈ جو کرنل فضل حمید کے زیر کمان تھا، حبیبور خالی ہونے کی خبر سن کر بدک اٹھا۔ اُس نے اُسی رات (۹ اور ۷ دسمبر) اپنا بوریا سٹرک لیا اور نقل و حمل کا جو ذریعہ ملا، اُسے قابو کر کے دھاک کی طرف کوچ کر گیا۔ کھٹنا میں یوپی کے سب سے سینئر افسر کمانڈر گل زریں تھے۔ انہوں نے آؤ دیکھنا تاؤ اپنے اعلیٰ افسروں کو اطلاع دیلے بغیر ایک گن بوٹ میں سوار ہو کر سمندر کی طرف نکل گئے جس طرح حبیبور فالتوفری میں چھوٹا، اس سے کہیں زیادہ بھاگ بھاگ میں کھٹنا خالی ہو گیا۔ اب آئیے جہل انصاری کے دوسرے بریگیڈ (۷۷) کی طرف جس کی قیادت بریگیڈر منظور کے سپرد تھی، بریگیڈر منظور اپنی شرافت اور ملائمت کے لیے مشہور تھے۔ ان کے بریگیڈ کو بھارت کے ہم پٹری ڈویژن کا سامنا تھا۔ بریگیڈر منظور کے پاس دو مکمل پلٹنیں (۲۹ بٹالین اور ۱۸ بٹالین) اور ایک کمپنی تھی جو ۱۲ پنجاب (آر اینڈ ایس) سے تعلق رکھتی تھی بھاری ہتھیاروں میں ان کے پاس توپ خانے کی ایک رجمنٹ اور (۲۴-۴۸) میٹکوں کا ایک اسکواڈرن تھا۔ یہ ٹینک و حقیقت ایٹرن کمانڈر کی "ملکیت" تھے جو آڑے وقت میں کسی بھی بریگیڈ کو دیے جا سکتے تھے۔ انہیں کشمیر کے پاس رکھا گیا تھا کہ وہ دریائے گنگا کے دونوں جانب کسی بھی مقام پر استعمال کیے جا سکیں۔

دسمبر کے ابتدائی ایام میں بریگیڈر منظور اپنے ہیڈ کوارٹر (جنیدہ) میں بیٹھے تھے کہ ان کو خبر ملی دشمن "جہنم" جہاں وہ پہلے ہی اپنے قدم جا چکا تھا) سے پھیل کر درسنہ کی طرف بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ درسنہ ایک سرحدی قصبہ تھا جس کے ہاتھ سے جانے سے گورنر مالک کے آبائی قصبے چوڈا اٹکا کے لیے راستہ کھل جاتا تھا اور اگر دشمن چوڈا اٹکا پہنچ جاتا، تو وہ اگلی

لے ان دونوں سڑک پر میلوں کے نشان تھے۔ حکومت کا نظام ابھی رائج نہیں ہوا تھا۔

جست میں جنیدہ یا کشتیا جاسکتا تھا۔ بریگیڈیئر منظور نے دشمن کو سرحدی علاقے میں روکنے کے لیے خود آگے جانا مناسب سمجھا۔ مگر ان کی آمد سے جنگی صورت حال پر کوئی اثر نہ پڑا۔ جنگ کے پہلے دن ہی دشمن نے جھپٹ کر درہم برہم کر لیا۔ بریگیڈیئر منظور نے اب ساری تیاریاں کر لیں۔ انہوں نے سرحدی جنگوں سے اپنی ساری نفی بکرا کر وہاں جمع کی اور دشمن کا انتظام کرنے لگے۔ دشمن ایسا بے مروت نکلا کہ اس نے بریگیڈیئر منظور کی توقعات پر پورا اترنے کے بجائے اپنے لیے ایک نئی جہت کا انتخاب کیا۔ قیاس تھا کہ اس کا رخ حسیو جنیدہ روڈ پر واقع کالی گنج کی طرف ہو گا تاکہ ۷۵ بریگیڈ اور ۱۰۰ بریگیڈ ایک دوسرے سے کٹ جائیں۔ دشمن کو اس حرکت سے باز رکھنے کے لیے جنرل انصاری نے اپنے کرنل شات کرنل آفریدی کو بھیجا جنہوں نے ۵۰ پنجاب کی دو کمپنیوں اور جتین مگر سے لکھڑی ہوئی ۳۸ ایف ایف کے اجراء کو مل کر ایک ٹاسک فورس (TASK FORCE) قائم کر لی اور کالی گنج کے قریب دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ تعجب کی بات کہ اِدھر بھی دشمن طلوع نہ ہوا۔ آخر وہ کیا کہاں؟

بھارتی فوج ملتی باہنی کی انگلی بٹڑے برساتی نالوں سے بھرتی ہوئی چوڑا ڈانگا اور جنیدہ کے درمیان سادھو پٹی کے مقام پر جانگلی جہاں اس کا استقبال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ۱۰ اور ۵۰ بریگیڈ درمیانی رات کو پہلے پہل اس کی صرف ایک کمپنی اور چند ٹینک (ایک ٹروپ) وہاں پہنچے۔ اس کمپنی کے کمانڈر بھارتی میجر نے بعد میں بتایا کہ وہ پہلی رات کا پتہ لہا کہ مجھے کہاں ڈالا گیا ہے۔ ایک طرف جنیدہ ہے دوسری طرف چوڑا ڈانگا میں دو جہڑوں میں پس کر رہا ہوں گا۔ رات رام رام کرتے گزری، مگر ہماری طرف سے اس کی کوئی نہ پہنچا۔ اگلی صبح دس بجے راشن دھونے والی چند گاڑیاں چوڑا ڈانگا سے جنیدہ جا رہی تھیں۔ بھارتی میجر نے لکھا کہ قبل از وقت ان پر فائر کر دیا۔ وہ گاڑیاں واپس چوڑا ڈانگا چلی گئیں اور یوں بریگیڈیئر منظور کو اطلاع ملی کہ ان کا اپنے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔ اب ان کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ بلا تاخیر سادھو پٹی پر حملہ کر کے رکاوٹ کو دور کر دیں، دوسرا یہ کہ وہ چوڑا ڈانگا (JOINT STRONG POINT) تھا کو اپنا مسکن بنائے رکھیں جہاں ان کا تقریباً سارا بریگیڈ جمع تھا۔ انہوں نے جنگی صورت حال کا نہایت ملائمت سے جائزہ لیا۔ پہلے ایک ایئر کونسلر کو بلا بھیجا کہ جاؤ بھی ذرا پتہ تو کر آؤ کہ واقعی دشمن وہاں ہے بھی کہ نہیں۔ جب اس کی تصدیق ہو گئی، تو انہوں نے ایک صفحہ بھر دوسرے روانہ کیا کہ جاؤ بھی اُس کو وہاں سے ہٹا دو۔ وہ ناکام لوٹ آیا، تو میجر میرزا زہد کی قیادت میں ایک پلاٹون کو روانہ کیا۔ اب چھ دھمکے ہوئے تھے۔ دشمن نے گزشتہ ۲۴ گھنٹوں میں نہ صرف اپنی دفاعی پوزیشن مضبوط بنالی تھی، بلکہ مزید فوج اور ٹینک بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میجر زہد پلاٹون کے دشمن کے قریب پہنچے اور حملے کی تیاری کرنے لگے۔ اتنے میں حکم ملا کہ نہیں جھٹی، واپس آ جاؤ، ایک پلاٹون بھاری کیا کرے گی۔

اسی دن (۱۰ دسمبر) حسیو رنجی خالی کیا جاسکتا تھا۔ شام کو جنرل انصاری نے بریگیڈیئر کو لارڈ جنیدہ میں ٹیلی فون کیا۔ بریگیڈیئر منظور کا بریگیڈ میجر میجر بھولا جرنل انصاری نے کہا: "جھڑ کیا ہو رہا ہے؟" "کچھ خاص کام تو نہیں ہو رہا،" اچھا، تو تم منگورہ آ جاؤ اور (کرنل) آفریدی سے بھی کہو کہ وہ کالی گنج سے واپس آ جائے یہاں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے دفاع کے لیے کوئی نہیں۔ حسیو رنجی جاکا۔

اسی رات کرنل آفریدی کی نفی بھی جنیدہ واپس آ گئی اور اگلی صبح (۱۱ دسمبر) میجر جعفر نے بریگیڈیئر کو لارڈ کا عملہ، فائلیں اور

نقشے گاڑیوں پر لادے اور منگورہ روانہ ہو گئے۔ آخری گاڑی گیارہ بجے نکلی۔ اسی شام دشمن گولی چلائے بغیر ڈویژن کے دوسرے دفاعی ٹکڑے میں داخل ہو گیا۔

بریگیڈیئر منظور شرافت سے چوڑا ڈانگا میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے سوچا میں یہاں بیکار بیٹھا کیا کر رہا ہوں۔ اگر میں محصور ہو گیا تو راش اور ایئیشن بھی زیادہ عرصہ ساتھ نہیں دے گا، کیوں نہ کشتیا چلا جائے، وہاں چل کر دیکھتے ہیں کہ صورت حال کیا بنتی ہے۔ چنانچہ وہ ۷ اور ۸ دسمبر کی درمیانی رات کو اپنی سپاہ کو کشتیا منتقل کرتے رہے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے شہر کے ارد گرد فوجی دستے متعین کر دیے تاکہ دشمن کسی طرف سے ان پر حملہ نہ کرے۔ انہوں نے حکم دیا کہ کوئی بھی اطلاع کر دی کہ میں کشت و خون سے بچتا ہوں کشتیا پہنچ گیا ہوں۔ اس پر ایئر لیا کمانڈر ہیڈ کوارٹر نے ان سے کہا کہ وہ سڑک کے راستے جنیدہ پہنچ جائیں یا ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ منگورہ کی طرف چلے جائیں۔ بریگیڈیئر منظور نے ذرائع آمد و رفت کی قلت اور متوقع مزاحمت کے پیش نظر کسی ایک طرف جانے سے معذوری ظاہر کر دی۔ انہوں نے کشتیا ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔

ان کی وہاں موجود فوجی نقطہ نگاہ سے اگر مفید ہو سکتی تھی، تو یوں کہ دشمن مشرق کی طرف مزید پیش قدمی سے پہلے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کے بائیں بازو پر ایک پاکستانی بریگیڈ موجود ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ دشمن نے ۸ دسمبر کو جنیدہ کی طرف سے ایک بھاری جہت کشتیا کی طرف روانہ کی۔ بریگیڈیئر منظور نے میجر زہد کی قیادت میں ۸ پنجاب کی ایک کمپنی اور میجر شیر الرحمن کی قیادت میں نصف سکواڈرن ٹینک روانہ کیے۔ ایک بجے دو پہر تک پڑا جو تقریباً ساٹھ گھنٹے جاری رہا، بالآخر دشمن بہت ہار بیٹھا اور پسپا ہو گیا۔ دسمبر کی ساری جنگ میں ۷۵ بریگیڈ کی یہ پہلی اور آخری لڑائی تھی جو اس نے لڑی۔ خدا کے فضل سے اس میں اسے سرخروئی حاصل ہوئی اور میجر زہد اور میجر شیر کو ستارہ جرات کا اعزاز ملا۔

دشمن بھاگتے ہوئے اپنی لاشیں بھی وہیں چھوڑ گیا۔ ایک لاش جو ایک بھارتی جرنل کے بیٹے کی تھی، سڑک کے کنارے یوں پڑی تھی کہ دھڑ سڑک کی دھولوں پر تھا اور سڑک کے کنارے میدان کارزار کی گرا مگر میں ہزار ایک ٹینک (اس مرد کی کھوپڑی کچلتا ہوا گزر گیا۔ بعد میں دوران اسیری میجر زہد اور میجر شیر کو اس کی کڑی سزا جھگٹی پڑی۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے بھارتی لاشوں کو جان بوجھ کر مس کیا ہے۔

کشتیا پر بری جہلہ تو ناکام ہو گیا، مگر توپوں اور پیادوں کی بمباری زور پکڑ گئی۔ وہ باری باری کشتیا پر "چاند ماری" کرتے جس سے نقصان کم اور دہشت زیادہ پھیلی۔ پتھوڑے اور آہرن والی مثال تھی، لیکن پتھوڑے چلائے والوں کے تھکنے سے پہلے آہرن کی قوت برداشت جواب دے گئی اور بریگیڈیئر منظور نے طے کیا کہ وہ ہار ڈنگ پل کے ذریعے دریائے گنگا پار کر جائیں تو شاید محفوظ ہو جائیں گے۔

انہوں نے ۱۰ اور ۱۱ دسمبر کی درمیانی رات کشتیا کو خیر باد کہا۔ راتوں رات ۷۵ بریگیڈ کی میشر نفی، گاڑیاں اور جنگی ساز و سامان پل پار کر کے ۱۴ ڈویژن کے علاقے میں آ کر گیا، مگر اگلی صبح بھارتی فضائیہ نے پل پر بمباری کر کے اسے ناقابل استعمال بنا دیا۔ ابھی تک اگر پل بھارتی فضائیہ سے محفوظ تھا، تو شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صحیح و سالم اس پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن اب اسے یوں استعمال ہوتے دیکھ کر وہ رہ نہ سکے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ باقی ماندہ نفی دریا کے پار کیسے جائے؟ اس نفی میں صرف فوجی یا نیم فوجی ہی نہیں، بہت سے بنگالی یا بھاری

سولہ ملین بھی تھے جو پاکستان سے محبت کی وجہ سے پاک فوج کے بغیر اپنی زندگی خطرے میں سمجھتے تھے۔ ان میں بوڑھے، بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ اکثر نے اپنے اپنے اثاثے چھوٹی چھوٹی گٹھڑیوں میں باندھ کر بغل میں دبا رکھے تھے۔ اُن کو دریا پار کرنے میں کورا آف انجینیر کے میجر لاٹھور نے بہت کام کیا۔ وہ کشتیوں کے ذریعے انہیں ٹوٹے ہوئے پل سے لے کر اگلے کنارے تک بھارت اُن کو وہ بوڑھی عورت یاد ہے جو پوٹلی بغل میں دبائے شکستہ پل سے سالم کشمیشی میں اترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پوٹلی بھارتی تھی، تو خود گرنے کا ڈر تھا اور اپنے آپ کو سچائی تھی تو پوٹلی ہاتھ سے جاتی تھی۔ ایک فوجی جوان نے اُسے سہارا لے کر پوٹلی سمیت کشتی میں بٹھادیا اور وہ دعائیں دیتی پار اتر گئی۔

گویا جیسو دیکھ کر میں ہمارے ڈویژن کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اس کا ایک بریگیڈ (۱۰) اکھنلا کی طرف نکل گیا تھا اور دوسرا (۱۵) دریا پار کر کے شمالی بنگال میں اتر گیا تھا۔ درمیان میں دشمن کے لیے راستہ کھلا تھا کہ وہ جتنی فوج چاہے، لے کر شرش کی طرف پیش قدمی کر جا جائے۔

چنانچہ اب بھارت نے منگورہ کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس ۵۰ پنجاب اور ۳۴ ایف ایف کی وہی نفری تھی جو کرنل آفریدی کالی گنج سے لے کر ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کی طرف آگئے تھے۔ اس چھوٹی سی جمعیت کو پہلے منگورہ میں رکھا گیا اور پھر مزید پیچھے ہٹا کر دریائے مادھوئی کے مشرقی کنارے پر تعینات کیا گیا۔ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر مزید پیامبر کر فرید پور پہنچ چکا تھا جہاں جنرل انصاری مسئلے پر بیٹھے اپنے جیالوں کی کلامیاں کے لیے دعا کرتے رہتے تھے۔ ہمارے اٹھ بھر یہ فوج دریائے مادھوئی کے کنارے دشمن کی آمد کا انتظار کرتی رہی مگر دشمن نے اُس کی طرف اُس وقت تک توجہ نہ دی جب تک ۵۴ بریگیڈ کا آخری فرد دریائے گنگا کے پار نہ اتر گیا، چنانچہ دو دن کے وقفے کے بعد دشمن نے ہماری دفاعی پوزیشن پر فائرنگ کی۔ ہمارے جوانوں نے ڈٹ کر فائر کا جواب فائر سے دیا۔ دشمن کو اندازہ ہو گیا کہ سیدھا چڑھ دوڑنے میں خطرہ ہے، لہذا اس نے ملتی باہنی کی مدد سے سات کلومیٹر اوپر جا کر ایک ایسا مقام منتخب کیا جہاں عارضی پل باندھ کر دریا پار کیا جاسکتا تھا، چنانچہ ایک رات کے وقفے کے بعد ہماری دفاعی پوزیشن پر دائیں پہلو سے حملہ کر دیا۔ اس ریلے میں ہمارے تھکے ہارے سپاہیوں کے قدم متزلزل ہو گئے، انہیں وہاں سے ہٹا کر فرید پور پہنچا دیا گیا۔ وہ وہاں ۱۵ دسمبر کو پہنچے اور اگلے صبح دشمن نے ابھی اُن کے نئے دفاعی قلعے پر دستک نہیں دی تھی کہ ڈھاکہ سے اطلاع آگئی کہ ”جنگ بندی“ کا فیصلہ ہو گیا ہے۔

نالور میکس (۱۶ ڈویژن)

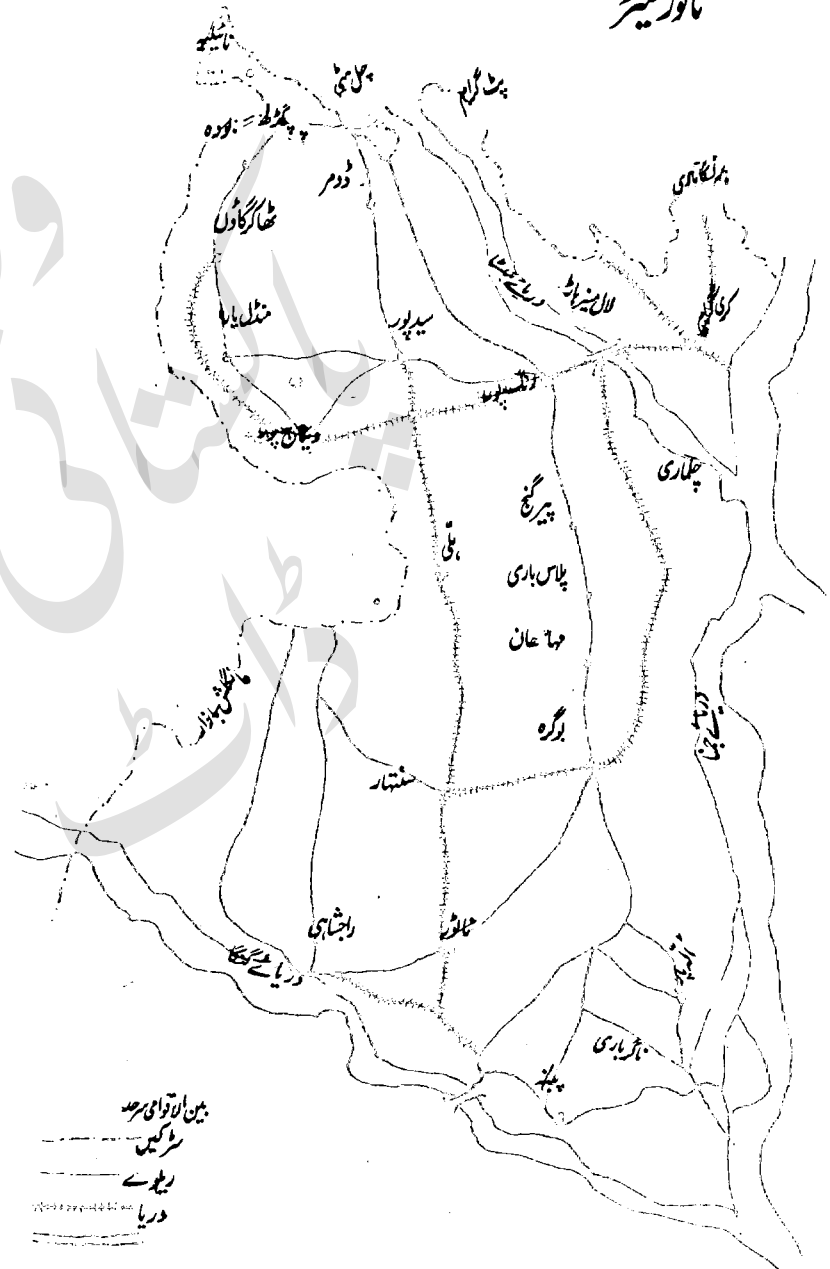
شمالی بنگال باقی صوبے سے دو دریاؤں یعنی گنگا اور جمن کے ذریعے کھل ہوا تھا۔ اس کی مغربی اور شمالی سرحد بھارت سے ملتی تھی۔ رقبے کے لحاظ سے یہ سب سے بڑا کثیر تھا۔ اور اس کی کمان ایک وسیع البرشہ اور وسیع القاب جرنیل کے پر تھی۔ ان کا نام مہر مجر جرنل سید نذر حسین شاہ تھا جو اپریل کے اٹھارویں ۱۹۷۱ء کو جی اوسی بی کر آئے تھے۔ اپریل سے دسمبر تک شہر ہندوں کی سرکوبی اور عوام انتظامی امور کی وجہ سے وہ اپنے علاقے کے چیتے چیتے سے واقف ہو چکے تھے۔

ان کے کیکڑ کی جغرافیائی خصوصیات یہ تھیں کہ اس کے شمال مشرق میں ایک چھوٹا سا دیہات تاجہ جسے ٹیستا (TISTA) کہتے تھے۔ اس دریا کے اُس پار لال منیر ہاٹ کا تھسا ساہواری اڈہ، کمری گرام کا ریلوے جکشن اور پٹ گرام جیسے اہم علاقے واقع تھے۔ گویا یہ علاقہ ذاتِ خود ایک کیکڑ یا سب کیکڑ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کیکڑ کو دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس کا شمالی بارڈر کل پچھتاہرہ جس کی سر مار کا پانچ دس میٹر اندر رکھو آتی تھی اور کہیں جراث زلزلہ دھماکا پندرہ بیس میٹر باہر پھیل جاتی تھی۔ نقشے پر یوں معلوم ہوتا تھا کہ کھلے ہاتھ کی انگلیوں کے پور نظر آ رہے ہیں۔ کوئی اونچا، کوئی نیچا۔ ان کی دفاعی اہمیت یہ تھی کہ اگر سرگڑا کے ساتھ دہلی بستیوں کیے جاتے تو ۱۶ ڈویژن کا بیشتر حصہ انہی کی نذر ہ جاتا اور اگر انہیں یونی چھوڑ دیا جاتا، تو کئی باہمی اور اس کے آقا انہیں آسانی سے ٹپ کر لیتے۔

اس سیکڑ میں کھلے ہاتھ کی بلند ترین اعلیٰ بھارت کی گردن کو جا چھوتی تھی جو مغربی بنگال / بہار کو آسمان / تریہ پورہ سے ملاتی تھی اس گردن کا ٹکڑی کی پڑائی شکل ۲۵ کلومیٹر تھی جس کے جنوبی کونے پر ہماری سرحد کا بلند ترین اُبھار ٹیٹالیا (TITALYA) تھا۔ وشن کوڈو تھا کہ اگر پاکستان نے ٹیٹالیا سے بڑھ کر ۲۵ کلومیٹر کی بچی پر قبضہ کر لیا، تو بھارت کی افواج دو حصوں میں کٹ کر رہ جائیں گی، چنانچہ اس نے جنگ سے پہلے ہی ٹیٹالیا پر قبضہ کر کے اپنے آئنے جانے کا راستہ محفوظ کر لیا تھا۔ اسی طرح باقی انگلیوں کے پور بھی اس نے قلم لکے اپنی سرحد سیدھی کر لی تھی۔

اس سیکٹر کی مغربی سرحد گھوٹے کی کاشی کی مانند تھی۔ دباؤ والی جگہ پر پانی کا مقام تھا جس پر سواری کرنے کی تجارت نے بہت کوشش کی۔ اس کا احوال آگے آئے گا۔ جی کے شمال اور جنوب میں سرحد پھولے ہمارے پیٹ کی طرح باہر نکل آتی تھی۔ ان حصے یا سب سیکٹر میں یہی خطرہ تھا کہ دشمن اس دباؤ کو اور دبا کر شمالی بنگال میں گھس آئے اور وہاں سے ۵۰ کلومیٹر دور انیس ٹنک کو کاٹ ڈالے جو شمال اور جنوب میں ملایطے کا واحد ذریعہ تھی۔ اس علاقے میں ٹنک کے علاوہ شمالاً جہاز پائل کی پٹری بھی تھی، گوکہ اس کے مقام پر بادورے اتنی قریب گزرتی تھی کہ ریلیے ان ٹینک کی حملات ایک ٹنک میں تھی اور پٹری دوسرے ٹنک میں گزرتی تھی۔

## ناتورسکیٹ





مارچ کے بعد حالات خراب ہوتے ہی یہاں سے ریل گاڑیوں کی آمد و رفت معطل ہو گئی تھی۔

باقی سرزمین جو شمال سے چھوٹی اور جنوب کی طرف بڑھتی تھیں، شمالی حصے تک محدود تھیں۔ شمالی اور جنوبی علاقوں کو ملانے والی سرزمین بہت کم تھیں۔ یہاں کی سب سے بڑی ٹرک ۱۵۳ کلومیٹر لمبی تھی جو رنگ پور کو بکرہ سے ملاتی تھی۔ بکرہ سے ایک سرنگ نالور کو نکلتی تھی جہاں جنرل نذر حسین شاہ کا ڈویژنل ہیڈ کوارٹر تھا اور دوسری گونڈ گھاٹ کے راستے دھاکہ کو جاتی تھی۔

اس علاقے میں دشمن کے عزام کیا ہو سکتے تھے؟ ایک خیال یہ تھا کہ وہ اپنی گردن کو جسے SILIGURI NECK کہا جاتا ہے بچانے کے لیے شمال سے حملہ آور ہو گا اور ہماری دفاعی پوزیشنوں کو لپیٹتا ہوا جنوب کی طرف بڑھے گا۔ اس مفروضے کی حمایت میں یہ دلیل دی جاتی تھی کہ اس سیکٹر میں دشمن کا سب سے بڑا مسلح اپنی گردن کو بچانا اور رابطے کے اس راستے کو محفوظ اور وسیع کرنا ہے جہاں سے چین کی سرحد تک ۵۰ کلومیٹر دور تھی۔ اس راستے کو وسیع کر کے وہ پاکستان اور چین کے درمیان فاصلہ بھی بڑھا سکتا تھا۔ اس مفروضے کی مخالفت میں یہ کہا جاتا تھا کہ اگر وہ شمال سے پیش قدمی کرتا ہوا سو دو سو کلومیٹر بھی آجائے، تو سقوطِ بھارت پاکستان کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا؛ البتہ اگر اس کا مقصد صرف بنگلہ دیش قائم کرنے کے لیے ایک قطعہ زمین حاصل کرنا ہے، تو یہ حکمت عملی اس کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

دشمن کے عزام کے متعلق مفروضہ یہ تھا کہ وہ ہٹی کے راستے داخل ہو کر سیدھا مشرق کی طرف بڑھے گا تاکہ اس سیکٹر کو دو حصوں میں کاٹ دے اور اوپر والے حصے کو بنگلہ دیش بنالے۔ اس سے اس کے دو مقاصد حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ سیگوری والا راستہ وسیع اور محفوظ ہو جائے اور دوسرے بنگلہ دیش کے لیے موزوں قطعہ زمین بھی ہاتھ آجائے۔ اس وجہ سے انڈیا کے علاوہ لال میسر ہاٹ کا ہوائی اڈہ، کری گرام، رنگ پور اور دیناچ پور کے ریلوے جکشن بھی شامل تھے۔

دشمن کے عزام کے اس تجزیے کے پیش نظر جنرل نذر حسین شاہ نے اپنے دونوں بریگیڈوں کو اس طرح لگایا کہ دشمن شمال سے جنوب کی طرف آسانی پیش قدمی کر سکے نہ ہی کے راستے داخل ہو کر شمالی بنگال کو دو حصوں میں کاٹ سکے۔ انہوں نے بریگیڈ انصاری کی قیادت میں ۲۳ بریگیڈ کو رنگ پور میں رکھا اور اس کی نفی شمال، شمال مشرق اور شمال مغرب کے سرحدی علاقوں میں پھیلا دی۔ دوسرا بریگیڈ ۲۰، بریگیڈ سیرمجل حسین کی زیر نگرانی بکرہ میں تعینات کیا اور اس کی قابل اعتبار پلٹن ۴ فرنٹیئر فورس کوئی کے دفاع پر لگا دیا۔ باقی نفی کو ہٹی کے شمال اور جنوب میں پھیلا دیا۔ جنگ سے کچھ عرصہ پہلے جو بنگامی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کھڑے کیے گئے تھے، ان میں سے ایک کو راجشاہی میں رکھا گیا۔ اس کی کمان بریگیڈ سیرمجل کے سپرد تھی جن کی زیر کمان نفی زیادہ عظیم کئی تنظیموں سے لی گئی تھی۔ اس علاقے میں کوئی ایسی خوبی نہ تھی جو دشمن کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتی۔ صرف دریائے گنگا میں کشتیوں کے ذریعے داخل ہو کر راجشاہی کے پاس اترنے کی کوشش کر سکتا تھا، مگر کشتیوں پر وہ کہاں تک ٹرک، توپیں اور ٹینک لاتا؟ امکان یہی تھا کہ اس حصے میں متحدہ وزیر جنگ نہیں ہوگی۔

جنرل نذر حسین کے دفاعی وسائل میں ایک چیز ایسی تھی جو مشرقی پاکستان میں نایاب تھی یہ تھے ٹینک۔ اس صوبے کی واحد ٹینک رجمنٹ — ۲۹ کپوری — ۱۶ ڈویژن کے پاس تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ میدان جنگ کی منہم بھانسنے والے ماہرین کا خیال تھا کہ اگر مشرقی پاکستان میں کہیں ٹینکوں کی لڑائی ہو سکتی ہے تو شمالی بنگال میں، کیونکہ یہاں ندی نالے نسبت کم تھے اور کشتیوں میں پانی زیادہ عرصہ نہیں رکتا تھا۔ اس رجمنٹ میں جس کا ہیڈ کوارٹر رنگ پور میں رکھا گیا تھا، ایم ۲۴ ساخت کے

ٹینک تھے جو دوسری جنگ عظیم میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے بعد کوریا (۱۹۵۱ء) کی جنگ میں بھی اپنے ہوسر دکھائے تھے۔ ان کا ماضی شاندار سی، مگر حال خستہ تھا۔ ان کی توپوں کے دھانے اتنے طائم (GROOVELESS) ہو چکے تھے کہ گولہ پوری شدت سے باہر نہیں نکلتا تھا اور جب نکلتا تھا، تو ایک ہزار میٹر سے دور نہ جاتا تھا۔ ان ٹینکوں کی رفتار بھی عمر کے ساتھ ساتھ تدریجاً کم ہو چکی تھی، مگر بے اولاد گھرانے میں اپنا بچہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہیں مشرقی پاکستان میں اس کی کوری رجمنٹ پر بڑا فخر تھا۔ یہ ہمارے زور بازو کی علامت تھی جہاں ٹینک ہوتے، ہوانوں کے حوصلے بلند تر ہو جاتے۔ جنرل نذر نے اس رجمنٹ کے حصے بجز کے کہ انہیں مختلف جگہوں پر بانٹ رکھا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ علاقے میں ہمارے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی اور دشمن کی حوصلہ شکنی ہو۔

اس کے برعکس ہندوستانی رسالہ جدید ترین ٹینکوں سے ایس تھا جس میں ٹی سلسلے (T-55، T-56) کے زوی ٹینک بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ بھارت کے اپنے کارخانوں میں بنے ہوئے وجنتا (VIJANTA) ٹینک تھے۔ ان دونوں قسم کے ٹینکوں کی مجموعی قوت کے سامنے دوسری جنگ عظیم کے ایم ۴ ٹینک کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔

جنگ کا اتنا رخ چھاؤ دیکھنے سے پہلے آئیے ایک نظر اس صورت حال پر ڈالیں جو جنگ سے پہلے یہاں رونما ہو چکی تھی۔ اس سیکٹر میں بلی دشمن کی آنکھ میں شروع سے ٹھک رہا تھا۔ اس نے اس کے سامنے اپنا ۲۰ ڈویژن رسالے اور توپ خانے سمیت ڈال رکھا تھا اور گزشتہ ستمبر سے اس پر گولہ باری بھی شروع کر رکھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب کئی ماہنی کی کارروائیاں زور پکڑتی گئیں، تو اس گولہ باری میں بھی شدت آتی گئی۔ ماہ نومبر میں تو شاید ہی کوئی دن گزرا ہو جب بلی میں گولوں کی بارش نہ ہوئی ہو۔ اس گولہ باری کی آڑ میں کئی بار دشمن نے آگے بڑھ کر بلی پر قبضہ بھی کرنا چاہا، مگر سربراہ ہماری ۴ فرنٹیئر فورس (ایف ایف) نے اس کے عزام خاک میں ملا دیے۔

۲۱ نومبر کو جب بھارت نے ہماری سرحدوں کے اندر پاؤں جانے کے لیے سرحدی موزوں کو سرپ (WAR OF SALIENTS) کرنے کی کوشش کی، تو اس نے بلی پر بھی دباؤ بٹھا دیا۔ اس کی ایک پلٹن ۷ گارڈز نے بلی اور اس کے نواح میں قاسم، بار، لوارا اور اپٹور کی چوکیوں پر بل بوتہ پر قائم پوسٹ جو بلی کے شمال میں کوئی دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھی دشمن نے زور ڈالی۔ وہاں ہمارے دس جوان شہید اور بارہ زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں نوجوان پلاٹون کمانڈر بھی شامل تھا۔ یہاں سے دشمن نے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بار پوسٹ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی، مگر اس کی پیش قدمی کو روک دیا گیا اور دشمن کو بھاری نقصان پہنچا۔ اس کے تین ٹینکوں میں سے صرف ایک ریلوے لائن عبور کر کے ہمارے علاقے میں گھس آئے۔ میں کامیاب ہوا، مگر ایک ٹینک دشمن توپ کے گولے نے اسے وہیں بے کار کر دیا۔ دشمن نے کھلی جارحیت کے اس نشان کو کھینچ کر واپس لے جانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ۲۴ نومبر کو جب کچن تکے کی پلیٹ پر جنرل نیاز جی جن صحافیوں سے ملے، وہ اسی جارحیت کو دیکھنے کے لیے دھاکہ سے یہاں لائے گئے تھے۔

اگرچہ ایف ایف نے بار پوسٹ پر دشمن کی لیگاری کو ناکام بنا دیا تھا، مگر اس کا خیال تھا کہ اگر بھارت کی تازہ دم فوج نے اس پر اپنا ہت حملہ کر دیا، تو کچن تکے کا شہر بھی قاسم پورٹ والا نہ ہو — چنانچہ وہاں پرتھوی پلاٹون (تقریباً ۳۰ آدمی) کو واپس بلا لیا گیا۔ دشمن نے اس چوکی کو خالی پا کر کچنکے سے قبضہ کر لیا اور یوں پہلی بار اس کے پاؤں ریلوے لائن کے مشرقی جانب جم گئے۔

آپ کو یاد ہوگا ۲۹ کیلری کے چرنٹیک دریائے گنگا پر ہارڈنگ پل کے پاس رکھے گئے تھے کہ وقت ضرورت دیا کے دونوں جانب استعمال کیے جائیں۔ بی پرندہ کورہ دباؤ پڑا تو ان ٹینکوں کا ایک ٹروپ (۴ ٹینک) یہاں لایا گیا جسے ۴ ایف ایف کی ڈی کمپنی کے سید کواریہ واقع ڈنگاپارہ میں رکھا گیا۔ بارپوسٹ سے خوفزدہ واپس بلائی گئی تھی اسے بھی ڈنگاپارہ میں متعین کیا گیا۔ ڈنگاپارہ سے شمال میں ۴۳ پنجاب (آر اینڈ ایس) کی ایک پلاٹون لگادی گئی جس کے پاس ٹینک شکن توپیں تھیں۔ اس طرح وسائل کو جمع کرنے کے بعد ہم میں اتنی سکت آچکی تھی کہ ہم دوبارہ حملہ کر کے بارپوسٹ پر قبضہ کر لیں مگر اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے، کیونکہ اسی اثناء میں دشمن نے بھی وہاں اپنی طاقت میں اضافہ کر لیا تھا۔

چنانچہ یہی طے ہوا کہ یہ پوسٹ خالی کرنے کے بجائے اپنی نفری کو یوں متعین کیا جائے کہ دشمن کا پھیلاؤ بڑھنے نہ پائے؛ لہذا دو کمپنیوں کو ہم نے جنوب اور مشرق کی طرف ڈال کر بارپوسٹ کے گرد حصار باندھ دیا اور تیسری کمپنی ڈی کمپنی) کو ریلوے لائن کے نیچے کی مغربی جانب رکھا گیا تاکہ دشمن اس جانب آزادانہ نقل و حرکت نہ کر سکے۔ اس کمپنی کی قیادت ایک جوی انٹر میجر اکرم کے سپرد تھی۔ نومبر کے آخر میں دشمن نے میجر اکرم کی پوزیشن کو تباہ کر کے اپنے پہلو سے کاشا کمانے کی سرتور کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ۳۰ دسمبر کو جنگ کا آغاز ہونے تک میجر اکرم اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔

بھرپور جنگ سے پہلے شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ دشمن نے چھوٹے چھوٹے موڑوں، ٹینکوں اور انباروں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ ان میں ٹیلا، پٹ گرام اور بڑنگامار شامل تھے۔ ٹیلا پر قبضہ کر کے دشمن نے بہادر ادا سہم کے درمیان سلیکری کار سڑ ۲۵ کلومیٹر سے بڑھا کر ۵۵ کلومیٹر کر لیا تھا۔ بھارت نے اسی پراکتفا کرنے کے بجائے مزید جنوب کی طرف پیش قدمی کی تھی اور ۲۸ اور ۲۹ نومبر کی درمیانی رات کو اس نے پاچا گڑھ پر اور اس سے اگلے دور دراز میں بڑھ کر قبضہ کر لیا تھا۔ یوں دشمن اس علاقے میں ایک اہم قصبے ٹھاکر گاؤں پر دمک دینے لگا۔

اس کے علاوہ اس نے دریائے ٹیلا (Tista) کے پار سرحدی چوکیوں کو رفتہ رفتہ پیچھے دھکیل کر ۴ دسمبر تک کڑی گرام اور لال منیر ہاٹ تک پہنچا دیا تھا۔ اس طرف دباؤ پڑنے سے انتہائی مشرقی جانب جو چوکیاں چلماری تک پھیلی ہوئی تھیں انہیں بھی سیٹ کر کڑی گرام میں اکٹھا کر لیا گیا۔ ۳۰ دسمبر تک یہی حالت تھی۔

بھرپور جنگ چھڑنے ہی بھارتی فضا نے کڑی گرام اور لال منیر ہاٹ پر گولہ باری میں اضافہ کر دیا۔ اگرچہ یہ دونوں شہر ماہ نوبر ہی سے ان حملوں کو سہہ رہے تھے، مگر ۳۰ دسمبر کو ان پر قہر کی جواگ برسی انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہاں پڑے رہنے اور مار کھاتے رہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا، چنانچہ اسی شام جی اوسی میجر جنرل نندرسین نے حکم دیا کہ دریائے ٹیلا کے پار جتنی افواج ہیں وہ تمام رنگپور میں جمع ہو جائیں۔ پسپائی ۳۱ اور ۱ دسمبر کی درمیانی رات کو شروع ہوئی اور اگلے روز شام تک جاری رہی۔

فوج کو پسپا ہونے دیکھ کر مقامی محبت وطن شہری بھی گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ پاک فوج کے بغیر وہاں ان کا رہنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے، کیوں نہ فوج کے ساتھ چلا جائے تاکہ جو اس پر بیٹے کی وہ بھی سہہ لیں گے، چنانچہ جو ریل گاڑی ہمارے سپاہیوں کو رنگ پور پہنچانے کے لیے کڑی گرام سے روانہ ہوئی، اس پر یہ لوگ بھی ٹوٹ پڑے۔ اس علاقے میں یہ آخری ریل گاڑی تھی جو متحدہ پاکستان کے دور میں فوج کی زیر نگرانی چلائی جا رہی تھی۔ اس کے انچارج ایک میجر تھے جنہوں نے اس ناقابل فراموش سفر کا حال مجھے یوں بتایا:

”گاڑی میں اکثریت شہری باشندوں کی تھی جن میں سے بیشتر زار و قطار رو رہے تھے۔ پاکستانی سپاہی کھڑکیوں میں سے رافٹوں کی نالیاں باہر نکال کر متوقع حملہ آوروں سے ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ گاڑی کا آخری ڈبہ ایک کھلے پلیٹ فارم کی مانند تھا جس کے ارد گرد ریت کی بوریوں کی دیوار کھڑی کی گئی تھی۔ اندر ملکی توپیں (مارٹر) نصب تھیں تاکہ گھبریلے کی صورت میں انہیں استعمال میں لایا جاسکے جلتی گاڑی پر جبکہ باغیوں نے فائرنگ کی جس کا جواب کھڑکیوں سے فائر کر کے دیا گیا مگر گاڑی کسی رکاوٹ کے بغیر چلتی رہی۔ دریائے ٹیلا پر ریلوے کا پل سامنے نظر آ رہا تھا۔ ہم اسے عبور کرنے والے تھے کہ کچھ دور ”رضا کاروں“ کا ایک دستہ نظر آیا۔ ہم رُک گئے تاکہ انہیں بھی ساتھ لیتے چلیں۔ ہم نے انہیں بلایا، مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ہم ان طاقتور اندیش لڑکوں کی بے جسی پر حیران آگے بڑھ گئے۔ دریا کو عبور کر کے پل اڑا دیا۔ اس کے بعد انہی لڑکوں نے زور کاغہ لگایا: ”جئے بنگلہ“۔ دیکھ دیش زندہ باد، دراصل وہ کئی باہنی کے لوگ تھے جو جاسوسی کی خاطر رضا کاروں کی صفوں میں گھس آئے تھے۔“

۵ اور ۶ دسمبر کی درمیانی رات کو دریائے ٹیلا کے پار کی ساری نفری رنگ پور پہنچ گئی۔ اسی رات بقیہ شمالی سرحد سے بھی مارے سپاہی اتنے پیچھے ہٹ آئے کہ ہماری دفاعی لائن رنگ پور اور ٹھاکر گاؤں کی سیدھ میں آگئی۔ ٹھاکر گاؤں پر مزید دباؤ پڑا۔ تو ہم دینان پور کے شمال میں منڈل پارہ پہنچ گئے۔ منڈل پارہ اور رنگ پور کے درمیان ایک اور ٹرنک شالا جنو باجانی تھی جس کے شمالی سرے پر دومر واقع تھا۔ اب دومر سے بھی فوجی دستے واپس بلا کر سید پور میں جمع کیے گئے۔ گویا ۴ دسمبر کو ہماری نئی دفاعی لائن رنگ پور، سید پور اور دینان پور کی سیدھ میں تھی۔ رنگ پور میں مقیم ۲۳ بریگیڈ اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس نے جنگ کے آخر تک اس دفاعی لائن کو بچھڑنے نہ دیا۔

دوسری طرف جی کے مقام پر دشمن نے بھرپور جنگ چھڑتی ہی ہمارے دفاع میں شگاف ڈالنے کے لیے سرتور کوششیں شروع کر دیں۔ ۴ ایف ایف جو کئی مہینوں سے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھی اب بھی اپنے مورچوں میں جمی رہی، البتہ جی سے اکلومیٹر شمال میں چرائی کے مقابل پر دشمن کو ہماری پوزیشن میں ایک ”علامہ مقام“ مل گیا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ چرائی میں ابتداء ہمارے پاس ایک کمپنی تھی (دوسوا سوا فز) مگر نومبر کے آخر میں قائم پوسٹ والے سانچے کے بعد یہاں سے کچھ نفری ہٹا کر ایک اور جگہ پہنچ دی گئی تھی جہاں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ گویا چرائی میں ہماری دفاعی پوزیشن کمزور تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے کمانڈروں کا خیال تھا کہ یہاں کسی بڑے بھارتی حملے کی توقع رکھنا عبث ہے، کیونکہ نہ تو وہاں سے کوئی بڑی ٹرنک پٹو تھی جس پر چڑھ کر وہ آگے بڑھ سکے اور نہ اس علاقے میں کوئی ایسا مقام ہے جو جنگی نقطہ نظر سے بھارت کے لیے اہمیت رکھتا ہو۔ مزید برآں عام خیال یہ تھا کہ اس علاقے میں — کم از کم نقشے پر — ایسے دلدلی علاقے ہیں جن سے ٹینکوں کا گزر ناممکن تھا۔

مکتی باہنی اس علاقے کے تمام خدوخال سے واقف تھی۔ اس نے اپنے آقاؤں کو بتایا کہ جی پر سر چھوڑنے کے بجائے اگر اس کے اوپر یا نیچے قسمت آزمائی کی جائے تو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ بھارت نے جب چرائی کا انتخاب کیا تو مکتی باہنی والوں نے اسے بتایا کہ علاقہ بالکل خشک پڑا ہے اور وہاں پاکستان کی نفری بھی بہت تھوڑی ہے۔ چنانچہ دشمن نے مکتی باہنی کی رہنمائی میں

ایک کمپنی اور چند ٹینک اڈھر روانہ کر دیے۔ انہوں نے چرائی کو گھیرے میں لے کر اس کے جنوبی حصے سے آگے بڑھنا شروع کیا وہاں پر موجود پلاٹون کمانڈر نے شام کو اپنے افسر اعلیٰ کو وارنٹیں پر اطلاع دی،

”میرے بائیں جانب سے دشمن کے ٹینک گزر کر رنگ پور/لوگرہ روڈ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔“

افسرنے کہا: ”بوقوت یہاں ٹینک کہاں؟ شام کے دھندلے میں تم نے جھینسیں دیکھی ہوں گی۔“

پلاٹون کمانڈر نے عرض کیا: ”ہاں، آپ درست ہی کہتے ہوں گے، مگر ان جھینسوں پر سولہ میٹر دھانے کی توپیں فٹ ہیں جو ہمارے گوریلوں کو ایک ایک کر کے مٹاتی جا رہی ہیں۔“

اگرچہ دشمن چرائی کو پھیر کر آگے بڑھ چکا تھا، مگر اس کو پتہ تھا کہ اس کے جنوبی پہلو میں میجر اکرم اپنی سی کمپنی کے ساتھ موجود ہے، چنانچہ بھارت نے دو مضبوط دستے شمال اور جنوب کی طرف روانہ کیے تاکہ وہ میجر اکرم کی کمپنی کو دو جہتوں میں پھینک کر ختم کر دیں۔ میجر اکرم نے اپنی دفاعی پوزیشن اس طرح ترتیب دی تھی کہ وہ دونوں طرف سے دفاع کر سکتا تھا، چنانچہ دشمن نے پورے حملے کو تاربا، لیکن میجر اکرم کا بال بیکاز کر سکا، حتیٰ کہ ۸ دسمبر کو اس نے مزید ۲۸ گھنٹے دونوں جانب سے سی کمپنی کی پوزیشن پر پورا دباؤ ڈالا، لیکن بے سود۔ اب ۸ دسمبر ہو چکی تھی اور میجر اکرم کی کمپنی غیر معمولی جرات کا مظاہرہ کر کے اپنی پوزیشن میں ڈٹی ہوئی تھی۔ میجر اکرم ایک موبچے سے دوسرے مورچے میں جا جا کر اپنے جواؤں کو شاباش دے رہے تھے۔ اسی کیفیت میں اچانک ٹینک کا ایک گولہ ان پر پڑا اور وہ موقع پر جاں بحق ہو گئے۔ ان کی موت کے سنگین صدمے نے ان کے سپاہیوں کو بے حد متاثر کیا۔ دشمن نے میجر اکرم کی شہادت کے بعد دوبارہ شمال اور جنوب سے سی کمپنی پر بھر پور حملہ کیا جو کامیاب رہا۔ ہمارے جواؤں کے قدم اکٹھے صرف چالیس جواں اس معرکے سے سلامت بچ کر پلٹیں سے جا ملے۔ میجر اکرم کو بعد از شہادت نشان حیدر کا اعزاز دیا گیا۔

جب دشمن میجر اکرم سے پٹ رہا تھا تو اس کا ایک اور دستہ مشرق کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا رنگ پور/لوگرہ روڈ پر پیر گنج کے مقام پر پہنچ گیا جس کی جہیں کاؤں کا ان خبر نہ ہوئی۔ ہم یہی سمجھتے رہے کہ لڑائی ابھی سرحد کے ساتھ ساتھ میجر اکرم کے علاقے میں ہو رہی ہے۔ ۷ دسمبر کی سہ پہر کو جب جنرل نذر حسین شاہ رنگ پور کا دورہ کر کے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ بریگیڈیئر جمل حسین اور چند افسر تھے۔ جب وہ شمال کی طرف سے آتے ہوئے پیر گنج کا موڑ مڑنے لگے تو ان پر اچانک فائر کھل گیا۔ وہ فوراً گاڑیاں چھوڑ کر درختوں کے ایک ٹھنڈ میں آجھل ہو گئے۔ جنرل نذر حسین شاہ نے بعد میں مجھے فائنڈ انڈاز میں بتایا، ان کے ٹینک مجھے بے شکل ۵۰۰ میٹر دور تھے۔ درختوں کے ٹھنڈے ہوتے ہوئے جنرل نذر اور ان کے ساتھی ایک دیہات میں پہنچے جہاں ایک خداترس بنگالی نے انہیں ایک محفوظ راستے سے رنگ پور جانے والی سڑک پر پہنچا دیا۔

میجر جنرل نذر حسین شاہ کی جیب پر دو سترادوں والی پلیٹ لگی تھی جو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس پلیٹ کے اٹھ طرف تین ستارے لگے تھے تاکہ لیفٹیننٹ جنرل نیازی کی آمد پر بھی اسے استعمال کیا جاسکے۔ بھارتی سپاہی یہ پلیٹ لڑائی کے طور پر اتار کر اپنے افسروں کے پاس لے گئے تو وہ تین ستارے دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ انہوں نے لیفٹیننٹ جنرل پر داؤ مارا ہے۔ انہیں کیا پتہ کہ جب سے بھر پور جنگ کی خبر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی تھی، جنرل نیازی ڈھاکہ سے باہر ہی نہیں نکلے تھے۔

جنرل نذر حسین کی گمشدگی کی اطلاع ۷ اور ۸ دسمبر کی درمیانی رات کو ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹرس پہنچی۔ میں بھی اس وقت وہاں آپریشن روم میں موجود تھا۔ ہم سب کا گمان ہی تھا کہ وہ گرفتار ہو چکے ہیں، چنانچہ میجر جنرل حبشیہ کو (جو سول آرڈر فزرس کے ڈائریکٹر جنرل اور ۳۹ ہنگامی ڈوٹرن کے جی اویسی تھے) اسی وقت پہلی کانپ کے ذریعے روانہ کیا گیا تاکہ وہ جنرل نذر کی جگہ زندہ واریاں منجھال سکیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ٹانگ ٹوٹیاں مارنے کے بعد جنرل حبشیہ نے نیل مرام کوئی دو بجے واپس ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹرز پہنچ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ رات کی تاریکی میں جنرل نذر کے ہیڈ کوارٹرز میں اتر نہ سکے۔ تھوڑی دیر بعد اطلاع آئی کہ جنرل نذر حسین شاہ بخیر و عافیت واپس اپنی جگہ پر پہنچ گئے ہیں۔

یوں جی اویسی کو خطے میں ڈال کر یہ بنیادی معلومات حاصل کی گئیں کہ رنگ پور/لوگرہ روڈ پر دشمن پہنچ چکا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اگر اس کوئی انفور وہاں سے ہٹایا نہ گیا، تو ۱۹ ڈوٹرن مستقل طور پر دو حصوں میں بٹ کر رہ جائے گا یعنی ۲۳ بریگیڈ اور رنگ پور میں اور ۲۰ بریگیڈ نیچے لوگرہ میں۔ اور اگر ڈوٹرن تقسیم ہو جائے، تو وہ ڈوٹرن نہیں رہتا، چنانچہ جی اویسی نے دو دستے تیار کرنے کا حکم دیا۔ ہر دستے کو ٹاسک فورس (TASK FORCE) کا نام دیا گیا۔ ایک ٹاسک فورس کو اوپر سے حملہ آور ہونا تھا اور دوسری کو جنوب سے۔ بنیادی فلسفہ وہی تھا جو بھارت نے میجر اکرم کی سی کمپنی کے خلاف استعمال کیا تھا، یعنی دشمن کو دو جہتوں میں پھینک کر تباہ کر دینا۔ جنوبی ٹاسک فورس کی قیادت بریگیڈیئر جمل کے سپرد تھی جبکہ شمالی ٹاسک فورس لے کر بریگیڈیئر نعیم کو۔ رنگ پور کی طرف سے حملہ آور ہونا تھا۔ بریگیڈیئر نعیم ڈومبر کے آخر میں ٹرینڈز کے تقاب میں جنوب سے شمال کی جانب جاملے تھے اور جنگ چھڑنے کے بعد وہیں ٹرک گئے تھے، اڑتالیس قیدی گھنے گزر گئے، مگر کوئی جبراً بھی دشمن کے نزدیک نہ پہنچا۔ بریگیڈیئر نعیم سے جب بھی پوچھا گیا، وہ یہی کہتے رہے کہ بس حملے کا پلان تیار ہوا۔ اور بریگیڈیئر جمل نے خود جنوبی ٹاسک فورس کی قیادت کرنے کے بجائے ۳۲ بلوچ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل سلطان سے پیر گنج کی طرف جانے کو کہا۔ جب اس میں تاخیر ہوئی، تو بریگیڈیئر جمل نے لیفٹیننٹ کرنل سلطان پر خوب لعن طعن کی، یہاں تک کہ ان پر زبولی کا الزام لگایا۔ اس پر لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو اتنا طیش آیا کہ وہ فوراً اپنی پلٹیں ٹرکوں میں لاد کر پیر گنج کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کا خیال تھا پیر گنج سے ذرا اور وہ ٹرکوں سے اتر کر پوزیشن منجھال لیں گے اور فوجی سکھائی کے مطابق دشمن تک پیش قدمی کریں گے، مگر وہ یہ سمجھ گئے کہ گزشتہ دو تین دنوں میں دشمن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا، بلکہ اس نے اس دوران میں مزید ٹینک اور پیدل فوج بلا کر اپنی دفاعی پوزیشن کو پیر گنج سے نیچے تک پھیلا دیا ہے، لہذا ابھی لیفٹیننٹ کرنل سلطان کی پلٹیں ٹرکوں ہی پر تھی کہ دشمن کے ٹینکوں اور پیدل فوج نے ان پر فائر کھول دیا۔ ہر اول کمپنی کو دشمن نے محسوس کر رکھا دیا کہ کرنل سلطان سمیت سب آدمی شہید ہو گئے۔ یقیناً پلٹیں سرسیدہ حالت میں پسپا ہونے پر مجبور ہوئی۔ بریگیڈیئر جمل کو خیال ہوا شاید دشمن ان کا تعاقب کرتا ہوا جنوب کی طرف پیش قدمی کرے گا، چنانچہ انہوں نے ۸ بلوچ اور ۲۲ پنجاب کی ایک ایک کمپنی چند توپوں سمیت ملک کے طور پر روانہ کی۔ دشمن ابھی پیش قدمی کے نوڈ میں نہیں تھا۔ وہ پیر گنج سے ذرا جنوب میں پلاس باری کے مقام پر ٹرک لگایا تھا۔

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو لوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن لوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لہذا

بریگیڈیئر تھمپسن نے شمال مغرب میں ۴ ایف ایف کو قبی میں اپنے پرلنے مورچوں سے اکھاڑ کر واپس بلالیا اور شمال مشرق میں چوٹی چوٹی چوٹیاں مثلاً پچھری گھاٹ، بونہ پارا اور گوند گنج خالی کر دیں۔

یوں دشمن نے لوگرہ/ رنگ پور روڈ پر اپنا قبضہ محکم کر لیا اور ۱۲ ڈویژن جنرل نذر حسین شاہ کی تمام ترجہ نیلی کے باوجود قتل طور پر دو حصوں میں کٹ گیا۔ شمالی بریگیڈ رنگ پور/ سید پور/ دینا پور تک محدود تھا اور جنوبی بریگیڈ لوگرہ کے شمال تک۔ اب دونوں کو اپنی اپنی ذیلی عہدہ عملداری جاتی تھی۔ وہ جو فوجی مجتر گئے ہیں کہ ڈویژن ایک آکر کیشلر کی مانند ہوتا ہے جس کے تمام ہاروسیتا کے اشارے پر ہم آہنگ ہو کر جکتے ہیں، یہاں محض کتابی بات معلوم ہوتی تھی۔

اب دشمن کی نظریں لوگرہ پر پھیں جو ایک مشہور شہر اور اہم مواصلاتی مرکز تھا۔ جنرل نذر لوگرہ کی جنگ بریگیڈیئر تھمپسن کے سپرد کر کے ناؤر کی طرف پسپا ہو چکے تھے۔ بریگیڈیئر تھمپسن نے لوگرہ سے ۴ کلومیٹر شمال میں مہستان کے مقام پر دشمن کے سامنے دفاعی بند باندھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے وہاں شکر اور شکر کے دونوں جانب ۸ بلوچ اور ۳۲ پنجاب کی کینی لگا دی۔ ۴ ایف ایف جو قبی سے واپس بلایا گیا تھی اسے چند دن آرام دینے کے لیے لوگرہ ہی میں رکھا گیا۔ مہستان کا دفاع کرنے والی فورس شمال کی طرف سے آنے والے دشمن کا راہ کٹی رہی اور وہ مٹی باہنی کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا ہوا شکر کو چھوڑ کر اس کے مشرقی جانب کھیتوں میں جا نکلا جہاں سے وہ مرکز ہماری پوزیشن کے جنوب میں آگیا۔ ہماری لڑاکا نفری آگے شمال کی طرف تھی اور پیچھے بالین ہیڈ کوارٹر میں کلرک، باورچی اور دوسرا عملہ تھا۔ دشمن نے انہیں اور وہاں پر موجود چھپنڑوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے بعد اس نے ہماری پشست سے ہم پر حملہ کر دیا۔

میر ساجد جو ۳۲ پنجاب کی کینی کے قائد تھے، دشمن کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کے خواب و خیال میں نہ تھا کہ دشمن ہماری پشست پر بھی پہنچ سکتا ہے۔ میر ساجد تو کپڑے گئے، مگر ان کے سپاہی مورچوں میں لڑتے رہے۔ ان میں سے بعض تو سامنے اور پیچھے سے بیک وقت حملے کی تاب نہ لاکر بہت ہار بیٹھے، مگر حوالدار عکداد اپنے مورچے میں ڈنارہا۔ اس پر دشمن نے تین حملے کیے، لیکن اس نے میزوں پسپا کر دیے۔ ہر سپاہی کے ساتھ دشمن کو جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اس پر ہندوستانی مجب نے اپنے قیدی میر ساجد سے کہا: "اس جنونی کو روکو، ورنہ ہم اسے مورچے ہی میں روند ڈالیں گے۔" ساجد نے نائل سے کام لیا تو بھارتی افسر نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مورچے پر حملہ کر کے اسے خاموش کر دیں۔ عکداد اپنے مورچے میں تنہا تھا۔ اس پر حملہ آوروں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے جھک جھک کر یہ وارہما اور جونی دشمن آگے بڑھنے لگا، اس نے تین ڈویژن کو گولیوں کے ایک برسٹ (بوچھاڑ) سے ڈھیر کر دیا۔

اب بھارتی میجر اور بھارتی اس نے ریوالویر میر ساجد کی چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا: "اسے بند کراؤ، ورنہ تمہیں گولی مار ڈوں" میر ساجد نے جو عکداد کی آنکھوں سے اوجھل تھا، زور سے کہا: "عکداد! اب بس کرو،" اُس نے ٹھیکہ بھجانی میں جواب دیا: "صاحب! اپنا امینشن مکائی بیٹھے اوتے میول آکھنے او بس کرو، میرے کو ل اچے دو میگزیناں باقی ہن۔" اس نے ہارمانی اور دشمن نے مزید جانوں کی قربانی دے کر اسے مورچے ہی میں ختم کر دیا۔

لے صاحب! آپ اپنا امینشن ختم کر بیٹھے ہوا درجے کتے ہو بس کرو، اچھی تو میرے پاس گولیوں کے دو میگزین باقی ہن۔"

۱۲ دسمبر کو ہم مہستان سے پسپا ہو کر لوگرہ کے بیرونی عمارتیں پر آ گئے۔ گویا اب لوگرہ کے دفاعی قلعے کی جنگ شروع ہونے والی تھی جس کے لیے بریگیڈیئر تھمپسن نے شکر کے چاروں طرف مورچے کھدوا رکھے تھے۔ ہمارے سپاہیوں نے پوزیشن بنگال لی۔ دشمن کے طیارے اور توپیں اوپر سے گولے برساتے رہے اور ہم اپنے مورچوں میں بیٹھے گولہ باری سستے رہے۔ گویا ہتھوڑے اور آہن والی بات شروع ہو گئی، لیکن یہ خیال غلط نکلا کہ ہمیشہ ہتھوڑا چلانے والے ہاتھ پہلے تھک جاتے ہیں اور آہن کی قوت بردا میں فرق نہیں آتا۔ اس گولہ باری سے جب لوگ شہید اور زخمی ہونے لگے اور عمارتیں مسمار ہونے لگیں، تو حوصلے بھی پست ہونے لگے۔ جتنے آدمی گولوں یا گرنے والی عمارتوں کی اینٹوں کا شکار ہوتے، انہیں ایک عمارت میں جمع کر دیا جاتا تاکہ جب حالات اجازت دیں گے، تو ان کی طرف توجہ دی جائے گی۔

لوگرہ میں قلعہ بند ہونے پر لیفٹیننٹ کرنل سرفراز ملک سے کہا گیا کہ وہ ۴ ایف ایف کی کمان بنگال لیں کہ کوئی کس کے حمل کا ہڈنگ آفیسر عباسی کی جگہ عارضی طور پر لیفٹیننٹ کرنل ممتاز ملک نے کمان بنگال لی تھی اور وہ اب واپس ایئرٹن کمانڈ ہیڈ کوارٹر چلا چکے تھے۔ کرنل سرفراز ۱۳ اور ۱۴ دسمبر کی درمیانی رات کو اپنی بھری ہوئی نفی کو تلاش کرتے پھر رہے تھے کہ ایک کپتے مکان کے بامدے میں سے گزرتے ہوئے ان کا پاؤں پھسلا۔ انہوں نے مارچ کی روشنی میں دیکھا تو یہ تازہ انسانی خون تھا جو مکان کے دروازے سے بہتا ہوا برآمدے میں پھیل گیا تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا، تورات کے اندھیرے میں ڈھیر سارے زخمی جوان بے یار و مددگار راہ رہے تھے۔ ابتدائی مرہم پٹی تو دو کناڑا نہیں سہمدی کے دوپول بھی میسر نہ تھے۔

ہماری فوج نے لوگرہ میں تین روز تک گولہ باری سی، لیکن اس عرصے میں سپاہیوں کا مورال بہت متاثر ہو چکا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یوں پڑے پڑے وہ کب تک مار سستے رہیں گے اور ان میں سے جو زخمی ہو جائیں گے، وہ کس مکان کی تاریکی میں اپنا خون دیتے رہیں گے۔ جو شہید ہو جائیں گے، ان کی لاشیں کہاں جائیں گی۔

۱۶ دسمبر کا سورج طلوع ہوا، تو دشمن لوگرہ کے شمالی کنارے پر ریلوے کراسنگ تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے وہ لاؤڈ اسپیکر پر بار بار اعلان کر رہا تھا کہ جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں، جنگ بند ہو چکی ہے۔ آؤ اپنے ہتھیار ڈال دو اور اپنی جان بچاؤ، ناخن خون بہانے کا کیا فائدہ؟ آؤ ہتھیار جمع کراؤ اور سلامتی کی گارنٹی لو، وغیرہ۔ تعجب کی بات کہ ہمارے سپاہی یہ اعلان سن کر اپنی اپنی رائفل بغل میں دبائے دشمن کی طرف بڑھنے لگے۔

بریگیڈیئر تھمپسن کو خبر ملی، تو وہ ان گالی بیٹروں کے کردار پر بہت برہم ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح ہتھیار ڈالنے کا کوئی جواز نہیں۔ اتنے میں ایک اسٹاف آفیسر ان کے پاس بنگال بند کی کا پیغام لایا جو ایئرٹن کمانڈ کی طرف سے ابھی ابھی موصول ہوا تھا۔ اس پر بریگیڈیئر تھمپسن نے سپاہیوں کو اپنے حال پر چھوڑا اور خود لوگرہ سے مغرب کی جانب نکل گئے۔ وہ تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ کبھی باہنی کے ہتھے چڑھ گئے۔ انہوں نے ان کی خوب خبر لی۔ جب وہ قیدی بن کر بھارتی افسروں کے سامنے لائے گئے، تو ان کے بازو کی ہڈی ٹوٹ کر گئے کا ہار بن چکی تھی۔

## برہمن باریہ سیکٹر

## باب ۱۹

## برہمن باریہ سیکٹر (۱۴ ڈویژن)

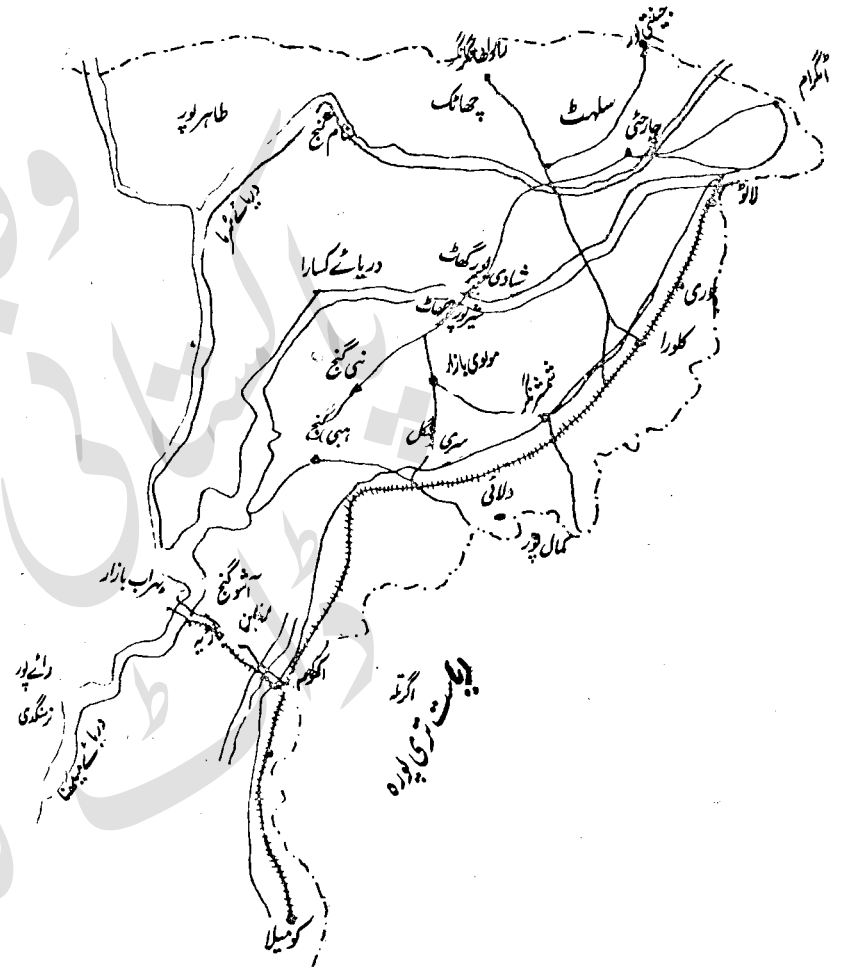
مشرقی سرحد کبڑے شخص کی طرح تھی۔ اوپر اور نیچے سے آگے کو جھکی ہوئی اور درمیان میں پیچھے کو بھی ہوئی۔ اوپر کا حصہ سلٹ سیکٹر کہلاتا تھا اور نیچے والا چٹا گانگ اور چٹا گانگ کا پہاڑی علاقہ۔ درمیانی حصے میں کومیلہ اور اس سے ملحق علاقے تھے۔ فوجی ذہنوں کی سوچ یہ تھی کہ اگر برہما کی سرحد سے ملا ہوا چٹا گانگ کا پہاڑی علاقہ یا شمال میں سلٹ کا علاقہ ہاتھ سے چلا جاتی جائے تو سقوط مشرقی پاکستان کی نوبت نہیں آئے گی، لیکن اگر کوئی حملہ کومیلہ یا اس کے آس پاس سے ہوگا، تو اس کا اثر ڈھاکہ پر پڑے گا۔

زمانہ امن میں (اگر کوئی ایسا زمانہ تھا) مشرقی سرحد کے دفاع کی ذمہ داری میجر جنرل عبدالجبار قاضی کے ۱۴ ڈویژن کے سپرد تھی جس کا ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ میں تھا۔ جنرل قاضی نے ایک بریگیڈ کومیلہ میں اور دوسرا اس کے شمال میں برہمن باریہ میں ڈال رکھا تھا اور ہنگامی طور پر کھڑے کیے گئے بریگیڈ ہیڈ کوارٹروں میں سے ایک سلٹ میں قائم کیا گیا تھا۔ فوج کے آخر میں جب جی ایچ کویو نے ایسٹرن کمانڈ کو اطلاع دی کہ بھارت کا زوردار حملہ مشرقی جانب سے ہوگا، تو جنرل نیاز سی نے چاند پور میں ایک ہنگامی ڈویژنل ہیڈ کوارٹر (میجر جنرل رحیم) کھڑا کر کے کومیلہ والا بریگیڈ اس کے زیر کمان کر دیا اور ڈھاکہ میں متین بریگیڈ بھی کومیلہ کے جنوب میں فیٹی کے مقام پر منتقل کر دیا۔ فیٹی سے پچلا حصہ یعنی چٹا گانگ اور چٹا گانگ کا پہاڑی علاقہ ایک علیحدہ بریگیڈ (مقیم چٹا گانگ) کے سپرد کیا گیا۔ گویا جنگ سے پہلے ہی مشرقی سرحد کے دفاع کی ذمہ داری میجر جنرل قاضی اور میجر جنرل رحیم کے درمیان بانٹ دی گئی۔ جنرل قاضی کے پاس برہمن باریہ اور اس کا شمالی علاقہ (مولوی بازار سلٹ وغیرہ) رہ گیا اور جنرل رحیم کے ذمہ کومیلہ، فیٹی، بلوئیا، نکشم اور چاند پور کے علاقے آئے۔

جنرل رحیم اور ان کے ڈویژن کی کارکردگی کا احوال اگلے باب کا موضوع ہے۔ اس باب میں جنرل قاضی کی دفاعی صلاحیتوں کا ذکر آئے گا۔

جنرل قاضی کے ۱۴ ڈویژن میں تین بریگیڈ تھے۔ ایک مضبوط اور دو کمزور طاقتور بریگیڈ (۲۷) میں ڈھائی پلٹنیں تھیں اور اس کا ہیڈ کوارٹر برہمن باریہ میں تھا۔ اس کے کمانڈر بریگیڈیئر سعد اللہ تھے۔ دوسرا بریگیڈ (۲۰۲) جو دو پلٹنوں پر مشتمل تھا بریگیڈیئر افتخار رانا کی قیادت میں مولوی بازار میں تھا اور تیسرا (ہنگامی) بریگیڈ (۳۱۳) بریگیڈیئر سلیم اللہ کے ماتحت تھا جس کا ہیڈ کوارٹر سلٹ میں تھا۔ اس بریگیڈ میں ایک باقاعدہ انفنٹری پلٹن اور باقی نیم عسکری نفری تھی۔

۱۴ ڈویژن کے دفاعی خط کے پیچھے عظیم دریائے میگھنا بہتا تھا جو ڈھاکہ کے لیے مشرقی فیصل کا کام دیتا تھا جس کا مطلب یہ



بن لاقوامی سرحد  
موجودہ سرحدیں  
ریلوے  
دریا

تھا کہ دشمن کو پہلے ۱۴ ڈویژن کی دفاعی لائن کو توڑنا ہوگا اور پھر پورے جنگی ساز و سامان سمیت اس کو سبج دریا کو پار کرنا ہوگا۔ پھر کہیں وہ ڈھاکہ پر دستک دینے کے قابل ہوگا۔ خیال تھا کہ وہ ڈھاکہ پر دستک دینے سے پہلے اگر تلا (تری پورہ) کی طرف پیش قدمی کر کے اکھوڑہ برہمن بارڈر آٹو گن اور ہر اب بازار کا رخ کرے گا، لہذا جنرل قاضی نے نہ صرف بریگیڈیئر سعد اللہ اور ان کے ۲۷ بریگیڈ کو مذکورہ خطوط پر متعین کیا، بلکہ اپنا ٹیک ہیڈ کوارٹر (۱۴ ڈویژن) بھی وہیں منتقل کر دیا۔

۲۷ بریگیڈ کے زیر نگرانی سرحد کو میلا کے شمال میں سالہ ندی سے شروع ہو کر مولوی بازار کے جنوب میں انکھولا کے مقام پر نغمہ ہوتی تھی یوں ٹی سرحدی لمبائی ۸۸ کلومیٹر تھی جتنی جس کے دفاع کے لیے بریگیڈیئر سعد اللہ کے پاس ڈھائی انفنٹری پلیٹین، ۱۰ توپیں (فلڈ) چارینٹک اور ایک پلاٹون (آر ایٹالس) تھی۔ انہوں نے انفنٹری پلٹوں میں سے ۱۲ ایف ایف کو اکھولا میں متعین کیا اور ۲۳ پلج اور (نامنٹل) ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کو بالترتیب اس کے جنوب اور شمال میں لگا دیا۔

دوسرے سیکڑوں کی طرح یہاں بھی جنگ ۳ دسمبر سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس علاقے میں تجارت کی توجہ اکھوڑا پر مرکوز تھی جو پشاکا گنگ سے سلسلہ جانے والی ریلوے لائن پر واقع تھا۔ اس مقام کو منتخب کرنے کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں سے اگر تلا (تری پورہ) کی طرف چند کلومیٹر دور تھا۔ تجارت کی مسلسل جارحیت کے سبب اکھوڑا کا ذکر اکتوبر کے اوائل ہی میں اخباروں میں آنے لگا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کئی بار ہمارے ہاتھوں سے گیا اور کئی بار واپس آیا۔ بار بار مالک بدلنے سے ریل کی پٹریاں اور ریلوے اسٹیشن کی کوئٹھریاں خستہ ہو چکی تھیں۔

۲۱ نومبر کو تجارت نے سرحدی موٹوں اور اُجاردوں کو ہڑپ کرنا (WAR OF SALIENTS) شروع کیا تو اس نے اکھوڑا اور اس کے ملحقہ علاقے پر خصوصی توجہ دی۔ اس نے اکھوڑا کو فارنگ اور جالبی فارنگ میں مصروف رکھا اور اس کے جنوب اور شمال سے سرحدی چوکیوں کو کئی باہنی کی مدد سے گھیرے میں لے لیا۔ اکھوڑا کو آزاد کرنے میں وقت یہ تھی کہ اگر سامنے سے پیش قدمی کرتے تو کئی باہنی اور ان کی اعانت کرنے والی توپوں کا سامنا کرنا پڑتا اور اگر پہلو سے ان کے پیچھے جانے کی کوشش کرتے، تو سرحدوں کی خلاف ورزی ہوتی جس کی اجازت نہ تھی (ہم ۳ دسمبر کی سرپرہنگ سرحدوں کے تقدس کے قابل تھے)۔

جب دشمن کو یقین ہو گیا کہ ہم اس چوکی کو آزاد کرنا تو درکنار اسے ملک بھی نہیں پہنچا سکتے تو اس نے ۳۰ نومبر کو اکھوڑا اور اس سے ملحقہ مورچوں پر بمباری کر دیا۔ ہماری ایک پلاٹون، موپے چھوڑ کر جگہ آئی اور دشمن نے اس چوکی پر اور اس کی پشت پناہی کے لیے کئی گئی ہماری اگلی توپ پر قبضہ کر لیا۔ ہمیں اس سانحے کا اندازہ تب ہوا جب اس چوکی سے ہمارا مواصلاتی رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔ ایک لینینٹ کو ذاتی طور پر صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا گیا، تو اسے راستے میں پہا ہوتے ہوئے سپاہی ملے۔ اس نے انہیں دوبارہ اپنے مورچوں میں بھیج دیا اور خود واپس چلا آیا۔

اکھوڑا کے جنوب میں گنگا ساگر، ملک باری اور لانا سرکی چوکیاں تھیں۔ یکم دسمبر کو دشمن کی گولہ باری سے ان سرحدی چوکیوں سے ہمارے سپاہی اکھر گئے۔ اب ان سے بھی مواصلاتی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس مرتبہ ایک لینینٹ کے بجائے مہجر جنرل قاضی نے انہیں واپس اپنے اپنے گھونسلے میں بھیجا۔

جب جنرل قاضی اور بریگیڈیئر سعد اللہ کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ اکھوڑا اور گنگا ساگر کے گرد و فلاح میں ہم کس طرح سرحدی چوکیوں کو منظم کریں، تجارتی سپاہی۔ کئی باہنی کی رہنمائی میں۔ کھیتوں سے ہوتے ہوئے اکھوڑا سے پیچھے ہمارے شاہین بیٹہ کوارٹر

کے پاس آنکلی۔ اس نئی صورت حال سے بچنے کے لیے کوئی اضافی نفری دستیاب نہ تھی، چنانچہ ۱۴ ڈویژن ہیڈ کوارٹر کے کلکون لٹری پولیس کے جوانوں اور اردو لہوں اور چارٹنیکوں کی مدد سے اس تجارتی فوج پر حملہ کیا گیا۔ یہ تجارتی سپاہی جو چوروں کی طرح چھپے چھپاتے سرحد پار کر آئے تھے ابھی تک "چور ذہنیت" سے نہیں نکلے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ان کی چوری پکڑی گئی ہے اور ٹیکوں سمیت ان پر حملہ کر دیا گیا ہے تو وہ بھاگ نکلے۔ دشمن جاکم جگہ میں اپنی چند لاشیں بھی چھوڑ گیا جن میں سے ایک تجارتی توپ خانے کے ایک نوجوان آپرر (دھببان) کی لاش تھی جس کے قبضے سے نکلنے والے فوجی نقشوں سے پتہ چلتا تھا کہ دشمن اکھوڑا کے پیچھے دیشی ٹیٹاس (TITAS) کے پل پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ ہم اکھوڑا سے پہا ہوتے وقت اس پل کو آڑ کر دشمن کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کریں۔

۳ دسمبر کو جب کھلی جنگ کا آغاز ہوا، تو بریگیڈیئر سعد اللہ نے اپنے جی اوسی کی منظوری سے اپنی دفاعی پوزیشنوں کو از سر نو ترتیب دیا۔ انہوں نے سرحدی چوکیوں سے نفری سمیت کرنیٹاس پل کے اس پانچویں کروی اور یہ طے کیا کہ اگر ہمیں یہاں سے بھی سپاہ ہونا پڑا، تو اس پل کو آڑ کر پیچھے ہٹیں گے، لیکن دشمن نے جب یہاں بھی ہم پر بھر پور تھپا کر کی تو ہم سپاہ تو ہوتے مگر جلدی میں پل تباہ نہ کر سکے نتیجہ یہ کہ دشمن ہمارے پیچھے بغیر عافیت پل پار کر آیا ہم وہاں سے جوہٹے، تو ۱۴ کلومیٹر پیچھے برہمن بارڈر آکر رے جو اس سیکڑ میں مضبوط مقام (STRONG POINT) سمجھا جاتا تھا۔ یہاں پندرہ دن کے لیے راشن اور گولہ بارود موجود تھا۔

اب ہم برہمن بارڈر میں دشمن کے حملے کا انتظار کر رہے تھے، مگر اس نے ہماری توقعات پوری کرنے کے بجائے وہی لہیر آ پنا جڑہ اب تک اپنا آ رہا تھا۔ اس نے کئی باہنی کی مدد سے پہلوؤں کی طرف پیش قدمی کر کے ہمارے عقب میں آنے کی کوشش کی۔ ہم نے اس جال کو ناکام بنانے کا علاج یہ سوچا کہ گھیرا مکمل ہونے سے پہلے ۱۳ کلومیٹر مزید پیچھے ہٹ گئے۔ اب ہم دیا پنگا کے مشرقی کنارے آٹو گنگ کے مقام پر تھے اور پھر پور جنگ کا پانچواں دن (۸ دسمبر) تھا۔ اس مرتبہ دشمن نے اٹھواڑھ ہزار تعاقب کیا اور ہم آٹو گنگ میں مورچے وغیرہ کھودنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس پانچویں کی وجہ سے جنرل قاضی (۱۴ ڈویژن) کا ٹیک ہیڈ کوارٹر برہمن بارڈر سے ہٹ کر دیا پنگا کے مغربی کنارے "بہر اب بازار" میں منتقل ہو چکا تھا۔ سپاہیوں نے جب جنرل قاضی اور اس کے ہیڈ کوارٹر کو دریائے گنگا کے پار جاتے دیکھا، تو انہوں نے سوچا کہ امان ہے تو دریائے گنگا کے مغربی کنارے پر مشرقی جانب تو سامنے سے دشمن کا دباؤ پڑے گا اور پیچھے دریا ہوگا، ہم کہاں جائیں گے۔ گویا فرنٹ لائن میں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر (ٹیک) سے جہاں سپاہیوں کے مورال پر اچھا اثر پڑتا ہے وہاں اس کی پانچویں سے ان کے حوصلے بہت بھی ہو جاتے ہیں۔

آٹو گنگ کا دفاع منظم کرتے وقت بریگیڈیئر سعد اللہ نے مشرقی اور جنوبی سمتوں پر خاص توجہ دی کیونکہ دشمن کے حملے کی توقع انہی اطراف سے کی جاسکتی تھی۔ شمالی جانب دشمن کی کوئی مؤثر قوت موجود نہ تھی، چنانچہ اس طرف صرف نیم عسکری فورس (سول آرمڈ فورسز) کو متعین کیا گیا۔ ان کے ساتھ باقاعدہ فوج کے ٹھی سر سپاہی لگائے گئے تاکہ انہیں حوصلہ ہے کہ فوج ہمارے ساتھ ہے۔

۹ دسمبر کی صبح کو خبر ملی کہ دشمن شمال مشرق سے پیش قدمی کر رہا ہے۔ یہ خبر سراسر خلاف توقع تھی، مگر احتیاطاً توپوں کا رخ ادھر موڑ دیا تاکہ وہ ہماری نسبت کمزور نفری کی حمایت میں گولے برسائیں۔ خوش قسمتی سے ابھی ان توپوں کے دہانے نہیں کھلے تھے کہ دشمن پیدل چلتا ہوا سامنے آ گیا۔ دور بین سے اسے پہچاننے کی کوشش کی گئی تو پتہ چلا کہ یہ اپنی سول آرمڈ فورسز کی نفری ہے جو ہندوؤں کی کھنڈوں سے

لٹکائے دریا کے کنارے کھائے واپس آ رہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اُس طرف دشمن موجود ہے اور اُس کے پاس ہتھیار بھی ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ وہ اپنی تھری ناٹ تھری کی رائفلوں سے اس کا کیا مقابلہ کریں گے، چلو واپس چلیں۔

اس نیم عسکری نفری کے پیچھے پتی فوج کا دستہ آتا دکھائی دیا۔ سوچا کہ جب یہ پہاڑ گئے ہیں تو ہمارے کتنی بھڑو بھی ہیں ان کے نقش قدم پر واپس آئے ہوں گے، مگر دور بین میں ان کی وردیوں کا رنگ خاک کے بجائے سبز نظر آیا۔ سبز وردی بھارتی سپاہیوں کی تھی جب تک ان کی شناخت ہوئی تو ہمارے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے بت قریب پہنچ چکے تھے۔ عملت میں ہیڈ کوارٹر سے بھانت بھانت کی نفری اکٹھی کر کے پیش قدمی روکنے کی کوشش کی اور مشرقی جانب متعین فوج کو اطلاع دی گئی کہ وہ جلدی جلدی باقاعدہ فوج کے دستے میں بھیجیں کیونکہ آشوبی نظریے میں ہے۔ مگر ان دوستوں کے آنے سے پہلے ہی بھانت بھانت کی نفری نے حملہ آوروں کو مار بھاگا یا زخمی مار بھاگیا، بلکہ بہت دور تک ان کا تعاقب کیا۔ دشمن نے بھی پیچھے ہٹ کر، کھینے کی زحمت نہ کی کہ تعاقب کرنے والی نفری کتنی ہے وہ اپنے پیچھے کئی لاشیں اور سات ٹینک صبح صبح حالت میں چھوڑ گیا۔ قدم قدم پر پہاڑ ہونے والی پاک فوج کے لیے یہ پہلا مارک تھا جس میں اس نے دشمن کو اس افراطی میں فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ واقعہ ہمارے سپاہیوں کے لیے ٹھکانہ ثابت ہوا۔

۲۴ بریگیڈ ابھی آشوبی ہی میں تھا کہ جنرل قاضی نے ہرلاب بازار میں بیٹھے بیٹھے دیلے میکانیکل پریم آہنی پل کو اڑا دینے کا حکم دے دیا۔ محکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ دریا کے مشرقی کنارے سپاہیوں نے شہر دریا میں گرے دیئے تو ان کے حوصلے بھی گرے گئے۔ وہ اس یاں یاں گھیز منظر کو بے بسی سے دیکھتے رہے۔ وہ پل اڑنے کی حکمت سمجھنے سے قاصر تھے۔

جی اوی کے اس حکم کی اب دو توجہات پیش کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ طاری کی کشتیاں جلانے کے مترادف تھا، یعنی مشرقی کنارے پر متعین ہمارے سپاہیوں کو پتہ چل جائے گا کہ اب مزید سپاہی کا کوئی امکان نہیں اس لیے اب یہیں آخری دم تک لڑنا ہے۔ دوسری وجہ یہ بتانی جاتی ہے کہ جی اوی کو یہ اندیشہ تھا کہ دشمن کا وہ فوجی دستہ جو اپنا ٹھکانہ شمال کی جانب سے اٹکھاتا تھا حقیقت پل پر قبضہ کرنے آیا تھا جسے بروقت کارروائی سے روکا گیا تھا، لیکن عین ممکن ہے اگلا ریلو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے (افسوس! دوسرے مفروضے کی کسی ذریعے سے تصدیق نہیں ہو سکتی)۔

پل گرنے کے بعد ۲۴ بریگیڈ مشرقی کنارے پر اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگا۔ اس نے سوچا اگر دشمن کے دباؤ کے تحت اسے پہاڑ ہونا پڑا، تو دریا پار کرنا مشکل ہوگا اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ جو ہمت نصیب ہے اُس سے فائدہ اٹھایا جائے اور غیر غایت ہرلاب بازار پہنچا جائے، لہذا ۱۰ اور ۱۱ دسمبر کی درمیانی رات کو اس نے جتنی اور جتنی بھی کشتیاں دستیاب ہو سکیں ان کے ذریعے دریا عبور کیا اور جنرل قاضی کے پاس پہنچ گیا۔

اگلے روز ہرلاب بازار میں دفاعی انتظامات مکمل کیے گئے یہاں دو ہفتوں کا راشن اور ایمونیشن موجود تھا۔ جنرل قاضی اور بریگیڈ سعد اللہ نے جنگ کے باقی دن پُر امن طریق پر یہیں بسر کیے۔ جنگ کے آخری دنوں میں دشمن نے ہرلاب بازار سے کوئی ۵ کلومیٹر جنوب میں ریلوے پور اور ننگر گدی کے علاقے میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے فوج اتارنا شروع کر دی جو دھاک کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی تھی مگر ہرلاب بازار کے محافظوں نے اسے چھڑنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ یہ علاقہ اس سیکٹر میں شامل نہیں تھا۔

یہ تھی، ۲۴ بریگیڈ کی کارگزارانہ جو اس نے اپنے جی اوی کی سرپرستی میں اس سیکٹر کے اہم ترین حصے میں منجما ہوا۔ اب آئیے اسی ڈویژن کے دوسرے دو بریگیڈوں کی طرف جو مولوی بازار اور سلٹ میں تھے۔

بریگیڈ سعد اللہ کے بریگیڈ کے شمالی جانب بریگیڈ ژرنا خان کا ۳۱۳ بریگیڈ تھا جس کے پاس ۳۰ ایف ایف اور ۲۲ بلوچ نامی دو پلٹیں تھیں جن کی نفری سرحدی علاقے میں کمال گنج سے لاٹھنگ پھیل چکی ہوئی تھی۔ جس طرح ۲۴ بریگیڈ میں اکھوڑا پر دشمن نے خاص توجہ دی تھی، اسی طرح اس بریگیڈ میں ڈولائی کی سرحدی چوکی اس کی آنکھ میں کھنکھتی تھی۔ اس چوکی کے دفاع کی ذمہ داری ۳۰ ایف ایف کے ایک دستے کے پر دھتی۔ بھارت نے شروع اکتوبر ہی سے اس پر گولہ باری شروع کر دی تھی اور کتنی باہنی نے بھارتی سپاہیوں کی مدد سے سنی بار اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، جس کے پیش نظر یہاں کی نفری ایک پلاٹون سے بڑھا کر ایک کمپنی کے برابر کر دی گئی تھی۔ دشمن کا طریقہ واردات یہاں بھی وہی تھا جو وہ کامیابی سے دوسرے سیکٹروں میں آزمایا تھا، یعنی سٹننے سے فائرنگ کر کے چوکی کو مصروف رکھنا اور پہلوؤں سے پیش قدمی کر کے اسے گھیرے میں لے لو۔ اس نے کوئی چار ہفتے یہ حربہ آزما کر اسے کامیابی نہ ہوئی بالآخر ۳۰ اکتوبر کو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ڈولائی پوسٹ سے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ ہم نے اسے ملک پہنچانے اور آزاد کرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس دوران میں ہمارے مصور سپاہی بڑی جرأت و جواہر دی سے اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے۔ ۳۰ ایف ایف کے جوان سال اور جوان ہتھیار سیکٹر ان کا منڈ ڈائب سپر سالار میجر جاوید نے یہ حالت دیکھی تو اس نے سوچا کہ یوں مصور سپاہیوں کو دشمن کے گرم گرم پھوڑ دینا جو انہری کے خلاف ہے۔ اُس نے پلٹن کے چیدہ چیدہ ۱۸ سپاہی (جو رضا کارا د طور پر میجر جاوید کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے تھے) اکٹھے کیے اور جنوبی سمت سے ڈولائی پوسٹ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ دشمن کا ایک دیدبان (OBSERVER) درخت پر بیٹھا اس جرأت مندانہ پیش قدمی کا نظارہ کر رہا تھا۔ جب یہ درختوں سے نکل کر ڈولائی پوسٹ کے قریب پہنچے تو دشمن نے توپ کے گولے برسائے شروع کیے۔ ایک گولہ میجر جاوید کے پاس پھٹا اور اس کے ٹکڑے اس کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ وہ منڈ کے بل گرا اور وہیں شہید ہو گیا۔ اسی طرح اس کے ساتھی بھی کھیت رہے۔ ڈولائی پوسٹ کا منہ در پہلے کی طرح حلق رہا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ۳۰ فرنٹیر فورس (ایف ایف) کو اتنے بہادروں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ اس سے پہلے اور بعد میں بھی بے دریغ قربانی دیتی رہی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳۰ نومبر تک اس کے ۱۶۰ جیالے قربان ہو چکے تھے جن میں دو افسر تین جونیئر کمیشنڈ افسر اور ۹۰ سپاہی شامل تھے۔ باقی شہیدین کا تعلق رضا کاروں اور سول آرمڈ فورسز سے تھا جو اپنی پلٹن کے ساتھ فرائض انجام دے رہے تھے۔

بریگیڈ ژرنا خان نے اپنے جی اوی (میجر جنرل قاضی) اور کمانڈر ایسٹرن کمانڈ (لیفٹیننٹ جنرل نیازی) کی خدمت میں عرض کیا کہ ڈولائی پوسٹ چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ سامنے سے حملہ کرنے کے بجائے اس سے چند کلومیٹر شمال یا جنوب میں بین الاقوامی سرحد پار کر کے پوسٹ کے پیچھے پہنچا جائے تاکہ دشمن ہمیں اپنا ٹھکانہ اپنی پشت پر دیکھ کر ڈولائی سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے ۳۲ بلوچ، ۳۰ ایف ایف اور ۳۹ بلوچ سے تھوڑی تھوڑی نفری مستعار لے کر ایک جمیٹ یا فورس کھڑی کر لی اور طبقہ علاقوں سے دو توپیں (فیلڈ) اور چار مارٹریں (ہکی توپیں) بھی جمع کر لیں۔

جنرل نیازی نومبر کے اوائل میں وہاں دورے پر گئے جنرل قاضی کی موجودگی میں بریگیڈ ژرنا خان نے انہیں اپنی یکم کی تفصیلات بتائیں مگر جنرل نیازی نے حکم دیا کہ بین الاقوامی سرحد کی قیمت پر پار نہ کی جائے، البتہ اگر بریگیڈ ژرنا خان اپنی اضافی جمیٹ کے زور پر یا کسی اور طریقے سے ڈولائی پوسٹ کو آزاد کر سکیں تو انہیں اجازت ہے، چنانچہ اس فورس کو تین حصوں میں تقسیم کر کے سامنے اور پہلوؤں سے حملہ کیا گیا



جو ناکام رہا جس سے ڈالائی کے حساب میں جائے نقصانات میں مزید اضافہ ہو گیا۔

یہ دقیق ۳۰ ایلف ایلف کے علاقے میں پیش آرہی تھیں۔ اس کے شمال میں ۲۲ بلوچ تھی جو لاٹو، کلورا اور شیرنگر کے سرحدی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں دشمن نے ڈالائی کی طرح ایک پوسٹ پر قبضہ کرکے اس کے بجائے سرحد کے ساتھ ساتھ تمام بیچ و خم کو زبرد بازو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ یکم دسمبر کو اس نے سرحدی علاقوں سے آگے بڑھ کر شیرنگر کے مشرق میں ایک رکاوٹ کھڑی کر دی۔ اس کا پتہ اس طرح چلا کہ اس علاقے سے گزرتے ہوئے راج ٹرکی چوکی سے ریگیڈیرانا پر فزنگ ہوئی۔ وہ بھجریٹ واپس آگئے۔ اگلے روز اطلاع ملی کہ دشمن نے شیرنگر پر حملہ کر دیا ہے۔ اس سے ریگیڈیرانا ٹرک کٹوٹھیں ہوئی، کیونکہ شیرنگر اس علاقے کا نہ صرف اہم قصبہ اور مولسانی مرکز تھا، بلکہ اس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ اس سے مشرق کا سارا علاقہ دشمن کے تسلط میں چلا جائے گا، چنانچہ شکار سے فضا کی مدد مانگی گئی۔ دو سیر ملار سے فوراً آن پہنچے مگر شیرنگر اور اس کے مشرق میں انہیں دشمن کا کوئی نام و نشان نظر نہ آیا۔ جہاز کوئی گولی چلائے بغیر واپس چلے گئے۔

فضائیہ کی بے اثر پروازوں سے کم از کم اتنا تو پتہ چل گیا کہ ابھی تک دشمن نے شیرنگر پر قبضہ نہیں کیا تھا، لیکن وہ اس کے مشرق میں ایک سرحدی پوسٹ کو روک دینا چاہتا تھا جس کے بائیں میں تیار جاتا ہے کہ وہاں ریگیڈیرانا قصبہ شیرنگر کی آخری وقت تک چلا چلا کر اپنے سپاہیوں سے کہہ رہا تھا: دیکھو وہ واپس جا رہے ہیں۔ تم اپنی پوزیشن میں جمے رہو دشمن جا رہا ہے۔ اس کی آواز کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے اپنی پوسٹ ہی میں جا ب دے دی۔

یہ بات عام طور پر کہی جاتی تھی کہ سرحدی چوکیوں سے جائے سپاہیوں کے قدم اکھڑنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے ساتھ نیم عمری نظروں کے افراد بھی تھیں تھے۔ جب گولہ باری ہوتی یا دشمن کا دباؤ بڑھتا تو سب سے پہلے یہ نفری بدکتی۔ ان کے ہٹنے سے نہ صرف مورچوں میں ہتھیار بند افراد کی تعداد کم ہو جاتی، بلکہ سپاہیوں پر بھی اس کا ناخوشگوار اثر پڑتا۔ ان میں بھی اپنی جان بچانے کا جذبہ عموماً آتا۔ فوجی مبصرین اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگلی صفوں میں نیم عمری نظموں کے افراد کو باقاعدہ فوج کی نفری کے دوش بدوش بھی متین نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تھی ریگیڈیرانا کے زیر نگرانی سرحدی علاقے کی حالت جب ۳ دسمبر کو بھر پور جنگ شروع ہوئی۔ انہوں نے اعلان جنگ ہوتے ہی پہلا قدم یہ اٹھایا کہ دونوں پلٹوں (۳۰ ایلف ایلف اور ۲۲ بلوچ) کو اپنے ریگیڈیرانا کوارٹر اور ڈویژن کے مضبوط مقام (STRONG POINT) مولوی بازار میں طلب کر لیا۔ ۳۰ ایلف ایلف کی زیادہ تر نفری سرحدی علاقوں سے سمٹ کر مولوی بازار پہنچ گئی، البتہ اس کی ایک کمپنی جو انتہائی جنوب میں تھی اسے اپنے قریب ۲۴ ریگیڈیرانا (ریگیڈیرانا سدا اللہ) کے ساتھ چل جانے کی اجازت دے دی گئی۔

۲۲ بلوچ تک جب مولوی بازار پہنچنے کے احکام پہنچانے کی کوشش کی گئی تو پتہ چلا کہ اس سے مواصلاتی رابطہ ہی منقطع ہو چکا ہے۔ قدرتی طور پر شیرنگر کے علاقے میں لاٹو، کلورا اور مرزا پور کے علاقوں میں بکھری ہوئی نفری کو کیا ہوا۔ کیا وہ سب نابود ہو گئے؟ اگر ان میں سے کچھ لوگ بچ گئے ہیں تو انہیں کس طرح محفوظ مقام پر لایا جاسکتا ہے؟

خاصی دیروالینس، ہیلو، کی مشن کی گئی۔ بڑی مشکل سے پلٹن کی ایک کمپنی سے رابطہ قائم ہوا وہ بھی اتفاقاً قیام پر۔ پتہ چلا اس کا ایک گروہ لاٹو میں جمع ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں اس اور تیسرا سلسلہ روانہ ہو گیا ہے۔ آخر کار ٹالین ہیڈ کوارٹر سے بھی مواصلاتی رابطہ قائم ہو گیا جو کلور سے ۱۰ کلومیٹر دور چاہیے گئے ایک باغ میں تھا۔ ٹالین ہیڈ کوارٹر نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے شدید حملے میں پلٹن اپنا اتحاد کھو بیٹھی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ ٹالین ہیڈ کوارٹر میں ادکینیاں کہیں۔ ٹالین ہیڈ کوارٹر کو اپنی کچھ نفری تنظیم کھینچ کر لے گیا۔

۶ دسمبر کی بات ہے کہ نیم جرنل قاضی نے ریگیڈیرانا کو حکم دیا کہ وہ اپنا ریگیڈیرانا کے ریگیڈیرانا سدا اللہ (ریگیڈیرانا کے پاس آئیے دیکھو، اکھوڑا، برہن باڑیہ اور ہراب بازار کی جنگ نازک مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور اس سمجھاؤ کو مضبوط کرنا اشد ضروری تھا) ریگیڈیرانا نے اس حکم کی تعمیل سے یہ کہہ کر خود ہی خاموشی سے ریل و سائل کے ذرائع اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ان پر زور دیا گیا کہ ریگیڈیرانا نہیں لاسکتے تو ایک پلٹن ہی بھیج دیجیے، چنانچہ ریگیڈیرانا نے ۳۰ ایلف ایلف کی جنوبی کمپنی ریگیڈیرانا کو بھیج دی تھی جس کا ذکر آگے آیا ہے۔ ۲۲ بلوچ ابھی تک اپنی شیرازہ بندی میں مصروف تھی کہ دشمن شیرنگر، مولوی بازار، سرک پر آ گیا۔ مولوی بازار کے دفاع کی ذمہ داری لا محالہ ۳۰ ایلف ایلف کے سپرد ہوئی جس کے پاس صرف ڈھائی کمپنیاں رہ گئی تھیں۔ کچھ شدید ہو گئے تھے اور ایک کمپنی ۲۴ ریگیڈیرانا کو روانہ کر دی گئی تھی، البتہ نیم عمری نظموں کی کچھ نفری اس کے علاوہ تھی۔ اس پلٹن نے اپنے وسائل کے مطابق مولوی بازار کے دفاع کا اہتمام کر لیا۔

مولوی بازار اور سلسلہ کے درمیان ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جس کا نام کسیرا (KUSIYARA) تھا۔ اس کے دو تین تھے شیر پور اور شادی پور۔ ریگیڈیرانا کواڑ اپنی گاڑیاں اور ساز و سامان لے کر مولوی بازار سے نکل کر دیا کے اُس پار شادی پور منتقل ہو گیا اور ۳۰ ایلف ایلف اور اس کی زیر نگرانی نیم عمری نظموں کی نفری کو مولوی بازار میں متین ہونے دیا۔ دشمن نے یہاں اس کے مورچوں پر ہتھیار اور توپ خانے سے راکٹ اور گولے برسائے شروع کیے۔ ۳۰ ایلف ایلف ایک دو دن آہر نہ بنی ہتھوڑے کی ضربیں سہتی رہی جس کے نتیجے میں اس کے پانچ افراد شدید اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ ۶ دسمبر کو اسے حکم مل گیا کہ وہ گولہ بانو کے ذخائر چلا کر شادی پور تین پر پہنچ جائے۔ جب ۳۰ ایلف ایلف شیرنگر کی طرف روانہ ہوئی تو وہاں سے ریگیڈیرانا کوارٹر سلسلہ چل پڑا۔ یہ ریگیڈیرانا کے مسائل کے لحاظ سے مشکل ایک ٹالین کے برابر رہا تھا، مگر اس کے کمانڈر اب ایک کے بجائے دو ہو چکے تھے۔ جرنل نیازی نے دوران جنگ ریگیڈیرانا کو ڈھاکے سے ریگیڈیرانا کے پاس بھیج دیا تاکہ اگر ایک سے بوجھ نہ اٹھایا جاسکے تو دونوں مل کر اٹھائیں۔ وہ یہ بھول گئے کہ دوسری کمانڈر کمزور کمانڈ سے بدتر ہوتی ہے۔

جب یہ دونوں ریگیڈیرانا سلسلہ جا رہے تھے تو ان کے آگے آگے کیپٹن ظفر کی حفاظتی جیپ تھی۔ شام کے وقت جب وہ سلسلہ کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ شکر کی جنوبی سرحد پر چند سیلی کا پٹرول سے فوج اتر رہی ہے۔ اس نے وہیں رک کر سیلی کا پٹرول شائع کر لیا۔ دس سیلی کا پٹرول اپنا وزن ہلکا کر کے واپس چلے گئے۔ اتنے میں ریگیڈیرانا بھی پہنچ گئے۔ کیپٹن ظفر نے انہیں اپنے شاہد سے آگاہ کیا۔ ریگیڈیرانا نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دشمن شکر پر قابض ہو چکا ہے کیونکہ ان کے قیاس کے مطابق دشمن اس وقت تک سیلی کا پٹرول کے ذریعے ملک نہیں پہنچائے گا جب تک اس کے فوجی دستے شکر کو اپنے تسلط میں نہیں لے لیتے۔

اس دوران میں ۳۰ ایلف ایلف آرام سے شادی پور تین میں بیٹھی رہی۔ اسے دشمن نے زچہ پڑا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر دشمن مولوی بازار کے راستے اس کا پیچ کرنا یا فضا تیر کے ذریعے اس کا ناک میں دم کر دیتا، تو یہ پلٹن فوراً سلسلہ کا کٹ کر جہاں بھارت کی سیلی کا پٹرول اترنے والی فورس کو مزید مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔

ریگیڈیرانا نے ۸ اور ۹ دسمبر کی درمیانی رات کو ۳۰ ایلف ایلف کو سلسلہ بلوایا۔ جو افسر اس پلٹن کے ہر اولی دستے کے ساتھ شمر میں داخل ہوا، اُس نے مجھے بتایا:

سلسلہ ایک آسب زوہ شمر معلوم ہوتا تھا جو اندھیرے کی کنی تھیں میں پلٹا ہوا تھا۔ ماحول پر پُر بھول خاموشی طاری تھی۔ آہستہ



خاموشی میں کبھی کبھار نخل کسی آوارہ کتے کے جھونکنے یا گولیوں کی تڑتڑ سے بڑتا تھا۔

گر یہ شہر خوشاں کیسے ہو سکتا تھا؟ اس میں بریگیڈیئر سلیم کا ۲۰۲ ہنگامی بریگیڈ بھی تو تھا؟ اس پر کیا ہوتی؟

اس بریگیڈ میں صرف ایک ہی باقاعدہ پلٹن (۳۱ پنجاب) تھی۔ باقی نفزی فزٹریکوز، ریجرز اور رضاکاروں پر مشتمل تھی۔ بھاری ہتھیاروں میں آرٹلری کی ایک بیڑی مین تھی۔ اس بریگیڈ کو یہ فرض سونپا گیا تھا کہ وہ سہلٹ کی مشرقی سرحد پر لاٹھ سے لے کر (جہاں تک بریگیڈیئر لانا کا بریگیڈ تھا) شمالی سرحد پر طاہر پور تک (جہاں ضلع میں سنگھ کی حد شروع ہوتی تھی) دفاع کرے۔ اور دفاع بھی بھارت کی ۴۴ کر کے کوستان ڈویژن (MOUNTAIN DIVISION) کے خلاف جو نفزی طرح کیل کاٹنے سے لیں تھا۔

بھارتی ڈویژن کے سامنے دو مشن تھے۔ ایک مشرق میں اور ایک شمال مشرق میں۔ جنہیں استعمال کر کے وہ سہلٹ پر قبضہ کر سکتا تھا۔ لہذا مشرق میں انگرام، ڈی گنج اور چارکھائی کی چوکیاں قائم کی گئیں اور شمال مشرقی سمت سے دشمن کو روکنے کے لیے جیتی ٹور، نیم اور غامگ میں دفاعی انتظامات کیے گئے۔ شمال مغرب سمت میں نیم عسکری نفزی قینقات کی گئی جن کے مورچے چھانک اور گونین تک پہلے ہوئے تھے۔ اس حصے سے کچے رائے گزرتے تھے جنہیں بوقت ضرورت دشمن استعمال کر کے سہلٹ کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔

بریگیڈیئر سلیم اللہ کے لیے شکل بھی کران کے پاس سرحدی علاقہ بہت طویل اور وسائل بہت محدود تھے۔ ساری نفزی میں صرف ۳۱ پنجاب ہی ایک قابل اعتماد پلٹن تھی۔ اسے ایک محاذ پر لگا دیا جاتا، تو دوسرا محاذ رہ جاتا۔ دشمن کی مرضی کا کیا پتہ کہ وہ مشرق سے آتا ہے یا شمال سے لہذا اس پلٹن کو کسی ایک جگہ لگانے کے بجائے آٹھ دستوں میں تقسیم کر کے اسے انگرام (مشرق) سے سام گنج (مغرب) تک پھیلا دیا گیا۔ ہر دستے کے ساتھ نیم عسکری نفزی لگادی گئی تاکہ مورچے بھرے بھرے لگیں اور دشمن انہیں تڑنواں سمجھ کر ہڑپ نہ کر جائے۔

دوسرے محاذوں کی طرح اس سیکٹر میں بھی دشمن نے اپنی سرگرمیاں جنگ سے بہت پہلے شروع کر دی تھیں۔ ۱۵ اکتوبر کو بھارتی ہائیڈرو گرافی (B.S.F.) کی بتائیں نمبر ۸۵ نے کئی باہنی کی ایک پلٹن (سابق ۳ ایسٹ بنگال) کے ساتھ مل کر چھانک پر حملہ کر دیا۔ یہاں حملہ کرنے کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا کہ وہ اس قبضے اور اس سے ملحق سینٹ فیکٹری پر قبضہ کر لے۔ حملے کی گھن گرج سن کر بھاری نیم عسکری نفزی سرحدی چوکیوں سے نکل کر قبضے میں آگئی۔ بریگیڈیئر سلیم اللہ کو اس پانی کا علم ہوا، تو انہیں سنبھالا دینے کے لیے سہلٹ کے مشرق میں چارکھائی سے باقاعدہ فوج کی ایک کمپنی اور آرٹلری کی دو توپیں بھجوا دیں۔ بعد ازاں ۲۰ ایف ایف کی ایک کمپنی بھی مستعار لے کر وہاں روانہ کی گئی۔ یہ فورس وہاں اکٹھی کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جوابی حملہ کر کے دشمن کو پاک سحرزین سے باہر چھینک دیا جائے، چنانچہ ۲۳ اکتوبر کو حملہ کیا گیا جو کامیاب رہا۔

اس کامیابی کا اثر یہ ہوا کہ دشمن نے یہ علاقہ چھوڑ کر سہلٹ کے مشرق میں انگرام اور ڈی گنج کے علاقوں پر ایک مکمل بریگیڈ (۵۹) سے حملہ کر دیا۔ اس زوردار حملے کی وجہ سے وہاں سے ۳۱ پنجاب کی پلاٹون سمیت نیم عسکری نفزی پیچھے ہٹ گئی۔ ہم نے ادھر ادھر سے اجزائے جمع کر کے دشمن کو واپس دھکیلنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔ ہمیں مجبوراً اپنی دفاعی لائن چارکھائی میں قائم کرنی پڑی جو سہلٹ سے ۲۲ کلومیٹر مشرق میں واقع تھی۔

بریگیڈیئر سلیم اللہ پر یوں مشرق مغرب سے دباؤ ڈھنے لگا، تو انہوں نے اپنے جی اوسی کے ذریعے ایسٹرن کمانڈ تک یہ بات پہنچائی کہ اگر واقعی سہلٹ کو بچا جائے، تو مزید نفزی ہتیاں کی جائیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ نومبر کے وسط میں جنرل نیازی نے سحر جنرل حبشہ اور بریگیڈیئر باقر صدیقی کو راولپنڈی (جی ایچ کیو) بھیجا تھا جہاں سے وہ مزید آٹھ پلٹنوں کا وعدہ لے کر لوٹے تھے۔ ان پلٹنوں میں سے پانچ نومبر

کے آخر میں مشرقی پاکستان پہنچ گئی تھیں۔ ان پلٹنوں میں سے ایک ۱۲ آزاد کشمیر رجمنٹ تھی جس کی دو کمپنیاں بریگیڈیئر سلیم کو ملی تھیں۔ یہ پلٹن مشرقی پاکستان کے خزانے اور اس کی تازہ صورت حال سے بالکل بے خبر تھی۔ اس کی ٹینک کا زنجیر تندی نالوں کے بجائے تہاڑی لڑائی پر رہا تھا۔ ان مجبوروں کے باوجود یہ نفزی بڑی مفید تھی کہ کم از کم مورچوں میں بیٹھ کر دشمنی سے فائدہ اٹھانے کی، چنانچہ ایک کمپنی کو چارکھائی اور دوسری کو جیتی پور میں لگا دیا گیا۔

آزاد کشمیر رجمنٹ کی دو کمپنیوں کی آمد کا دشمن نے کوئی اثر نہ لیا۔ وہ حسب معمول اپنی اشتعال انگیز سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ اس نے کئی باہنی کو آگے لگا کر چارے سرحدی علاقے میں دخل اندازی جاری رکھی جس کے نتیجے میں اس نے ۲۲ بجبر تک انگرام سے طاہر پور تک بارڈر کے ساتھ ساتھ ۵ سے ۶ کلومیٹر لمبی پٹی اپنے قبضے میں کر لی۔ یہ پٹی سام گنج کے پاس ۱۲ سے ۱۵ کلومیٹر تک اور ڈی گنج کے قریب ۳ کلومیٹر تک پھیل چکی تھی۔ گویا جنگ سے پہلے اس سیکٹر میں ہمارا کئی سو مربع کلومیٹر رقبہ دشمن کے قبضے میں چلا چکا تھا۔

جب بھرپور جنگ کا آغاز ہوا، تو اس سیکٹر میں دشمن نے تین دفاعی مقامات پر خصوصی توجہ دی۔ مشرق میں چارکھائی، شمال میں ہموار شال منڈ میں چھانک۔ جنگ کے پہلے تین دن ان دفاعی مورچوں میں کوئی خم نہ آیا جس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ اس عرصے میں دشمن کی توجہ سحرزین اور ہراب بازار کی طرف زیادہ رہی جو فوجی نقطہ نظر سے زیادہ اہم سیکٹر تھا۔ جب ادھر صورت حال واضح ہو گئی اور ۲۴ بریگیڈ (سندھ) کے بعد ۳۱۳ ہنگامی بریگیڈ (رانا) کے قدم بھی اکٹھے گئے، تو اس نے سہلٹ کی طرف رجوع کیا۔

۴ دسمبر کا واقعہ ہے کہ سہلٹ سے دفاعی کالینڈر کے ایک سابق ذریعہ جناب اجمل جو دھری بریگیڈیئر سلیم اللہ کے ہیڈ کوارٹر میں تشریف لائے اور اطلاع دی کہ انہوں نے شہر کے مشرقی کنارے پر پیراں چک میں دشمن کے پہلی کاپٹروں سے فوج اترتے دیکھی ہے (یہ محب وطن پاکستانی بعد میں کئی باہنی کے ہتھے چڑھ گیا جنہوں نے اسے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا) اسی روز بریگیڈیئر رانا کے آگے سہلٹ میں داخل ہونے والے کمپنیں طر ف بھی سات سپاہیوں کے ساتھ مقامی مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئے جہاں انہوں نے لیفٹننٹ کرنل سر فزاکو بیل کاپٹر اترنے کا آنکھوں دیکھا حال سنایا۔ اس وقت سرپر کے ۱۴م بجے تھے۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ آٹھ دس پہلی کاپٹروں سے اترنے والی نفزی کا سات سپاہیوں کی مدد سے صفایا نہیں کیا جاسکتا۔

اتنے میں بریگیڈیئر سلیم اللہ نے جیتی پور پوسٹ سے ۳۱ پنجاب کا ایک دستہ (۲۹ افراد) منگوا کر کمپنیں بشارت کی سرکڑگی میں میراں چک روانہ کر دیا۔ جب کمپنیں بشارت وہاں پہنچا، تو پہلی کاپٹروں کی ایک اور کھپ نفزی اُتار رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں ۲۹ آدمیوں سے ان کا کیا بگاڑوں گا، چنانچہ اس نے دوسرے ان پر انکا ڈکانا کر لیا اور بس!

اسی اثناء میں ۲۲ بلوچ کے وہ سپاس سپاہی بھی پہنچ گئے جولا اور کھور میں پلٹن سے پھڑک سہلٹ روانہ ہو چکے تھے۔ اس دستے کو فوراً کمپنیں بشارت کے پاس بھیجا گیا تاکہ ۹، ۱۰ (۲۹ + ۵۰) آدمیوں کی مدد سے وہ دشمن کو واپس جانے پر مجبور کرے۔ یہ کمک پہنچتے پہنچتے ۸ دسمبر کا سونچ طلوع ہو گیا۔ دشمن اتنے میں اپنی قوت میں اضافہ کرتا رہا اور ہم خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے۔

دوبلی کاپٹر اچانک سہلٹ شہر میں سرکٹ ہاؤس اور کینٹن برج (KAEN BRIDGE) پر پرواز کرتے دکھائی دیے۔ خیال تھا کہ یہ شہر کا فضا جی بانڈ لے رہے ہیں تاکہ میراں چک میں آتری ہوئی فوج شہر میں داخل ہونے کا منصوبہ بناسکے۔ یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ ان پہلی کاپٹروں نے وہ بانی کے ساتھ ساتھ سرکٹ ہاؤس میں ایک ہم بھی چھینک دیا جس سے دفتر کا ایک کلک اور پولیس کے تین سپاہی بھی ہو گئے۔ زمیندار کو آٹھانے کے لیے کچھ جولاں باہر نکلے، تو پہلی کاپٹروں نے ان پر گولیاں برسادیں جن سے مزید نقصان ہوا۔

۸۔ دسمبر کو سلٹ چھاؤنی کے وسائل میں یوں کچھ اضافہ ہوا کہ بریگیڈیئر رانا کاٹھنا پھوٹا بریگیڈ (۳۰) ایف ایف اور ۲۲ بلوچ) بھی وہاں پہنچ گیا۔ دو توپیں پہلے ہی سلٹ میں تھیں دو اور اس بریگیڈ کے ساتھ آگئیں۔ وسائل کے سلسلے میں شاید یہ ذکر غیر مناسب نہ ہو گا کہ اب سلٹ میں ایک وقت تین بریگیڈیں موجود تھیں۔ بریگیڈیئر سلیم، بریگیڈیئر رانا اور بریگیڈیئر حسن (جنہیں رانا کاٹھنا بنانے کے لیے دھکا سے مجبور کیا تھا)۔

ان تین کمانڈروں کو جو سب سے اہم مسئلہ درپیش تھا یہ تھا کہ سلٹ کی نخل میں اتنی ہوتی بھارتی فوج سے کس طرح پٹا بنائے انہوں نے طے کیا کہ ۲۲ بلوچ کے کمانڈنگ آفیسر کو پنجاب، بلوچ اور فرنٹیر فورس کی مخلوط نفری اور چار توپوں سمیت دشمن کی سرکونی کے لیے مجبور بنائے کرنل صاحب نے اس حکم کو بجا لانے میں یہ مجبوری ظاہر کی کہ میرے سپاہی تھکے ہوئے آئے ہیں وہ حملہ کرنے کے قابل نہیں۔ اگلے روز (۹ دسمبر) یہی کام ۳۰ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر کو سونپا گیا۔ انہوں نے بھی تھکاوٹ کا ہبانہ کر مہدوری ظاہر کر دی۔ ۱۰ دسمبر کو دشمن سے نیٹھنے کا ایک اور پلان تیار کیا گیا جو مختصر یہ تھا کہ ۳۰ ایف ایف اور ۳۱ پنجاب کی نفری پر شتل دودھ سے ترتیب دیے جائیں۔ ایک دستہ شمالی جانب سے خاموشی کے ساتھ دشمن کے قریب پہنچ جائے اور دوسرا دستہ سامنے سے پورے زور سے حملہ کرے بغیر خیال تھا کہ دشمن کی توجہ سامنے والے حملے کی طرف ہوگی اور جب اچانک شمالی جانب سے اس پر لینا کی جائے گی، تو وہ ہڑبڑا اٹھے گا۔ اس پلان کو حسب توقع عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا، کیونکہ سامنے سے ۳۱ پنجاب کا دستہ کوئی کارروائی نہ کر سکا، دشمن وہیں کا وہیں یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب ہم دشمن کے خوف سے اس کے قریب جانے سے ہچکچاہے تھے، دشمن خود ہمارے خوف سے کانپ رہا تھا۔ اسے شدت سے یہ احساس تھا کہ میں غیر کے علاقے میں گھس آیا ہوں اور میرا اپنی فوج سے کوئی زمینی رابطہ نہیں رہا۔ اگر مجھ پر کوئی افتاد آن پڑی تو میں کہاں چھپوں گا اور کس کی مدد چاہوں گا؟ یہ باتیں ہمیں اس پلٹن (۵ گورکھا رائفلز) کے ایک افسر نے بعد میں بتائیں۔ اس نے انکشاف کیا کہ جب ۷ اور ۸ کی درمیانی رات کو (کیپٹن ظفر اور اس کے سات آدمیوں کی طرف سے) پہلی مرتبہ فارکیا گیا تو بھارتی کمانڈنگ آفیسر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ امان اسی میں ہے کہ فوراً اپنے علاقے میں واپس چلے جائیں۔ وہ ساری رات اسی تذبذب میں رہے کہ واپس چلا جائے یا نہیں رہا جائے۔ ان کی قوت فیصلہ کا فقدان ان کے اٹے آگیا، کیونکہ اتنے میں بھارتی نفری پہنچ گئی۔ اور پاکستان نے بھی نہ چھپڑا!

اس پہلی کاپٹر فورس سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بھارت نے ایک دستہ ذکی گج" کے راستے روانہ کیا۔ اسے سرحدی چوکیوں میں معمولی مدافعت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن یہ آگے بڑھتا رہا اور ۱۲ دسمبر کو اس فورس کے ساتھ مل گیا۔ پہلی کاپٹر فورس پورے پانچ روزوں... (۷ دسمبر سے ۱۲ دسمبر تک) بے یار و مددگار پڑی رہی مگر اس کا کسی نے بال بیکا نہ کیا۔

ہم نے بڑھ کر دشمن کا سر ٹپکنے کے بجائے اپنی جان بچانے پر زیادہ توجہ دی اور ۱۳ دسمبر کو مزید پیچھے ہٹ کر سلٹ شہر اور اس سے باہر سلوچی ایئر فیلڈ (SALUCHI AIR FIELD) تک اپنے آپ کو محدود کر لیا۔ بقیہ علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ تینوں بریگیڈیئر اور ان کے زیر کمان نفری اس ہی دو مقامات پر خاتمہ جنگ تک دبی رہی۔

# چاندپور سیکٹر (۳۹ ہنگامی ڈویژن)

جیہا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے مشرقی سرحد کا جنوبی حصہ (کومیلہ سے فینی تک) میجر جنرل رحیم کے پاس تھا جنہیں مارشل لا ڈویژن سے ہٹا کر ۳۹ ہنگامی ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کا کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں چند اشاف آفیسر اور بہت سے جنگی نقشے لے کر ڈھاکہ سے چاندپور منتقل ہو گئے تھے۔ انہیں یہاں بھیجنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی محنت، دیانت اور پیشہ ورانہ مہارت کے لیے شکوت تھے اور دوسری یہ کہ جنرل نیازی ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جنگ سے پہلے بھی جنرل نیازی پیشہ ورانہ معاملات میں اکثر مشورہ لیتے رہتے تھے، حالانکہ ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے طور پر دفاعی امور میں ان کا کوئی دخل نہیں تھا۔

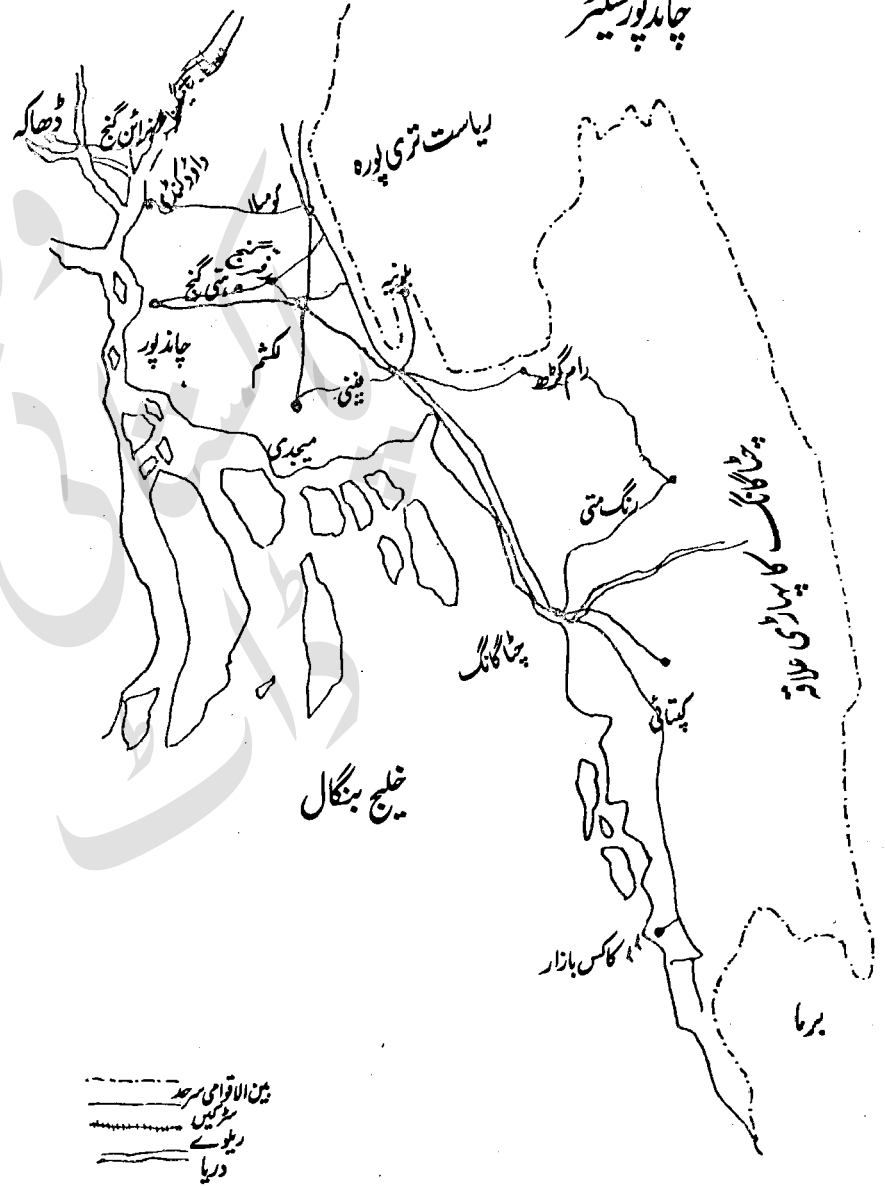
جنرل رحیم کو اس سیکٹر کے دفاع کے لیے دو بریگیڈوں کی کمان دی گئی۔ ان کا ۱۱ بریگیڈ کومیلہ میں تھا جس کی کمان بریگیڈیئر عاطف کر رہے تھے اور ۵۳ بریگیڈ جو ڈھاکہ کے منتقل ہو کر فینی آیا تھا بریگیڈیئر اسلم نیازی کے پاس تھا۔ بریگیڈیئر نیازی کا جنرل نیازی سے صرف فنی صلاحیت کا رشتہ تھا، یہ دونوں بریگیڈ چاندپور میں واقع ۳۹ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے ماتحت تھے۔ چاندپور دیانے میگھنا کے مشرقی کنارے واقع تھا۔ کومیلہ کے جنوب سے چوٹنے والی سرک مظفر گنج اور فیٹی گج سے ہوتی ہوئی چاندپور جاتی تھی۔

اس سیکٹر میں مذکورہ سرک واحد راستہ تھا جس سے بھارتی فوج ٹینک اور توپیں باسانی مشرقی پاکستان میں داخل ہو سکتی تھیں۔ اس حملہ آور سپاہ کے پیش نظر دو مقاصد ہو سکتے تھے۔ یا تو وہ سرحد سے چند کلومیٹر اندر آ کر کومیلہ کے پیچھے جاسکتی تھی یا وہ سیدی چاندپور پہنچ کر دیانے میگھنا کے ذریعے ڈھاکہ کا رخ کر سکتی تھی۔ میجر جنرل رحیم اور ان کے کمانڈر جنرل نیازی کا خیال تھا کہ جوئی دشمن سرحد پار کر کے مظفر گنج / چاندپور روڈ پار چڑھے گا، شمال سے ۱۱ بریگیڈ (کومیلہ) اور جنوب سے ۵۳ بریگیڈ (فینی) قبضی کے دوپروں کی طرح آپس میں ملیں گے اور دشمن کا بڑھا ہوا سرگرم کر دیں گے۔

۳۹ ہنگامی ڈویژن کے جنوب میں چٹاگانگ اور چٹاگانگ کا پہاڑی علاقہ تھا جہاں کسی بڑے جنگی محرکے کی توقع نہ تھی (دشمن کے ذریعے دشمن کے چٹاگانگ ساحل پر اترنے کی بات دوسری تھی جس کا سبب موجودہ وسائل کے پیش نظر نامکن تھا) کیونکہ فینی سے نیچے جو سرحدی علاقہ بھارت سے ملتا تھا وہ ایک پہاڑی سلسلہ تھا جس میں قابل ذکر فوجی جمعیت کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ چٹاگانگ کے دفاع کے لیے چٹاگانگ ہی میں ایک بریگیڈ (۹۷) قائم تھا جس کی کمان بریگیڈیئر عطا ملک کے سپرد تھی۔ ان کے پاس ۲۴ ایف ایف اور ۲ کمانڈو بمالین تھی جنہیں انہوں نے بالترتیب چٹاگانگ اور کپتان میں رکھا ہوا تھا۔

کومیلہ کے جنوب میں اگر کہیں فیصلہ کن لڑائی لڑی جاسکتی تھی تو وہ فینی اور کومیلہ کا درمیانی علاقہ تھا۔ فینی کے پاس بین الاقوامی سرحد دم باہر نکل کر پھر سیدی ہو جاتی تھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھ کا انگوٹھا الگ اکڑا ہوا کھڑا ہے۔ اسے بلونیا بلج (BELONIA BULGE)

چاندپور سیکٹر



کہتے تھے۔ جنگ سے پہلے بھارت نے بی بیج یا ابھار کاٹنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس نے نومبر کے آغاز میں اس ابھار کے نصف حصے پر خاموشی سے قبضہ کر لیا۔ جب ہمیں اس کا پتہ چلا تو معلوم ہوا کہ سامنے کے مورچوں میں کتنی باہمی اور پچھلے مورچوں میں بھارتی سپاہی بیٹھے ہیں۔ بلونیا بیج (BELONIA BULGE) پر دشمن کا قبضہ ہونے سے اس سڑک یا ریل کی پٹری کو استعمال کرنا ممکن نہ تھا جو اس کے پاس سے شمالاً جنوباً گزرتی تھی۔ یہ ابھار یا بیج (BULGE) دشمن کے پاس رہنے کا ایک اور نقصان تھا کہ پھر پورے جنگ پھرتے ہی دشمن بیک جنبش چٹا گانگ کو بدلنے والی سڑک پر سوار ہو سکتا یعنی چٹا گانگ کا سمندری دفاع تو اپنی جگہ پیچھے سے دشمن اس کی پشت میں پھر گھونپ سکتا تھا۔ اس کے تدارک کے لیے جنرل نیازی نے نصف درجن ہنگامی بریگیڈ ہیڈ کوارٹرول میں سے ایک بریگیڈ ہیڈ کوارٹر (۹۱) بریگیڈ ٹرینکین کی قیادت میں اس سڑک پر بٹھادیا۔ بریگیڈ ٹرینکین کے حصے میں جو نفری آئی، اس میں ۲۱ آزاد کثیر رجمنٹ کی دو کمپنیاں مع بٹالین ہیڈ کوارٹر، مغربی پاکستان پولیس اور ای پی سی لے ایف کے افراد تھے۔

۳ دسمبر کو پھر پورے جنگ پھرتے پر دشمن کا دباؤ کو میلا کے جنوبی پہلو پر پڑا جہاں ۱۱ بریگیڈ کی ایک پلٹن (۲۵ ایف ایف) متعین تھی۔ جنرل نیازی کی پالیسی کے مطابق اس پلٹن کی دو کمپنیاں (بٹالین ہیڈ کوارٹر سمیت) عین سرحد کے پاس مورچے بند تھیں اور دوسری دو کمپنیاں پینڈ کلو میٹر پیچھے لال مانی کی پہاڑیوں پر مقیم تھیں۔ اگلی کمپنیوں کے عقب میں ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جسے پار بتی پور کہتے تھے۔ ۳ اور ۴ دسمبر کی رات کو بھارت کے ۹۱ کوہستانی بریگیڈ (MOUNTAIN BRIGADE) نے ہماری اگلی کمپنی پر حملہ کر دیا۔ حملہ آور بریگیڈ کے ساتھ میٹیم توپوں کی ایک رجمنٹ اور ٹینکوں کا ایک ہکوڈرن بھی تھا۔ ہمارے جوانوں کے پاس صرف وہی ہتھیار تھے جو عموماً پیدل فوج کے پاس ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے وسائل کے مطابق دشمن کو روکنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔

۲۵ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر نے اجازت طلب کی کہ مجھے پسپا ہو کر پار بتی پور کے کنارے پر مورچے بند ہونے کی اجازت دی جائے تاکہ میں وہاں سے مؤثر طریق پر دفاع کر سکوں مگر اس کی اجازت نہ دی گئی، بلکہ حکم ہوا کہ سرحد کے ساتھ ساتھ لپٹے مورچوں میں ڈٹے رہو۔

دشمن نے سامنے سے انہیں جنگ میں مصروف رکھا اور ایک اور دستہ کتنی باہمی کی رہنمائی میں اس کے عقب میں بھیج دیا۔ انہوں نے دریائے پار بتی پور کے مشرقی کنارے پر قبضہ کر لیا۔ اس سے کچھ دیر بعد بٹالین کا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر (کو میلا) سے مواصلاتی رابطہ ٹوٹ گیا۔ اس سے بریگیڈیئر عاطف کو پریشانی ہوئی کہ آخر ہوا کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۵ ایف ایف نیست و نابود ہو گئی؟ اگر خدا نخواستہ اس پر کوئی افتاد آن پڑی تو اسے روندنے والے دشمن کی پیش قدمی کا رخ کس جانب ہو سکتا ہے؟ کیا وہ گھوم کر کو میلا کے عقب میں آ رہا ہے یا اس کا رخ چاند پور کی طرف ہے؟

بریگیڈیئر عاطف نے کو میلا چھاؤنی سے ۳۰ پنجاب کا ایک دستہ حالات کی ٹوہ لگانے کے لیے گشت پر روانہ کیا۔ یہ دستہ کو میلا کے ملحقہ علاقے میں چکر کاٹ کر واپس آ گیا۔ اس نے اطلاع دی کہ اس علاقے میں دشمن کے کین آٹار نہیں ہیں۔ اس کے باوجود تنقویش اپنی جگہ برقرار رہی کہ آخر ۲۵ ایف ایف کو ہوا کیا ہے؟ کیا وہ دشمن کے دباؤ سے جنوب کی طرف پسپا ہو گئی ہے؟ اس امکان کے پیش نظر جنوبی طرف متعین ۲۳ پنجاب کو وائرل پر کمانڈ کیا کہ ۲۵ ایف ایف کو وصول کرنے کے لیے تیار رہے، مگر ۲۵ ایف ایف اُدھر بھی نمودار نہ ہوئی۔

عقدہ اس وقت کھلا جب ۴ دسمبر کو ۱۱ بجے کے قریب ۲۵ ایف ایف کے ایک حوالدار نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں یہ خوش خبر سنائی

کہ اس کی پلٹن کی دو کمپنیاں بٹالین ہیڈ کوارٹر اور بٹالین کمانڈر سمیت دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال چکی ہیں۔ اس خبر کی تصدیق سرسپر کو آل انڈیا ریڈیو سے بھی ہو گئی جب اس نے بڑے فخر سے اعلان کیا کہ پاکستان کے ایک لیفٹیننٹ کرنل، چھ دوسرے افسروں اور دو سپاہیوں کو قیدی بنالیا گیا ہے۔

جنگ کے ابتدائی مرحلے ہی میں ایسے واقعہ کا پیش آنا انتہائی افسوسناک تھا۔ اب مثلیہ درپیش تھا کہ ۲۵ ایف ایف کے ہٹنے سے دفاعی لائن میں جو شگاف پڑ گیا ہے اسے کیسے پُر کیا جائے۔ ۲۳ پنجاب کو حکم دیا گیا کہ وہ ڈرا شمال میں پھیل کر اس خلا کو پُر کرنے لگے۔ پلٹن ایسا کر کے، کیونکہ خود اس پر بھارت کے ۳۰۲ بریگیڈ نے حملہ کر دیا تھا جس کے ساتھ تو پناہ نے (فلڈز) کی ایک رجمنٹ بھی تھی۔ جنگ کی پہلی رات، حملے کی شدت کے پیش نظر ۲۵ ایف ایف کی طرح ۲۳ پنجاب نے بھی اجازت چاہی کہ یہ اپنے سرحدی مورچوں سے پسپا ہو کر اپنے عقب میں ہٹنے والے دریائے ڈکا ٹیر پر پوزیشن سنبھال لے۔ اُسے بھی اپنی جگہ ڈٹے رہنے کا حکم دیا گیا۔ اگلی صبح حالات بدتر ہوئے، تو حکام بالائے کما اب بیشک پیچھے ہٹ آؤ، مگر کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید کے خیال میں دن کی روشنی میں پیچھے ہٹنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ اگر وہ اپنے سرحدی مورچوں میں دن گزاریں تو رات کو پسپا ہونا آسان ہوگا، مگر دن کے وقت جب کرنل سید کے نائب میجر مظفر اقبال کشم سے ایک فوجی دستے کے ساتھ کرنل سید کے پاس جا رہے تھے تو ڈکا ٹیر کے قریب ان پر گولیاں برسی شروع ہو گئیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اگرچہ ۲۳ پنجاب کے سپاہی ابھی سرحد پر ہیں، دشمن کتنی باہمی کی مدد سے ان کے عقب میں پہنچ گیا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ۲۳ پنجاب کی سپاہی کا راستہ بھی مسدود ہو چکا ہے۔ میجر مظفر نے دلیہ کشم اگر بریگیڈیئر اسلم نیازی کو دیکھائے ڈکا ٹیر کے قریب دشمن کی موجودگی کی اطلاع دی۔ انہوں نے یہ کہہ کر بات گواہی کو تم نے کتنی باہمی دیکھی ہو گئی؟

اُدھر جب لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید کو معلوم ہوا کہ دشمن ان کے عقب میں پہنچ چکا ہے تو انہوں نے رات ہونے کا انتظار کیے بغیر بلا تاخیر پسپا ہونے کا فیصلہ کیا۔ ڈکا ٹیر کا راستہ نزدیک ترین، مگر خطر تھا۔ انہوں نے کشم پہنچنے کے لیے جنوبی سمت کو (جہاں ان کی اپنی کمپنی لگی ہوئی تھی) محفوظ جانا۔ وہ بٹالین ہیڈ کوارٹر میں زخمیوں کو ڈاکٹر کے سپرد کر کے سرسپر کو کشم روانہ ہو گئے۔ راستے میں جو کمپنی بڑتی تھی اسے بھی واپسی کے احکام دیتے آئے اور وائرل کے ذریعے سرحدی مورچوں میں متعین نفری کو بھی نئی منزل کشم کی اطلاع دے دی۔ تمام کمپنیاں بحیرہ ریت نکل آئیں سوائے ایک کے جو چود گرام کے سرحدی مورچوں میں دشمن سے برسر پیکار تھی۔ فائرنگ ختم ہونے سے پہلے وہاں سے نکلنا ممکن نہ تھا؛ چنانچہ میجر اکرم نے غریب آفتاب تک لڑائی جاری رکھنے اور تاریکی میں مناسب وقفے پر پسپا ہونے کا فیصلہ کیا۔ میجر اکرم کو کسی نے نہیں بتایا تھا کہ دریائے ڈکا ٹیر تک دشمن پہنچ چکا ہے۔ وہ ابھی تک یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ اس دریائے پل کے پاس ہماری توپیں نصب ہیں۔ پسپا ہو کر وہاں پہنچنا سودمند رہے گا، کیونکہ وہاں سے آگے بکشم تک راستہ صاف تھا۔ چنانچہ وہ اپنی گن پوزیشن کی سیدھ میں آتے ہوئے اچانک دشمن کے کھار میں جا گئے۔ دشمن نے جو نئی نئی جگہ پہنچ کر بہت چمکتا بیٹھا تھا، فوراً ناکھول دیا۔ ہمارے بہت سے جوان شہید اور زخمی ہو گئے۔ خود میجر اکرم کے پیٹ میں گولیوں کی بوچھاڑ پیوست ہو گئی۔ وہ نیم مرده حالت میں رات کو کھیت ہی میں پڑے رہے۔ صبح کو جب دشمن جنگی نقشوں کے لایج میں ان کی تلاش لینے آیا، تو اس نے دیکھا کہ میجر اکرم اور ان کے بعض ساتھیوں میں ابھی سانس باقی ہے۔ وہ انہیں اٹھا کر اپنے طبی مرکز میں لے گیا جہاں ان کی مرہم پٹی کی گچی میجر اکرم اب ماشاء اللہ لیفٹیننٹ کرنل ہیں ان کے پیٹ پر گولیوں کے داغ اور ذہن پر اسر پیاپی کے زخم تازہ ہیں۔

سرحد سے ۲۵ ایف ایف اور ۲۳ پنجاب کے ہٹنے سے اتنا شگاف پڑ چکا تھا کہ دشمن اپنی خاصی فوج چاند پور جانے والی سڑک

پر ڈال سکتا تھا؛ چنانچہ بریگیڈیئر اسلم نیازی کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا بریگیڈ (۱۵ بلوچ اور ۳۹ بلوچ) جو فنی کے علاقے میں تھیں، کاشمیر میں اکٹھا کر لیں۔ کاشمیر چاندپور روڈ سے کوئی دس کلومیٹر جنوب میں تھا۔ اس کے سامنے چاندپور روڈ پر مظفر گنج پڑتا تھا۔ کاشمیر میں دفاعی قلعے کی حیثیت سے دافر مقدار میں راشن اور ایویشن جمع کیا گیا تھا جب فنی سے بلوچ رجمنٹ کی دونوں پلٹیں واپس بلوائی گئیں تو اس علاقے سے ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کی دو کمپنیاں اور پانچ تین ہینڈ گارڈ بھی کاشمیر منتقل کر دیا گیا۔ آزاد کشمیر کی فنی کے انچارج لیفٹیننٹ کرنل زیدی تھے۔ یہ ساری فنی ۵ اور ۶ دسمبر کی درمیان رات کو کاشمیر میں اکٹھی ہو گئی۔ یہ وقت اس لحاظ سے بڑا نازک تھا کہ اس دوران میں دشمن سرحد سے مظفر گنج کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ گراس ہیلو پر پوری توجہ زدی گئی اور ۵ بریگیڈ کو کہا گیا کہ آپ لوگ تھکے ہوئے آئے ہیں آج رات آرام کریں صبح کو جنرل جیم کاشمیر تشریف لائیں گے اور نئے احکام دیں گے۔

۶ دسمبر کی صبح کو حسب وعدہ جنرل جیم کاشمیر روانہ ہوئے۔ ان کے آگے آگے فنی پولیس کی جیپ تھی جو حفاظتی دستے کا کام بھی دیتی تھی۔ جب یہ جیپ مظفر گنج کے قریب پہنچی تو اس پر اچانک فائرنگ ہوئی، یوں جنرل جیم کو وہاں دشمن کی موجودگی کا احساس ہوا اور وہ اپنا دودھ منسوخ کر کے واپس چاندپور تشریف لے گئے۔

اب اس سیکڑ کی قسمت کے فیصلے کی گھڑی آگئی تھی۔ دشمن اپنی فوری طاقت سے چاندپور کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ ہمارے دو بریگیڈ چاندپور روڈ کے شمال (۱۱۴ بریگیڈ کوئٹا) اور جنوب (۵۳ بریگیڈ کاشمیر) میں بیٹھے تھے۔ خود جنرل جیم اپنی تمام تر ذہانت اور پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ چاندپور میں تشریف رکھتے تھے۔ مزید بات اس بات کی تھی کہ پلان کے مطابق دونوں بریگیڈ فنی کے پردوں کی طرح آپس میں ملتے اور چاندپور روڈ پر دشمن کا سر بڑھا ہوتا، تو سر قلم کر دیتے اور اگر دھڑا گے ہوتا، تو دھڑکاٹ دیتے۔ لیکن افوس کہ فنی گھنٹے کسی کارروائی کے لیے گزر گئے۔ بریگیڈیئر اسلم نیازی کاشمیر میں بیٹھے دفاعی قلعہ بندی مضبوط کر رہے اور بریگیڈیئر عطا علی خود کو اپنے مورچوں میں محفوظ محسوس کرتے رہے۔ ہمارے امن و تعطل کے دوران میں دشمن اپنی ہماری جہیز مظفر گنج چاندپور روڈ پر لے آیا۔

بالآخر ۶ دسمبر کو کاشمیر میں کچھ حرکت ہوئی۔ بریگیڈیئر نیازی نے ۳۹ بلوچ کو لیفٹیننٹ کرنل نعیم کی نگرانی میں کاشمیر میں رہنے دیا اور باقی فنی ۵ بلوچ اور ۲۳ پنجاب کی دو دو کمپنیاں اور ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کی ایک کمپنی کو دو مضبوط دستوں میں بانٹ کر مظفر گنج کی طرف روانہ کیا۔ ایک دستہ سیدھا مظفر گنج بھیجا گیا اور دوسرے کو جنوب مغرب سے ہو کر اس پر حملہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ ارادہ یہ تھا کہ سامنے سے جانے والا دشمن کو فائرنگ میں مصروف رکھے اور دوسرا دستہ پہلو سے اس پر حملہ کرے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں دستے مل جائیں گے تو دشمن کا خود بخود قلعہ قبضہ ہو جائے گا۔

پہلا دستہ مظفر گنج کے قریب پہنچا، تو سامنے سے دشمن نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے بھی جوابی فائر کیا گیا مگر منصوبے کا ایک حصہ تو باسانی پڑا ہو گیا، مگر دوسرے حصے کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ دوسرا دستہ جنوب مغربی سمت سے حملہ آور ہو۔ یہ دستہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ راستے میں ہی اس کا واسطہ مکتی باہنی سے پڑ گیا تھا۔ اس دستے کے پیچھے رہ جانے سے مظفر گنج میں دشمن سے ہینے کا منصوبہ ناکام ہو گیا؛ چنانچہ ۱۵ بلوچ کی فنی کو واپس بلایا گیا۔

دوسرے دستے کو ۲۳ پنجاب اور ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کے سپاہیوں پر مشتمل تھا، مظفر گنج کے مغرب میں بھی گنج کی طرف جانے کو کہا گیا۔ اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ اگر دشمن مظفر گنج میں اپنے پاؤں جا پکا ہے تو مزید آگے بڑھ کر اس سے ملا جائے تاکہ وہاں قدم چلانے سے پہلے اس سے پٹنہ جاسکے۔

یہ پیش قدمی کیتوں کے بیچوں بیچ پیدل ہو رہی تھی، کیونکہ چاندپور روڈ پر چڑھنے کا مطلب کھلے عام دشمن سے تصادم مول لینا تھا جو اس سپاہ کے مقامی کمانڈروں کے خیال میں موزوں نہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ طریقہ بہتر تھا کہ دشمن سے دور دور رہ کر اپنی منزل پر پہنچا جائے اور پھر وہاں نظم ہو کر اس پر دھاوا بولا جائے۔ وہ یہ بھول گئے کہ دشمن کی سڑک استعمال کر رہا ہے اور یہ کچھ کیتوں میں ہاؤس گیسٹ رہے ہیں تو اس کا فائدہ کس کو لیا وہ پہنچے گا۔ لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید اور لیفٹیننٹ کرنل زیدی بالترتیب ۲۳ پنجاب اور ۲۱ آزاد کشمیر کی فنی کی کمان کر رہے تھے۔

جب یہ لوگ ۶ دسمبر کی صبح کاشمیر سے مظفر گنج کے لیے روانہ ہوئے تھے تو ان کا خیال تھا کہ ایک آدھ دن کا کام ہے جسے پورا کر کے وہ واپس کاشمیر آجائیں گے۔ جاری ہتیار فالتو راشن اور کھانا پکھانے کے برتن ساتھ لے جانے کا کیا فائدہ؟ مگر اب انہیں جو سفر و پیش تھا اس کے تقاضے کچھ اور تھے۔ اب انہیں کھانا پکھانے کے علاوہ فالتو ایویشن وغیرہ بھی دیکر تھا تاکہ وہ راستے میں مکتی باہنی سے ہینے سے بچیں اور متواتر پیدل چل کر سپاہیوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ فالتو اشیاء تو درکنار ان کو اپنا ذاتی اسلحہ اور بھگے ہوئے بوٹ بھی ہماری لگ رہے تھے۔ کئی سپاہیوں نے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بوٹ اتار چھینے اور بعض نے فالتو گولیوں کے پٹے ضائع کر دیے۔ اسی طرح اس دستے کے ساتھ جو فالتو وائرس سیٹ تھے انہیں بھی غیر ضروری بوجھ سمجھ کر پھینک دیا گیا۔ اب لڑنا تو درکنار اس دستے کے لیے پیدل بھی گج پہنچنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید اور لیفٹیننٹ کرنل زیدی نے ۶ دسمبر کو کیتوں میں بیٹھ کر ایک غیر رسمی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی اپنی فنی کو دو الگ الگ دستوں میں تقسیم کر لیں تاکہ چھوٹے دستوں کی نقل و حرکت مکتی باہنی سے پوشیدہ رہ سکے، انہوں نے اگلی رات الگ الگ سفر کیا اور ۱۰ دسمبر کو مختلف مقامات پر دشمن کے سامنے ہتیار ڈال دیے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر یہ دوسرا واقعہ تھا کہ جنرل جیم کی زیرکمان پلٹوں نے ہتیار ڈالے تھے۔

میر جنرل جیم بڑے زیرک جی آدمی تھے۔ ان کی دیر اندیش نگاہوں نے بھی گنج کے واقعے سے پہلے ہی اندازہ لگایا تھا کہ جب ہم مظفر گنج سے دشمن کو نہیں ہٹا سکتے، تو چاندپور کی طرف اس کی پیش قدمی کیونکر روک سکیں گے؛ چنانچہ انہوں نے ۶ دسمبر کی رات ایئرٹن کمانڈ کو اطلاع دی کہ دشمن کے ہراول دستے کا ریلا چاندپور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ جب یہ اطلاع پہنچی تو ایئرٹن کمانڈ کے آپریشن روم میں تھا۔ رات خاصی بیت چکی تھی اور جنرل نیازی آپریشن روم سے ملحقہ تہ خانے میں آرام فرما رہے تھے۔ انہوں نے جب اپنے قابل اعتماد جرنیل کی پریشانی کی خبر سنی، تو وہ اپنی آرام گاہ سے نکل کر آپریشن روم تشریف لائے تاکہ جنگی نقشے پر ایک نظر ڈال کر فیصلہ لے سکیں۔ انہوں نے اس وقت سرخ رنگ کا ریٹی ڈرائنگ گاؤں پنا ہوا تھا اور ان کی آنکھوں میں نیند کے سرخ ڈسے نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیدھے نقشے کے پاس گئے۔ ہم سب اس پاس کھڑے تھے، مگر وہ کسی سے نہ بولے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک دو مینیئر ایئر جی آپریشن روم میں آ گئے۔ جنرل نیازی نے چاندپور پر ہشاد کی اگلی نصب کرتے ہوئے تاریخی فیصلہ صادر فرمایا کہ جیم سے کہہ دو کہ دھاکہ واپس آجائے۔ دیا نئے میگنا سے ٹیک لگا کر وہ چاندپور میں کیسے ٹھہر سکتا ہے۔ اپنے ہیڈ کوارٹر کی حفاظت کے لیے بھی تو اس کے پاس صرف ایک کمپنی ہے۔

جنرل جیم کے لیے پناہ کا راستہ دریا نئے میگنا تھا۔ ان کے پاس لڑاکا سپاہیوں کی کل فنی ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی جس میں فزیشنرز کی دو ہلاٹوں، ۲۳ پنجاب کی ایک ہلاٹوں اور کمانڈو ٹائین کے بچپن افراد تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس آرٹینٹس، بنگلو،



کومیلہ کا قلعہ ابھی باقی تھا۔ اس میں دو بریگیڈیں (عالمی اور اسلم نیازی) انفنٹری کی دو پلیٹیں اور دو ٹینک موجود تھے۔ ان کا دائرہ اثر صرف چھاؤنی کے علاقے تک محدود تھا۔ کومیلہ شہر پر بنگلہ دیش کا جیٹا لہرا رہا تھا۔ بلیک آؤٹ کی قدغن بھی چھاؤنی تک ہی تھی۔ شہر بجلی کے فکٹریں سے جگمگا رہا تھا۔

کومیلہ چھاؤنی کا دفاعی قلعہ ابھی ہمارے پاس ہی تھا کہ ۱۶ دسمبر کو ڈھاکہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔

پاکستانی وقار  
عظیم  
ڈاکٹر  
امام

صرف ۱۲۰ ملی میٹر مارٹر گولوں کی ایک بیڑی تھی۔  
 اس سیکٹر میں تین دیگوار واقعات پیش آئے۔ کمال ہسٹ کا دفاع، ۹۳ ریگیڈ کی سپلائی اور جنگیل کے قریب بھارتی جھاتے ہارڈ  
 کی آمد آئیے ان کا ذکر ذرا تفصیل سے کریں گے کیونکہ اس سیکٹر کی ساری جنگی کارروائی انہی تین واقعات پر مبنی ہے۔  
 اس سیکٹر میں دشمن نے زیادہ توجہ کمال پور / جمال پور کی طرف دی کیونکہ اس طرف کئی لشکر تھے جو جنگیل سے ہوتی ہوئی سیو جی  
 ۱



چلی جاتی تھی۔ اس کے برعکس بلراکھاٹ والا راستہ کچھ پکا اور کچھ پکا تھا پھر اس میں اتنے تل آتے تھے کہ دربارہ زمین سنگھ مسافت ذرا طویل ہو جاتی تھی۔ کمال پور والا راستہ کھولنے کے لیے دشمن کے لیے اس سرحدی چوکی کو ٹھکانے لگانا ضروری تھا جو کمال پور میں واقع تھی۔ اسے ٹھکانے لگانے کے لیے دشمن کو اڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا۔ آئیے دیکھیں کیسے؟

دشمن نے کمال پور کو ۱۲ جون کو جھجھوڑا جب کئی باہنی کی کارروائیاں نئے دلوں کے ساتھ شروع ہوئی تھیں اور بھارتی توپیں سرحدی علاقوں میں ان کی امداد کے لیے گولے برسانے لگی تھیں۔ چند گولے کمال پور پوسٹ کے ارد گرد گرے مگر کوئی جانی یا مالی نقصان نہ ہوا۔ ۱۳ جولائی کو اس نے پھر اس پھیر طانی کا اعادہ کیا اور گولہ باری کے ساتھ کئی باہنی کو حملہ کرنے بھیجا، مگر یہ حرکت اتنے نکل پڑی۔ کئی باہنی جن میں باغی ایٹ پاکستان رائل فوڈ اور ایٹ بنگال جنت کے سپاہی شامل تھے کئی لاشیں بھی چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اس حملے کے دوران پاکستان کے ہاتھ جو اسلحہ لگا اس میں ایک بھاری مشین گن، دو ہلکی مشین گنیں، چار ٹینک گنیں، تیس رائفلیں اور ایک راکٹ لانچر شامل تھا یہ تجربہ تخریب کاروں اور ان کے آقاؤں کو اتنا ہنگامہ پڑا کہ وہ دواڑھانی ماہ تک سر نہ اٹھا سکے۔

۱۲ اکتوبر کو اس پوسٹ پر ایک اور دھاوا ہوا لگایا۔ اب کئی باہنی کے ساتھ بھارت کی باقاعدہ فوج بھی حملے میں شریک تھی۔ یہ حملہ بھی ناکام رہا جس میں ایک افسر سمیت دشمن کے ۹ آدمیوں کو نقصان پہنچا۔

۱۴ نومبر کو دشمن نے ایک اور بھر پور کوشش کی جو کامیاب رہی۔ اس روز اس نے ۱۳ گارڈز ڈیٹالین اور کئی باہنی سے حملہ کیا۔ اس دفعہ اس نے سامنے سے سر کرنے کے بجائے پہلوؤں سے پیش قدمی کی۔ اس آٹان میں دشمن کا توپ خانہ کمال پور پوسٹ پر گولہ باری کرتا رہا یوں وہ اس سرحدی چوکی کے گرد گھیر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ کمال پور میں ہماری کل نفزی ستر باقاعدہ فوجیوں اور چند ریجنر اور رضا کاروں پر مشتمل تھی جن کی قیادت کیپٹن احسن ملک کے سپرد تھی۔ اس نفزی کے علاوہ احسن کے پاس ۸۰ ملی میٹر کی تین مارٹر توپیں بھی تھیں۔

جب دشمن نے اس چوکی کو چاروں طرف سے کاٹ دیا، تو بٹالین ہیڈ کوارٹر پر بخشی گئی سے ایک دستہ روانہ کیا گیا تاکہ وہ دشمن کے حصار کو توڑ کر چوکی کو آزاد کر سکے۔ اسل دستے کے ساتھ دو مارٹر توپیں بھی روانہ کی گئیں تاکہ وہ توپ خانے کا کام کر سکیں۔ یہ ملک اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی، مگر اسے قطعاً علم نہ تھا کہ دشمن کا گھیر لگنا وسیع ہے۔ یہ ابھی ترکوں پر سوار جارہے تھے کہ دشمن نے شرک کے دونوں طرف سے ان پر فائر کر دیا۔ فوجی جوان کو گود کر نیچے اترے اور جوابی فائر کرنے لگے، مگر دشمن کا پتہ بھاری رہا۔ ہمارے دس آدمی ہلاک اور سات زخمی ہوئے جن میں ایک افسر بھی تھا۔ ہماری چاروں گاڑیاں (جن پر یہ نفزی گئی تھی) دونوں مارٹر توپیں اور ایک ہلکی مشین گن دشمن کے ہاتھ لگی۔

سرحدی چوکی سے (بلطی) یہ کوشش بہت ہنگامی پڑی۔ اب ہمارے لیے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ کمال پور والوں سے کہتے کہ میاں جیسے بھی ہو، اجتماعی یا انفرادی طور پر وہاں سے نکل آؤ یا پھر انہیں وہیں رکھ کر پیچھے سے بھاری ملک روانہ کرتے تاکہ دشمن محاصرہ اٹھا کر پسپا ہونے پر مجبور ہو جائے۔ اول الذکر طریق کار سرکاری پالیسی کے خلاف تھا، اس کے علاوہ کمال پور پوسٹ خالی کرنے کا یہ بھی نقصان ہو سکتا تھا کہ ہمیں اس کی سیدھ میں باقی سرحدی چوکوں کو یعنی نقشی، اور باراموادی کو خالی کرنا پڑتا تھا جس سے مشرقی جانب ۳۳ پنجاب کا بائیں پہلو ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کمال پور پوسٹ خالی کرنے سے پورے بریگیڈ کی دفاعی لائن کو پیچھے لانا پڑتا تھا۔

اگرچہ دشمن نے وسط نومبر سے کمال پور پوسٹ کو بٹالین سے کاٹ دیا تھا، مگر وہ اس کو ٹرپ نہ کر سکا تھا یہ چوکی اب بھی اس کے گھلے میں ہڈی کی طرح اٹکی ہوئی تھی کیونکہ اس کے بجائے محافظوں نے تیار کر رکھا تھا کہ جب تک راشن اور ایندھن ساتھ دیتے ہیں یہ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ چنانچہ یہ اپنی جگہ ڈلے رہے کیپٹن احسن نے ۲۴ نومبر کو ایک چھوٹی سی گشت پارٹی پوسٹ سے باہر بھیجی تاکہ پتہ کرے دشمن کہاں کہاں اور کتنی تعداد میں ہے۔ یہ گشت پارٹی واپس نہ آئی۔ اس نے اس کی تلاش میں ایک اور پارٹی روانہ کی مگر وہ بھی غائب ہو گئی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ دشمن بھاری تعداد میں چوکی کے باہر بیٹھا ہے اور یہاں سے جو کوئی نکلتا ہے، اسے ہڑپ کر جاتا ہے۔ تیسری پارٹی بھیجنا سراسر حماقت تھی، لہذا کیپٹن احسن نے واپس برٹالین ہیڈ کوارٹر سے درخواست کی کہ وہ اپنے بہتر وسائل کو بروئے کار لائے ہوئے ان گشتہ پارٹیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر نے ایک فوجی دستہ فوراً اس کام کے لیے روانہ کیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک ٹرک فالتویج دیا تاکہ اگر وہ انہیں زخمی (بامردہ حالت) میں ملے تو اٹھا کر لے آئیں۔ دشمن جو ہر ملک پر نظر رکھتے ہوئے تھا، اس دستے پر بھی ٹرپ پڑا، ہمارے کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ فالتو گاڑی بھی چھین گئی، البتہ چند سپاہی واپس بٹالین ہیڈ کوارٹر (بخشی گنج) پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

اگلے تین روز برابر اسی قسم کی کوششیں ہوتی رہیں مگر کوئی کامیاب نہ ہوئی آخر کار ۲۴ نومبر کو بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر فیلڈ کرنل سلطان کو خیاں آیا کہ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ انہوں نے ایک فیصلہ کن جلسے میں حصار توڑ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے لیے انہوں نے اپنی ساری بلین توپیں دستوں میں بانٹا۔ ایک دستے کو حکم دیا کہ وہ سیدھا شرک پر چلتے ہوئے کمال پور کی طرف پیش قدمی کرے اور باقی دو دستوں کو تاکید کی کہ وہ شرک کے دونوں جانب پھیل کر سرحدی چوکی کی جانب روانہ ہوں۔ بیٹوں دستوں سے کہا گیا کہ ان کا کام دشمن کو بھگانا نہیں بلکہ گھیرے میں لے کر اسے نیست و نابود کرنا ہے۔

جوہنی یہ تینوں دستے کمال پور کی طرف بڑھنے لگے، بھارتی توپخانے کے دیدبان (OBSERVER) نے ان پر توپوں کے گولے برسانے شروع کیے۔ ہمارا ہر اول دستہ گولہ باری سے بچنے کے لیے زمین پر لیٹ گیا۔ اب ان پر چھوٹے ہتھیاروں سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ اوپر دشمن کے جیٹ طیارے منڈلانے لگے۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ اگر کچھ کسر باقی ہے تو پوری کر دیں۔ اس شدید مزاحمت کی وجہ سے رابطے کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔

۲۷ اور ۲۸ نومبر کی درمیانی رات کو دشمن نے کمال پور پوسٹ پر الیا زبردست حملہ کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کا منشاء ختم کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ حملہ نصف شب کو شروع ہوا۔ سب سے آگے اس کی ۱۳ گارڈز ڈیٹالین کی سی گپتی تھی۔ ہمارے جوان سینٹ کے مورچوں میں بیٹھے تھے اور ان کے عراقی سینٹ سے بھی زیادہ چپترے تھے۔ انہوں نے کمال حملے سے دشمن کو آگے بڑھنے دیا جب وہ ان کے ہتھیاروں کی ٹوٹ رز دیں، انہوں نے اپنے تمام ہتھیاروں سے اس پر فائر کھول دیا۔ دشمن اس اچانک بوجھاڑ کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اگلی صبح جب کیپٹن احسن کے جوان اپنی رات کی "کمانی" دیکھنے کے لیے نکلے تو انہیں دشمن کی ۱۲ لاشیں ملیں جن میں سے ایک توپخانے کے دیدبان کی تھی۔ ایک جوان ریگتا ہوا اس کی لاش تک گیا اور اس کے قبضے سے گولہ باری کا تمام پلان برآمد کر لایا۔

ماہ نومبر کے آخری دو ہفتوں کی مسلسل جنگ سے دو باتیں ثابت ہو گئیں۔ اول یہ کہ ہر چوکی تک کسی قسم کی کمک پہنچانی نہیں ناکام ہو گئے تھے۔ دوم یہ کہ دشمن بھی اس الگ تھلک چوکی کو ٹرپ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ ہمارے لیے باعث اطمینان

بات یہ تھی کہ شدید مشکلات کے باوجود مصحور جوانوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ مگر جنگ لڑنے کے لیے حوصلے کے علاوہ ایمونیشن اور راشن وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اس پوسٹ پر ختم ہوئے کو تھا، چنانچہ کیپٹن آسن نے مزاحمت کو طول دینے کے لیے راشن اور ایمونیشن کا "کوٹہ" مقرر کر دیا اس نے کہا کہ ہر جوان روزانہ ایک چپانی کم کھائے گا اور صرف اشد ضرورت کے تحت فائر کھولے گا۔ اپنے سیٹ پر پیچھے باندھنا آسان، مگر ایمونیشن پر کنٹرول کرنا مشکل تھا، کیونکہ جب بھی دشمن ٹلرتا کرتا، اسے سبق سکھانے کے لیے فائر کرنا پڑتا بعض سپاہی تو اتنے حساس ہو گئے تھے کہ رات کو اگر کوئی ٹھنڈی بھی گیدڑ لکھنا یا مینڈک ٹٹاتا، تو وہ رائفلی کی لمبی دبا دیتے۔

سب سے اہم حالات ان پانچ جوانوں کی تھی جو زخمی ہو کر چوکی میں پڑے تھے۔ انہیں پیچھے لائے کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہاں رکھ کر ان کا علاج معالجہ مشکل تھا چوکی میں صرف ایک نرسنگ اسٹنٹ تھا جو صرف مریض کی کر سکتا تھا اور بوقت ضرورت درد دور کرنے والی گولی دے سکتا تھا۔ دو اڈوں کے ساتھ ساتھ خوراک کی حالت بھی بتی تھی گوشت بھڑی کا تصور ختم ہو چکا تھا، صرف خشک راشن یعنی ڈال روٹی پر گزارہ تھا جو روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی شروع شروع میں زخمیوں کو کھنٹا بھر شربا لینے کے لیے فاختاٹیں اور جھگی گوتریاں مل جاتے تھے، اب دن رات کی تڑپ کے بعد وہ بھی کوچ کر چکے تھے۔

اس کے باوجود عزم و استقامت کی علامت کمال پور پوسٹ اپنی جگہ پر قائم تھی۔ ۲۹ نومبر کا ذکر ہے کہ ۳۱ بلوچ کے باہمت کمپنی کمانڈر میجر الوب نے فیصلہ کیا کہ خواہ اس کی جان چلی جائے وہ ضرور چوکی تک لے کر پہنچائیں گے۔ انہوں نے اپنے ساتھ چند جاناٹا اور رضا کار لیے۔ رضا کاروں نے اپنے سروں پر ایمونیشن کے ڈبے اور راشن کے تھیلے اٹھائے ہوئے تھے میجر الوب اور ان کے ساتھی مرکز سے دور ہٹ کر کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کبھی کوئی گڈنڈی سامنے آجاتی تو اس پر ہولیتے، مگر جب خیال آتا کہ بریگڈ ٹنڈی کہیں انہیں سیدھی دشمن کی پوزیشن میں نہ لیجائے اسے چھڑ دیتے۔ پلوں بچتے بچاتے وہ کمال پور پوسٹ کے قریب پہنچ گئے۔ اتنے میں دشمن نے فائر کرنا شروع کر دیا میجر الوب تو بہت کر کے آگے بڑھ گئے اور چوکی میں پہنچ گئے، مگر رضا کار وہیں سامان پھینک کر لیٹ گئے۔ اور جب فائر کم ہوا، تو رینگتے ہوئے واپس پھرتے گئے۔

میجر الوب کی آمد سے اگرچہ کمال پور والوں کو ایمونیشن کی کوئی اضافی گولی دستیاب نہ ہوئی، نہ ایک وقت کا آنا، مگر وہ عموماً تھے کہ کوئی ان کی خبر لینے کے لیے اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر آیا ہے میجر الوب نے ایمونیشن کی حالت پوچھی تو انہیں بتایا گیا کہ ہلکی مشین گن کی دو سو گولیاں، تین انچ دہانے والی مارٹر کے بارہ گولے اور دو انچ دہانے والی مارٹر کے دس گولے باقی ہیں۔ اس کے علاوہ اوسطاً ہر سپاہی کے پاس رائفلی کی ۵ گولیاں ہیں۔ میجر الوب نے واپس آکر یہ صورت حال اپنے کمانڈنگ آفیسر کے گوش گزار کر دی۔

میجر الوب کے بعد کوئی کمال پور پوسٹ نہ پہنچا خالی ہاتھ نہ راشن اور ایمونیشن سمیت۔ جب تک گولیاں ان کے پاس نہیں تھیں ہمارے جوان وہاں پڑے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے، جتنی کہ ۳۰ نومبر کو کھلی جنگ چھڑ گئی۔ اب دشمن نے پوری قوت سے اس روڑے کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ ۳۱ نومبر کی صبح کو چند سپاہی کا پٹر کمال پور پوسٹ کے اوپر چکر کاٹتے دکھائی دیے۔ ہمارے سپاہیوں کے چہرے تنمنا اٹھے کہ شاید دھاکہ سے انہیں لکانے کے لیے آئے ہیں۔ یہ درحقیقت دشمن کی چلیں تھیں جو اس تلاش

کر رہی تھیں۔ اُدھر یہ حالت تھی اور نیچے دشمن اپنا گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔ میجر الوب جو کمال پور پوسٹ کی حالت خود دیکھ کر آئے تھے کمال پور پہنچنے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے ۳۰ نومبر کو وہاں لے کر پہنچنے کی ایک اور کوشش کی مگر راستے میں ہی شہید ہو گئے۔ یہ پلٹن کے لیے بہت بڑا نقصان تھا جس کی اطلاع پاکر سرحدی پوسٹ اور پیچھے بالین ہڈی کو رات میں یاس کی لہر دوڑ گئی۔

اسی سہ پہر ۴ بجے کو ایک بنگالی سولین سفید رومال ہلاتا ہوا کمال پور پوسٹ پہنچا۔ اس نے کیپٹن آسن کو بھارتی کمانڈر کا یہ پیغام دیا کہ کیوں بیکار اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان گنولتے ہو۔ چھوڑو بہت ہو گئی اب بھارتی ڈال دو کیپٹن آسن نے تندو تیز جواب دے کر لے لیا۔ مگر بعد میں سوچنے لگا کہ اگر میں اپنے سپاہیوں کو جنگ جاری رکھنے کے لیے مزید ایمونیشن نہیں دیتا کر سکتا، تو کیا انہیں یوں موت کے منہ میں بھونکنا سزا زیادتی نہیں۔ اس نے اپنے تجربہ کار جے سی او اور چند دیگر حضرات سے مشورہ کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مزید مدافعت بیکار ہے۔

اسی رات کمال پور چوکی دم توڑ گئی! اس کے فوراً بعد دوسری سرحدی چوکیوں یعنی نقشی اور بیرہاری کو بھی خالی کرنا پڑا، کیونکہ تینوں چوکیاں سرحد کے ساتھ ساتھ ایک لائن میں تھیں اور اس طرح کی دفاعی ترتیب کا نقصان ہی ہوتا ہے کہ جب ایک کڑی ہٹائی جائے تو سارا سلسلہ پیچھے ہٹا پڑتا ہے، چنانچہ ۳۱ بلوچ نے دریائے برہم پتر کے شمال میں شیر پور کو اپنا نیا دفاعی مرکز بنایا اور اس کے مشرق و مغرب میں نئی چوکیاں جنید گئی، کیویر اور لیکن چار کے مقامات پر بنائیں۔ ۳۱ بلوچ کی نئی دفاعی لائن کے پیش نظر ۳۲ پنجاب کو سرحد سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس نے اپنا نیا دفاعی مرکز سرحد گھاٹ میں بنایا جو شیر پور کی سیدھ میں پڑتا تھا۔ گویا اس سیکٹر میں نیا دفاعی خط دیا گئے۔ برہم پتر کے شمال میں شیر پور اور سرحد کے درمیان سے گزرتا تھا۔

۵۔ دسمبر کی صبح کو دشمن نے شیر پور کے مغربی جانب دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ وہاں ہماری ایک چھوٹی سی پوسٹ تھی جو لیکن چار کے مقام پر واقع تھی۔ وہ بارڈر سے شیر پور کو آنے والی پٹی پر ٹک سے ہٹ کر تھی۔ اس کی طرف ایک کچا راستہ جاتا تھا خیال تھا کہ دشمن اس کچے راستے کے بجائے پٹی پر ٹک پر بڑھتا ہوا شیر پور سے ٹکڑے گا جہاں ہم دفاع کے لیے تیار بیٹھے ہوں گے لیکن اس نے پہلے کی طرح یہاں بھی ہماری توقع پوری کرنے سے انکار کر دیا اور کچے راستے سے ہوتا ہوا لیکن چار جا پہنچا۔ اس پوسٹ کے پانچارج جوان انسر نے شیر پور اطلاع دی کہ دشمن کا دباؤ بڑھ رہا ہے اور ہمارے پاس ایمونیشن کم ہے، لیکن ہم زیادہ دیر یہاں ٹھہر نہ سکیں۔ یہ خبر سننے ہی ۳۱ بلوچ کے سینڈ ان کمانڈ میجر فضل اکبر، ایمونیشن اور مزید نفری لے کر لیکن چار کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ شیر پور پہنچے ہی ۳۲ (۲) جنکشن ہی پہنچے تھے کہ آگے سے انہیں لیکن چار والی نفری واپس آتی ہوئی نظر آئی۔ انہوں نے اسے روکا اور وہیں نئی دفاعی لائن قائم کرنے کا حکم دیا۔ جب مورچے کھودنے کی باری آئی، تو بتایا کہ بیلچے اور کدالیں بھی نہیں ہیں قریب ترین دیہات کی طرف رجوع کیا گیا، تو وہاں سے محبت وطن بنگالیوں نے نہ صرف کدالیں وغیرہ دیاں لیں، بلکہ پاکستان کو بچانے کے لیے مورچے کھودنے میں بھی مدد دی۔

ادھر مہمان سنگھ میں بیٹھے بریگڈ پر قادر کڑھ رہے تھے کہ ۳۱ بلوچ نے کیا کیا۔ اس نے پہلے سرحدی چوکیاں چھوڑیں۔ پھر بخشی گنج سے اپنا بالین ہڈی کو رات لکھاڑا۔ اور پھر ایک ہی جہت میں شیر پور تک پہنچ گئی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ زیادہ

سے زیادہ وقت میں کم سے کم علاقہ دینے کی ضرورت خلاف درزی ہے۔ اس سے نہ صرف اس بلوچ کی دفاعی پوزیشن متاثر ہوئی تھی، بلکہ بارے بریگیڈ کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب انہوں نے جگہ چار سے پچاس کی خبر سن لی، تو اور جزیرہ ہوئے۔ انہوں نے لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ جگہ چار پر قبضہ کریں، مگر کرنل سلطان نے پیش قدمی کے بجائے ایک جست اور پیچھے لگائی اور دریائے برہم پتر پار کر کے جمال پور پہنچ گئے۔ کرنل صاحب کا خیال تھا کہ دیا کے شمال میں بیٹھے رہنے کے بجائے اس کے جنوبی کنارے سے دشمن کا بہتر طور پر مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کی اس حرکت سے ان کے دائیں جانب ۳۳ پنجاب کو بھی سرحد گھاٹ سے ہٹ کر مین سنگھ آنا پڑا۔ گویا ہرگز نہ ہماری دفاعی لائن سرحد سے ہٹتی تھی مین سنگھ اور جمال پور میں لگتی۔ ان دونوں شہروں میں جو دفاعی قلعے ”سجھے جاتے تھے، راشن اور ایمونیشن کے کافی ذخائر موجود تھے۔ دریا کے جنوبی کنارے پر بروقت آکر ٹیچہ جالنے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ دشمن جب بھی دریا پار کرنے کی کوشش کرے گا، اُسے مجھوں کر رکھ دیا جائے گا۔

دشمن نے پہلی بار ممبر کرفضائیہ اور توپ خانے کی مدد سے جمال پور پر گولے برسائے شروع کیے۔ پہلے دن ان کا زیادہ اثر نہ ہوا جمال پور کی گریڈنگ کے محافظ سمجھنے لگے کہ وہ کافی عرصے تک ”آہن“ کی طرح ”تھوڑوں“ کی ضربیں سہلے گئے۔ دفاعی نقطہ نظر سے یہ ایک اچھی حکمت عملی تھی، لیکن ہم نے اُپر دیکھا ہے کہ باقی سیکڑوں میں یہ کامیاب نہیں ہوئی۔ دیکھیں یہاں کیا بیعتی ہے؟

اگرچہ ہمارے دفاعی انتظامات جمال پور میں تھے، ہم نے سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی دریائے برہم پتر کے پار بٹھا رکھی تھی تاکہ وہ دشمن کی پیش قدمی کی اطلاع دے سکے جب دشمن کی فضا ئیہ اور توپخانہ جمال پور پر گولہ باری کر رہے تھے تو اُس کی بڑی فوج کے دستے دریائے برہم پتر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہمارے سپاہیوں کی یہ ٹوٹی بھی واپس آگئی اور جمال پور دشمن کا حملہ روکنے کے لیے تیار ہاں کرنے لگا۔ دوپہر دشمن کا کمانڈر دیا کے پار اپنے چند سینئر افسروں سمیت نظر آیا۔ غالباً یہ اُس کا ”اوگروپ“ (OG GROUP) تھا۔ ان افسروں کو گولی مارنے کو بہت جی چاہا، مگر وہ ہمارے چھوٹے ہتھیاروں کی مار سے باہر تھے، البتہ اس اوگروپ کا کمانڈر ایک بارودی ٹرنک (ٹان) پیچھے سے زخمی ہو گیا۔ وہ واپس چلا گیا اور اس کی جگہ ۱۰ کمیونیشن زون کا نیا کمانڈر میجر جنرل ناگرہ مقرر ہوا۔

اگلے تین روزہ جمال پور اور مین سنگھ میں بیٹھے ہوئی جہازوں اور توپوں کے گولے سستے اور دشمن کی پیش قدمی کا انتظار کرتے رہے، مگر اس کے کوئی آثار نظر نہ آئے کیا اُسے دریا پار کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی؟ کیا وہ پیش قدمی کا ارادہ ترک کر چکا تھا؟ کیا ہماری یہ دفاعی لائن ناقابلِ تسخیر تھی؟

اس عرصے میں بھارتی فوج کے بریگیڈیر کلیر (CLERE) نے لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو ایک خط بھیجا جس میں انہوں نے لکھا کہ جمال پور کے چاروں طرف گھیر لکھلکھا ہو چکا ہے، پاکستانی فوج کا بچ بچا ہوا مشکل ہے۔ اُپر سے ہماری فضا ئیہ کے کئی اہکواڈرن بمباری کرنے کو تیار کھڑے ہیں۔ بہتر ہوگا آپ انسانی جالوں کے بیجا ضیاع سے گریز کریں اور ہتھیار ڈال دیں۔ کرنل سلطان نے ایک جوابی خط

لکھ کر جواب دیا کہ صورت حال کے پیش نظر شرطین کا روبرو کرنا ہے اور وہیں موقع پر کمانڈر اپنے ساتھی افسروں کو بھی احکام دیتا ہے۔

لکھا کہ تم قلم کے دھڑی معلوم ہوتے ہو، بہتر ہوگا کہ تم قلم چھوڑ کر شین گن سنبھالو اور رٹ کر جمال پور فتح کرو۔ انہوں نے جواب روانہ کرتے وقت اس خط میں پسپوں کی ایک گولی بھی لپٹ کر بھیج دی۔ یہ اس پاکستانی کمانڈر کی سپاہیانہ آن کی علامت تھی۔ یہ پُر اعتماد جواب پاکر بھارتی کمانڈر خاموش ہو گیا اور جمال پور کا قلعہ ناقابلِ تسخیر نظر آنے لگا۔

اس آئنا میں دھاکا کے کمانڈروں کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے رکبوں؟ اس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا جنرل نیاز سی نے جنرل حبشہ کو حکم دیا کہ وہ بریگیڈیر قادر والا بریگیڈ مین سنگھ اور جمال پور سے واپس ہٹا کر ڈھاکہ کے شمال میں کلیا کیر (KALIKAIR) میں متعین کر دے۔ بریگیڈیر قادر کو سپاہی کا حکم دس دسمبر کو ملا۔ وہ اس آرڈر سے خوش نہ تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دفاعی قلعوں سے ہٹا کر کلیا کیر بھیجے میں کیا ناک ہے؟ انہوں نے جنرل حبشہ سے ٹیلی فون پر بات کرنے کی کئی بار کوشش کی، مگر ہر دفعہ ان سے کوئی اشارتِ افسیر نہ دیتا۔ جنرل حبشہ اس وقت جنرل نیاز سی کے ساتھ کالفرنس میں مصروف ہیں۔ جب بریگیڈیر قادر کی گفتگو ختم ہوتی، تو ایک اشارتِ افسیر تھوڑی دیر بعد ان سے فون پر کہتا کہ جنرل صاحب پوچھ رہے ہیں سپاہی کس وقت شروع ہوگی؟ بریگیڈیر قادر نے ناچار ۱۰ دسمبر کی شام اپنی دونوں پلیٹوں (۳۳ پنجاب اور ۳۳ بلوچ) کو حکم دے دیا کہ وہ اپنے دفاعی قلعوں سے نکل کر جمال پور کے جنوب میں مادھو پور کے چوک میں رات کو مل جائیں جہاں سے اگستے بکلیا کیر کی طرف جائیں گے۔

مین سنگھ کی نفی زیادہ تر رسول آرڈر فونرس، ولسٹ پاکستان ریختر ز اور رضا کاروں پر مشتمل تھی۔ ان کے ساتھ کچھ محبت وطن بنگالی بھی تھے۔ یہ سب لوگ ۱۰ دسمبر کو رات ۹ بجے کے قریب نکلے۔ ہر کوئی سب سے پہلے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے سامنے جو گاڑی آئی، وہ اس میں بیٹھ گیا بعض شہریوں نے سرکاری گاڑیوں کو اپنے صندوقوں، چارپائیوں اور بکریوں سے بھرجوایا۔ ادھر بنگالی ڈائیمور جو رٹریوٹ ٹرکوں پر چڑھی ڈیوٹی کے لیے رکھے گئے تھے، گاڑی چلانے سے کترانے لگے۔ وہ طرح طرح کے ہسلنے کرنے لگے کسی نے کہا میری گاڑی ہٹا رٹ نہیں ہوتی کسی نے کہا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ لوگ کسی محفوظ جگہ منتقل ہو جائیں۔ اگر کوئی محفوظ جگہ تھی تو!

۳۳ پنجاب راتوں رات پناہ گزین مردوں اور عورتوں سمیت مادھو پور پہنچ گئی۔ راستے میں اسے کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا، حالانکہ بہت افواہیں تھیں کہ مادھو پور کے جنگل میں کئی باہنی گاڑے ہیں اور وہ یہاں ہر طرح کی فوجی نقل و حرکت میں خلل ڈالے گی۔ دوسری جانب جب ۳۳ بلوچ اپنے دفاعی قلعے (جمال پور) سے نکلنے لگی، تو اسے احساس ہوا کہ واقعی اس کے ارد گرد دشمن کا محاصرہ مکمل ہو چکا ہے۔ اُس نے جمال پور سے مغرب میں کئی باہنی کی رہنمائی میں دریا عبور کر لیا تھا لیفٹیننٹ کرنل سلطان محاصرہ توڑ کر اپنی سپاہ کے اٹھلے کیے لیے ایک پلان، بنایا جس کے مطابق ساری فورس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصے میں طاقتور لڑاکا فوج رکھی گئی اور دوسرے میں زخمی اور نیم عسکری افراد پہلا حصہ جس میں ۳۱ بلوچ کی دو کمپنیاں شامل تھیں خود کرنل سلطان کے زیرِ کمان تھا جبکہ دوسرے حصے کی قیادت ان کے نائب میجر فضل اکبر کے سپرد تھی۔

کرنل سلطان جو زخمی اپنا فوجی دستے لے کر جمال پور سے باہر نکلے دشمن سے اُن کی مدد بھیج رہی تھی۔ دراصل رات کی تاریکی میں یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ جمال پور کے ارد گرد ہمارا فوجی دائرہ کمان ختم اور دشمن کا محاصرہ کمان شروع ہوتا ہے، لہذا اٹھلے میدان میں جو سپاہی دونوں سب سے گولیوں کی زد میں آ گئے، کم از کم تیس آدمی ہلاک اور پچیس زخمی ہوئے۔ دشمن کے نقصان کا اندازہ

نہ ہو سکا۔ ہماری کچی بچی نفری چھوٹی چھوٹی ٹولہوں میں بٹ کر اس نرسے سے نکل گئی۔ دوسرا گروہ جو حال پور میں بیٹھا اس بات کا منتظر تھا کہ حصار ٹوٹے، تو یہ بھی نکلیں وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بعد میں انہوں نے وہیں اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ ان میں سے خال خال آدمی اپنی بہت پر ڈھکا کی طرف نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

۳۱ بلوچ کے یوں بکھر جانے کا مطلب یہ تھا کہ بریگیڈیر قادر کے اس منصوبے پر عمل نہیں ہو سکتا تھا کہ دونوں پٹنیں مادھ پور جنکشن یا چوراہے پر اکٹھی ہوں اور پھر باقاعدہ مل کر کلیا کیر کی طرف روانہ ہوں۔ جب بریگیڈیر قادر نے دیکھا کہ ۳۱ بلوچ مذکورہ جگہ پر پہنچنے میں ناکام رہی ہے، تو انہوں نے اس چوراہے پر میجر سرور کی ایک کمپنی اور میجر ای۔ جی شاہ کی ہکی توپیں (مارٹر) ۳۱ بلوچ کی رہنمائی کے لیے چھوڑیں اور خود اپنے حفاظتی دستے سمیت تنگیل کی طرف روانہ ہو گئے۔

بریگیڈیر قادر اور ان کے ساتھی اردگرد کی صحیح موقع کو تنگیل پہنچ کر سستانے لگے۔ البتہ ان کے ساتھ لیفٹیننٹ کرنل اکبر، جو سول آرمڈ فورسز کے کمانڈر تھے، کلیا کیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ مشکل دو یا تین کلومیٹر ہی گئے ہوں گے کہ انہوں نے دیکھا راستے میں تازہ تازہ بارودی سرنگ (MINE) پھٹی ہے جس کا نقشہ انہوں نے میرے سامنے یوں کھینچا:

”سڑک کے ایک کنارے پر ایک گاڑی اونڈھی پڑی تھی ساتھ ہی ڈرائیور خون میں لت پت تڑپ رہا تھا، ڈرائیور کے لیفٹیننٹ کرنل سلطان ہاتھوں پر سر رکھے پریشان بیٹھے تھے۔ اتنے میں اتفاقاً ۳۱ بلوچ کا ایک بھٹکا ہوا سپاہی وہاں سے گزرا، اس نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو دیکھا، تو فوراً سیلوٹ کیا کرنل نے صحیح کر کہا: ”میرے جوان کہاں ہیں میری پلٹن کدھر ہے؟“ سپاہی شاید یہ سوال اپنے کمانڈنگ آفیسر سے کرنا چاہتا تھا، مگر خاموشی سے سیلوٹ کر کے آگے نکل گیا۔ میں سلطان کو واپس اپنے ساتھ تنگیل لے آیا۔“

اکبر اور سلطان نے بریگیڈیر قادر کو بارودی سرنگ کے حادثے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ دشمن نے راستے میں غالباً ایسی بہت سی سرنگیں بچھا رکھی ہیں؛ حالانکہ یہ تاریخ حقیقت حال کے عکس تھا، کیونکہ اسی سڑک سے ہمارے کئی جوان گزر رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد وہاں بھارتی سپاہی گاڑیاں چلا رہے تھے، بہر حال یہ خبر سن کر بریگیڈیر قادر سوچنے لگے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟

اب سہ پہر ہو چکی تھی سورج اپنا دن بھر کا ادھا سفر طے کر کے مغرب کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ بریگیڈیر قادر اور ان کے خدائشاں آفیسر سڑک کے ہاؤس کی سفید عمارت کے برآمدے میں کھڑے کسی روشن خیال کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں اچانک دشمن کے بارود بار پٹا بے آگئے۔ انہوں نے تنگیل کے شمال میں ’کالی ہٹی‘ کے قریب چھاتر بردار فوج اتارنا شروع کر دی۔ دوسری طرف نگاہ ڈالی جنوبی طرف تنگیل کے متروک فضائی مستقر کے پاس بھی چھاتر بردار فوج اتر رہی تھی۔ ان کے ساتھ ضروری جنگی سامان بھی پیراشوٹ کے ذریعے اتارا جا رہا تھا۔ ایک پیراشوٹ سے لٹکا ہوا سامان دیکھ کر ایک ہشام آفیسر چلایا: ”ارے! یہ تو تین اعشاریہ سات دہانے کی توپ لگتی ہے۔“

بریگیڈیر قادر نے جھٹ اپنی اٹلین گن نکال کر بھارتی جہازوں کی طرف گولیاں داغ دیں۔ یہ گولیاں اپنے ٹارگٹ تک تو کیا پہنچتیں بریگیڈیر صاحب کا غصہ نکالنے میں مفید ثابت ہوئیں۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے میجر سرور کو (جو مادھ پور سے تنگیل پہنچ چکے تھے) حکم دیا کہ جاؤ، جاکر دشمن کی اس چھاتر بردار فوج کا قلع قمع کر دو۔ میجر سرور فوراً حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہو گئے۔ آدھ گھنٹہ بعد وہ واپس آکر کہنے لگے: ”سر، مقامی لوگوں کا خیال ہے یہ چینی سپاہی ہیں جو ہماری امداد کو آئے ہیں، اگرچہ یہ خبر بہت ہی جذباتی



تدو جزر کے عین مطابق تھی، مگر اس میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہ تھا، کیونکہ اگر حسنی چھاتہ بردار فوج آج بھی جاتی تو اسے اترنے سے پہلے ہمارے کمانڈر سے پوچھنا پڑتا کہ اترنے کے لیے کونسی جگہ محفوظ ہے، کونسا علاقہ دشمن کے قبضے میں ہے اور کونسا ہمارے پاس ہے، ایسا کوئی رابطہ بریگیڈیر قادر سے قائم نہیں کیا گیا تھا، لہذا انہیں بھی اس کی تصدیق پر شبہ ہو اور انہوں نے ابتدائی جھلم کے بعد بخیدگی سے اگلے اقدام کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ وہ جانتے تھے کہ مناسب نفری کے بغیر تنگیل میں بیٹھ کر طنائشکل ہے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ان کا بریگیڈ اب بریگیڈ نہیں رہا، وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ چکا ہے، لہذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ چھاتہ بردار فوج سے اچھٹے کے بجائے کلیا کی طرف روانہ ہونا زیادہ مناسب ہے۔ ڈھاکہ والوں کا حکم بھی تو یہی تھا۔

بریگیڈیر قادر باقاعدہ فوج، سول آرڈ فورسز، ریجنل فوج اور پولیس کے چھ سو سپاہیوں اور کوئی درجن بھرا فزوں مشتمل نفری کے کڑا کم کے پونے چھ بجے تنگیل سے روانہ ہوئے، وہاں اب سرکٹ ہاؤس پر پاکستانی پرچم تھارہ گیا تھا۔ ہمارے انخلاء کے بعد جب کئی باہنی دلائے وہاں پہنچے، تو انہوں نے اسے آنا کر وہاں جنگل ویش کا پرچم بلند کر دیا۔

۹۳ بریگیڈ کے بعض اجزاء (مثلاً میجر ای۔ جی شاہ اور ان کی چھوٹی توپیں) ابھی مادھوپور کے پاس ہی تھیں، انہوں نے جب دیکھا کہ ۱۳ بلوچ کا سرعہ نہیں مل رہا، تو وہ بھی جنوب کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے راستے میں کالی ٹپی کے قریب چھاتہ بردار فوج اتر کر دیکھی تو ان میں سے بعض والیں مل گئے اور بعض سڑک چھوڑ کر بیٹھ گئیوں پر نکل گئے۔

جب بریگیڈیر قادر اور ان کے ساتھی اس مقام پہنچے جہاں لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو بارودی سرنگ پھٹنے کا حادثہ پیش آیا تھا تو اگاؤ کا فائر کرنے کی آوازیں آئیں۔ غالباً یہ کیتی باہنی کے ارکان تھے، مگر بریگیڈیر قادر انہیں دشمن کی بھاری جمعیت سمجھے۔ انہوں نے بارودی سرنگوں اور مسلح دشمن سے ٹکر لینے کے بجائے سڑک سے کنارہ کشی کر کے کھیتوں کی راہ لینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنی ساری نفری کو تین ٹولیوں میں بانٹ کر تین افسروں کے حوالے کر دیا کہ کو بھی تم جاؤ اور تمہارا کام، خود آٹھ افسروں اور اٹھارہ سپاہیوں کو لے کر کھیتوں میں چلے گئے۔

بریگیڈیر قادر اور ان کے ۱۶ ساتھی تین دن اور چار راتیں کھیتوں میں دھکے کھاتے رہے کبھی وہ کسی جھلم کی طرف جاسکتے اور کبھی دلدل میں جا پھٹتے، جہاں جو کھیں ان کی ٹانگوں سے چھٹ جاتیں یا جھنگلی گھاس کے ریشے ان کے پاؤں پکڑ لیتے جب یہ پانی اور دلدل سے بچ کر خشکی کی راہ لیتے، تو دیہات میں پھیلی ہوئی کیتی باہنی سے واسطہ پڑ جاتا۔ اس صبر آزما سفر میں ان کے پاس زاد راہ نہیں تھا کہ ان کا ساتھ دیتا۔ اگر کسی کی جیب میں چند روپے تھے بھی تو کوئی بنگالی انہیں قیمتا بھی خوراک مہیا کرنے کو تیار نہ تھا۔ انہیں اس آزمائش میں صرف ایک خدا ترس آدمی ملا جس نے انہیں اپنے گھر سے پانی پینے دیا، ورنہ وہ سب پر تپے کھا کر اور جو ٹرول سے گندہ پانی پی کر گزارا کرتے رہے سفر کے تیسرے دن وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں پڑے ہستار ہے تھے کہ ایک افسر درخت کی ایک تازہ ٹہنی توڑ کر لایا اور اسے بریگیڈیر قادر کے حضور پیش کرتے ہوئے کہنے لگا: "سرا اس کے پتے آہستہ آہستہ چائے، اس سے پیاس بجھتی ہے، میں نے ابھی آنا کر دیکھا ہے، لیجیے نا"

۳۱ دسمبر کو یہ لوگ تنگیل روڈ پر کلیا کی سرک کے شمال میں جاسکتے گزشتہ تین چار دنوں میں اس سڑک پر دشمن کی باقاعدہ آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ اس کی فوج دھڑا دھڑا ڈھاکہ کی طرف بڑھ رہی تھی، بریگیڈیر قادر اور ان کے ساتھیوں نے دشمن کی نقل و حرکت میں خلل ڈالنے کے بجائے سڑک سے ذرا پرے ایک جھنڈ میں پناہ لی اور ایک میجر کو روانہ کیا کہ جا کر دیکھو کہیں اپنے سپاہیوں کا بھی کوئی سراغ ہے کہ نہیں؟

وہ واپس آیا، تو اس کے ساتھ سکھوں کی ایک مسلح پارٹی تھی جس نے آکر ان تکے ہائے مسافت کے ماروں کو حراست میں لے لیا۔ ساری جنگ میں اس لحاظ سے یہ سب سے اہم واقعہ تھا کہ ایک بریگیڈ بریڈن کے ہاتھ آ گیا تھا۔

۹۳ بریگیڈ کے جو کچھ بے ہوشے اجزاء جنوب کی طرف آرہے تھے، انہیں کوئی خبر نہ تھی کہ کلیا کی کہاں واقع ہے، انہوں نے اس سے پہلے اس کی ریکی کرنا تو درکنار اس کا نام تک نہیں سنا تھا۔ وہ چلتے چلتے ۱۴ دسمبر کو ڈھاکہ پہنچ گئے، جہاں میں نے انہیں وارد ہوتے دیکھا۔ بُرا حال تھا بیچاروں کا! اجسامت بڑھی ہوئی، ہونٹوں پر پڑپال جھی ہوئی، وردی کچڑ اور خون کے دھبوں سے لٹی ہوئی، بعض سپاہیوں کے پاس ہتھیار نہ تھے اور بعض کے ہڈ غائب تھے۔ فاقہ زدہ چہرے، بیخواب آنکھیں! اس سے قبل کہ وہ ڈھاکہ کے دفاع میں کوئی کردار ادا کر سکتے، انہیں فوری آرام کی ضرورت تھی۔ آئیے اب دیکھیں کہ خود ڈھاکہ نے جنگ کے دن کس طرح گزارے۔

## باب ۲۲

# جنرل نیازی کی ہچکیاں

ڈھاکہ کی طبیعت پر سب سے زیادہ اثر دو چیزوں کا تھا۔ ایک یہ کہ مشرقی پاکستان کے مختلف سیکٹروں میں جنگ کے رنگ کیا ہیں اور دوسری یہ کہ مغربی پاکستان کے محاذ پر صورت حال کیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا لڑائی کے دوسرے دن جب یہ آرٹھی بھر ڈھاکہ پہنچی تھی کہ امر سرخ ہو چکا ہے اور فیروز پور چند گھنٹوں کی بات ہے تو جنرل نیازی اپنے زیر زمین کمرے میں بیٹھے چمک اُٹھے تھے اور خوشی میں ہولانوں کی طرح ڈنٹر پلینے لگے تھے، مگر، دسمبر تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مغربی پاکستان محاذ پر ہماری فوج سہدی چوکیوں نے گزر کر ٹک گئی ہے۔ مشرقی پاکستان میں، دسمبر تک کئی سیکٹروں میں ہمیں شکست ہو چکی تھی۔ ۹ ڈویژن کے علاقے میں دونوں فاقی قلعے۔ جیسور اور جندیہ۔ دشمن کے قبضے میں جا چکے تھے۔ ۱۶ ڈویژن میں جی اوسی کے بال بال بچ نکلنے کے بعد پتہ چلا تھا کہ ڈویژن کی اہم سپلائی لائن (c of) رنگ پور / بوگرہ روڈ کٹ چکی ہے۔ ۱۴ ڈویژن میں جنرل قاضی اور ان کے بریگیڈیئر سید اللہ سہدی علاقے خالی کر کے دریائے میگھنا کے کنارے پہنچ چکے تھے اور پتہ جنوب مشرق میں جنرل جیم کے ڈویژن (۳۹) بنگالی ڈویژن) کے ہیٹ میں فنی اور کو میلا کے درمیان پھر اگھو پنا جا چکا تھا۔

اسی شام (۷ دسمبر)، جنرل نیازی کو گورنر اے۔ ایم۔ مالک نے گورنر ہاؤس بلایا تاکہ وہ ان سے جنگ کی اصل صورت حال معلوم کر سکیں۔ اس ملاقات کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ گورنر کو متضاد خبریں مل رہی تھیں۔ ایک طرف ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے جنم لینے والی خبریں بتا رہی تھیں کہ ہر محاذ پر ہماری فوجیں بہادری سے لڑتے ہوئے دشمن کے دانت کھنکھ رہی ہیں، دوسری طرف مختلف ضلعوں اور سب ڈویژنوں (تھیلیوں) سے سول انتظامیہ کے افسر وادلا کر رہے تھے کہ بھارتی فوجیں بڑھ رہی ہیں، ہمارے دفاعی انتظامات سمار ہو رہے ہیں ذاتی املاک اور جانوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ یہ خبریں سن کر جنرل فرمان نے گورنر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ جنرل نیازی کو گورنر ہاؤس میں بلا کر صبح صورت حال معلوم کریں کیونکہ اگر وہ ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر گئے، تو وہاں جنرل نیازی اپنے اسٹاف آفیسروں کے سامنے حقیقت حال کا اعتراف کرنے سے ہچکچائیں گے۔

جنرل نیازی، دسمبر کی شام کو گورنر ہاؤس پہنچے، تو عجب تذبذب میں تھے۔ ایک طرف ان کا جرنیلی چہرہ تھا جس پر وہ بہادری کا نقاب اوڑھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف اہل جنگی صورت حال تھی جو ان کی نالائقی اور ناکامی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ کیا وہ ایک سولیلین گورنر کے سامنے جنگ کے چوتھے دن ہی اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیں یا حسب معمول مزید کچھ عرصے تک اپنا بھرم قائم رکھیں۔ یہ ملاقات گورنر ہاؤس کے ایک آراستہ اور پرسکون کمرے میں ہوئی۔ اس میں گورنر اور جنرل کے علاوہ دو اور سینئر افسر بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ شروع میں خاموشی طاری رہی۔ سب جنرل نیازی کا منہ دیکھتے رہے۔ پھر گورنر مالک نے آہستہ آہستہ گفتگو کا

آغاز کیا جس کا لقب باب یہ تھا کہ حالات کبھی ایک سے نہیں بہتے۔ زندگی دُھوپ چھاؤں ہے کبھی اچھے دن آجاتے ہیں اور کبھی بُرے جرنیلوں کو کبھی کئی ٹیپ و فزاکا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی فتح کی روشنی سے اُن کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے اور کبھی شکست کے سایے اُن کی شہرت کو کھلا دیتے ہیں۔ گورنر مالک نے ابھی آخری جملہ کہا ہی تھا کہ جرنل نیازی کا چوڑا چکا جھمکایا کپکانے لگا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا اور پتوں کی طرح سسکیاں بھرنے لگے۔ گورنر نے اپنا بزرگوار شہرہ ہاتھ بڑھا کر جرنل نیازی کے کندھے پر رکھا اور تسلی دیتے ہوئے کہا: جرنل صاحب گھبرائیے مت! ایک کمانڈر کی زندگی میں کبھی دن آہی جاتے ہیں! آپ بہت نہ ہاریں! اللہ عظیم ہے!

جس وقت جرنل نیازی ہلک رہے تھے گورنر ہاؤس کا ایک بنگالی بیرا چائے کا خوان اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے فوراً ایک افسر نے جھاڑ پلا کر واپس کر دیا۔ اس نے باہر آکر اپنے ساتھیوں کو بتایا: اندر صاحب لوگ رو رہے ہیں یہ بات گورنر کے بنگالی طہری سیکرٹری نے سنی تو اس نے ڈانٹ کر انہیں چُپ کر دیا۔

یوں گورنر مالک کو کئی صورت حال کا ایسا اندازہ ہوا جو مؤثر سے مؤثر الفاظ میں بھی پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے جرنل نیازی کی شکستوں کے بعد کما کر ہیرا خیال ہے مجھے اس خراب صورت حال سے مدد کو مطلع کر دینا چاہیے تاکہ وہ جنگ بندی کا اہتمام کر سکیں۔ جرنل نیازی کا سر ابھی تک چھاتی کی طرف دٹکا ہوا تھا۔ انہوں نے سر اُپر اٹھائے بغیر ہونے سے کہا: میں تسلی کروں گا۔ چنانچہ گورنر نے صورت حال پر مبنی ایک تار صدر بیجی خاں کو روانہ کر دیا۔

جرنل نیازی واپس اپنے ہیڈ کوارٹر میں آئے تو دروازے بند کر کے اپنے کمرے میں بیٹھ رہے۔ اگلی تین راتیں اور تین دن انہوں نے اسی ذہنی کیفیت میں گزائے۔ مجھے اس وقت اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ میں حسب معمول ۸ اور ۹ دسمبر کی رات کو ان کے کمرے میں گیا۔ انہوں نے کنسیاں اپنی میز پر گاڑ رکھی تھیں اور سرد وں ہاتھوں کے پیلے میں رکھا ہوا تھا۔ باہر سے آنے والے کو چہرہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا، اس لیے میں نہیں کہہ سکا کہ وہ اس وقت واقعی رو رہے تھے؛ البتہ ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اس محلے سے جوتا ہے جو انہوں نے اس موقع پر مجھ سے کہا۔ انہوں نے فرمایا: ساک! اُسکر کرو کہ تم آج جرنیل نہیں ہو۔ اس سے بیشک ان کے گھرے کرب کا احساس ہوتا تھا۔ وہ مجھے بے بس لگے۔ میں وہاں سے چلا آیا، لیکن ساری رات ان کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے، مجھے ان پر بہت ترس آیا۔

۹ دسمبر ۱۹۴۷ء دسمبر تک تین دن جرنل نیازی پر بھاری گزرنے۔ اس عرصے میں ان کے تقریباً بھی دو تین اپنی تالیفات اور نظمیں جگمگت کھو بیٹھے تھے۔ بہت سے علاقوں میں ان کی فوجیں ان دفاعی لائنوں سے بہت پیچھے ہٹ چکی تھیں جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ ان سے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں انگریزی میں LINE OF NO PENETRATION کہا جاتا تھا۔ مزید بالواسی کی وجہ یہ تھی کہ مغربی پاکستان کا عادی پر بھی پیش قدمی کے امکانات ختم ہو گئے تھے جہاں غیر معمولی فتوحات حاصل کرنے کی توقع تھی؛ کیونکہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہونا تھا۔

قدتی طور پر اس عرصے میں جرنل نیازی کی شوخی اور لطیف گوئی ہرن ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے بہت کم نکلتے اور عموماً تھیلے کو ترجیح دیتے، لیکن جب بھی نظر آتے نہجے نہجے سے لگتے۔ ان کی طبیعت میں شوخی کے بجائے چڑچڑاہٹ اُچھکا تھا۔ ان کی آنکھیں ان کی بے وفائی کی عکاسی کرتی تھیں۔ ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ ان کے چہرے کے سبھی خدوخال میں جھلک رہا تھا۔

اسی اثنا میں آل انڈیا ریڈیو اور دوسرے غیر ملکی نشری ادارے ہماری پساپی کی خبریں بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے تھے۔ اس پر مزید ایٹھ تھا کہ ہمارے بنگالی بھائی ریڈیو پاکستان کے بجائے ان غیر ملکی اداروں کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتے تھے۔ انہی دونوں بی بی سی نے اعلان کیا کہ جرنل نیازی اپنی فوج کو چھوڑ کر مغربی پاکستان جاگ گئے ہیں۔ اس نشریے سے جرنل نیازی بہت جربز ہوئے اور دسمبر کو اپنا ملک اُنٹر کانٹیننٹل میں جا چکے۔ پوئل کی لابی میں جو شخص بھی ان کے سامنے آیا انہوں نے جھٹکا کر کہا: بی بی سی والا کھر بنے ہیں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں ابھی تک مشرقی پاکستان میں موجود ہوں اور میں اپنے سپاہیوں کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاتا۔ وہ ہوا میں یہ اعلان کر کے ایٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر آ گئے۔

جرنل نیازی جہاں کی طور پر ڈھاکہ میں موجود تو تھے مگر ان کی موجودگی سے جنگی صورت حال پر کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑ رہا تھا اور نہ ڈھاکہ میں رہنے والوں (خاص کر غیر ملکی شہریوں) کو اعتماد تھا کہ جب تک جرنل نیازی موجود ہیں اُن کی جابیں محفوظ ہیں۔ پٹنا بیرون پٹناؤں اور بہاریوں کے لیے تو کوئی راہ فراموش نہیں وہ بے چارے تو اپنے اپنے گھروں میں دیکھے وقت آخر کا انتظار کرتے رہے لیکن غیر ملکیوں نے اس ڈوبتے جہاز سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں نکالنے کے لیے ۸ دسمبر کو اقوام متحدہ نے طیاروں کا بندوبست کیا، لیکن ڈھاکہ ایئرپورٹ کا رن وے ناقابل استعمال ہونے کی وجہ سے وہ نہ جاسکے۔ آئندہ چند روز میں وہ پرواز کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بے یقینی اور عدم تحفظ کا احساس صرف سویلین آبادی تک محدود نہ تھا، اس کا اثر دفاعی حلقوں میں بھی ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دو فوجی افسر جن کے کندھوں پر آدھ آدھ ہاؤسٹیل چمک رہا تھا، یکے بعد دیگرے میرے پاس آئے اور کہنے لگے: تمہیں جرنل نیازی کا قُرب حاصل ہے تم اسے کہوں نہیں کہتے کہ حقیقت پسندی سے کام لے، ورنہ ہم سب کتوں کی موت خراب جائیں گے۔ میں نے یہ کہہ کر ان سے معذرت کر لی کہ تپکاپ ریشیز آفیسر کا یہ کام نہیں کہ وہ جنگی معاملوں میں کمانڈر کے فیصلوں پر اثر ڈالنے کی کوشش کرے۔ میں نے جرنل نیازی سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی، البتہ ۹ اور ۱۰ دسمبر کی درمیانی رات کو جب جرنل فرمان علی محلے ٹران کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے باہر مل گئے تو میں نے تذکرۃ ان افسروں کے احساسات ان تک پہنچائے۔ انہوں نے جواباً کہا: ہاں گورنر بھی اس بارے میں غور مند ہیں، مگر جرنل نیازی کا اپنا زاویہ نگاہ ہے۔ بہر کیف ہم اس سلسلے میں کچھ کریں گے۔ اگلے دن گورنر نے صدر پاکستان کو ایک تار دیا جس میں صورت حال کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا: میں ایک مرتبہ پھر آپ پر زور دوں گا کہ آپ جنگ بندی اور سیاسی تصفیے پر زور کریں۔ جرنل بیجی خاں نے، دسمبر والے تار کی طرح اس تار کو بھی نظر انداز کر دیا۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کی جنگی صورت حال کے مالک و مختار جرنل نیازی تھے جو متواتر اپنی اور اپنی سپاہ کی اعلیٰ دفاعی صلاحیتوں کی رپورٹیں بھیج رہے تھے ڈاکٹر مالک گورنر سی جگمگ حالات کے بارے میں ان کی رائے کیا اہمیت رکھتی ہے؟

ایٹرن کمانڈ نے پہلی مرتبہ ۹ دسمبر کو صورت حال کی نزاکت کا اقرار کیا اور جی ایچ کیو کے نام ایک پیغام (گٹل) میں کہا: (۱) فضا میں دشمن کی برتری کے باعث کچھری ہوئی فوج کی صف بندی اور تنظیم ممکن نہیں۔ مقامی لوگوں کا رویہ انتہائی خصاصانہ ہے۔ وہ دشمن کو ہر ممکن مدد دے رہے ہیں۔ رات کے وقت کبھی باجی کی چھاپ مار کاروائیوں کی وجہ سے نقل و حرکت مشکل ہے۔ وہ بھاری فوج کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے ہمارے عقب میں لے آتے ہیں۔ ہوائی آؤہ زبردست نقصان کے باعث ناقابل استعمال ہو چکا ہے جس کی وجہ سے گزشتہ تین دنوں میں ہمارے جہاز پرواز نہیں کر سکے اور آئندہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

(۲) دشمن کی فضائی کارروائیوں سے ہمارے بحاری ہتھیاروں اور جنگی سامان کو سیدھا نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے جہاز تمامال بڑی جہاز سے لڑ رہے ہیں، مگر ان پر تھکان اور دباؤ کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ وہ گزشتہ ۲۰ دن سے سونہیں سکے، کیونکہ دشمنی کے جہاز تو بین الاقوامی مسلح گولہ باری کر رہے ہیں۔

(۳) صورت حال انتہائی نازک ہے، مگر ہم اپنی استطاعت کے مطابق لڑتے رہیں گے۔

(۴) آپ سے درخواست ہے کہ اس علاقے میں دشمن کے تمام ٹھکانوں پر فضائی حملوں کا اہتمام کریں اور اگر ممکن ہو تو ڈھاکہ کے دفاع کے لیے جہازوں کے ذریعے ملک دروازہ کریں۔

جنرل نیازی کے مذکورہ تار (مکمل) نے گورنر مالک کے اندیشے کی تصدیق کر دی۔ اب جنرل بچا کے لیے لازم ہو گیا کہ وہ صورت حال کو سنبھال دینے کے لیے فوری کارروائی کریں، لیکن انہوں نے صرف یہ کیا کہ موقع کی مناسبت سے ضروری اقدامات کرنے کا اختیار گورنر مالک کو سونپ دیا۔ یہ احکام انہوں نے ایک تار کے ذریعے گورنر مالک کو دیے اور اس کی نقل جنرل نیازی کو بھیج دی اس تاریخ کو کیا گیا،

از: صدر پاکستان

برائے: گورنر مشرقی پاکستان

اطلاع: کمانڈر ایئر ٹرن کمانڈ

آپ کا پیغام مل گیا اور اس کا مفہوم پوری طرح سمجھ لیا گیا ہے۔ آپ نے جو تجویز بھیجی ہے میری طرف سے آپ کو اس پر عمل کرنے کی پوری اجازت ہے۔ بین الاقوامی سطح پر جو اقدامات ممکن ہیں وہ میں کر رہا ہوں اور کتا رہوں گا، لیکن دونوں صوبوں کے درمیان رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے میں مشرقی پاکستان کے بارے میں فیصلہ آپ کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں، آپ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔ میں جنرل نیازی کو بھی ہدایت کر رہا ہوں کہ وہ آپ کے فیصلے کے مطابق کارروائی کریں۔ اس تار کے بعد ایک اور تار جنرل حمید کی طرف سے جنرل نیازی کے نام پہنچا۔ انہوں نے مذکورہ صدارتی تار کے بنیادی نکات پر اپنے کے بعد جنرل نیازی کو ہدایت کی کہ وہ جنگ سے متعلق صحیح صورت حال سے گورنر مالک کو باخبر رکھیں تاکہ وہ درست فیصلہ کر سکیں۔ اسی تار میں جنرل حمید نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ساز و سامان بروقت تلف کر دیں تاکہ دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ جنرل حمید کے تار کا متن یہ تھا:

از: چیف آف اسٹاف آرمی

برائے: کمانڈر ایئر ٹرن کمانڈ

بحوالہ: صدارتی تار بنام گورنر جس کی نقل آپ کو دی گئی ہے۔

صدر نے مشرقی پاکستان کے متعلق فیصلہ گورنر پر چھوڑ دیا ہے جو اس بارے میں آپ سے مشورہ کریں گے، کیونکہ کوئی بھی تار صحیح صورت حال کی پوری پوری عکاسی نہیں کر سکتا، اس لیے میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں آپ پر یہ بات چھوڑ دوں کہ آپ موقع پر موجود ہونے کی وجہ سے کوئی درست فیصلہ کریں، البتہ ایک بات واضح نظر آتی ہے کہ دشمن جس کو ساز و سامان کی برتری اور کئی باجی کی حمایت حاصل ہے، جلد ہی مکمل طور پر مشرقی پاکستان پر حاوی ہو جائے گا۔ درمیانی

عرسے میں بھی شہری آبادی اور فوج کا بحاری نقصان ہو رہا ہے۔ ان حالات میں آپ کو دیکھنا ہو گا کہ آپ کب تک جنگ جاری رکھ سکتے ہیں اور کس قیمت پر؟ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کر کے آپ گورنر کو اپنا عندیہ بتا دیں تاکہ وہ صدر کی طرف سے سوچنے گئے اختیار کے مطابق کوئی فیصلہ کر سکیں۔ اور اگر آپ انتہائی اقدام پر مجبور ہو جائیں تو زیادہ سے زیادہ جنگی ساز و سامان تلف کر دیں تاکہ دشمن کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ مجھے باخبر رکھیے گا۔ خدا حافظ!

اگرچہ فیصلہ گورنر پر چھوڑ دیا گیا تھا، مگر کشمکش کے کوئی آسان حل نظر نہیں آتا تھا جسے مثبت کر لیتے، کیونکہ اگر جنرل نیازی جنگ جاری رکھ سکتے، تو مذکورہ تاروں کے تبادلے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر وہ جی چھوڑ بیٹھے تھے تو گورنر ان کا حوصلہ نہیں بڑھا سکتے تھے، لہذا گورنر مالک نے ایک ایسا سیاسی تصفیہ تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے مطابق مشرقی پاکستان میں اقتدار اس کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر کے جاری اور پاکستانی فوجوں کے انخلا کا انتظام کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈھاکہ میں موجود اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکریٹری جنرل مسٹر پال مارک ہنری سے رابطہ قائم کیا اور جنرل فرمان علی اور چیف سیکریٹری مظفر حسن کی موجودگی میں ایک مراسلہ اس کے سپرد کر دیا، اس کی اطلاق صدر کیجی خاں کو بھی کر دی۔ صدر کیجی کے نام گورنر کے تاریخی تار کا متن یہ تھا:

از: گورنر

برائے: صدر پاکستان

چونکہ آخری فیصلے کی ذمہ داری آپ نے مجھ پر ڈال دی تھی، اس لیے میں آپ کی اجازت سے حسب ذیل دستاویز اسسٹنٹ سیکریٹری جنرل مشرقی پال مارک ہنری کے حوالے کر رہا ہوں (۱) پاکستانی افواج مشرقی پاکستان میں جنگ چھیڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن حالات ایسے ہو گئے کہ انہیں مجبوراً دفاعی اقدامات کرنے پڑے۔ حکومت پاکستان کا حقیقت شروع سے ہی مشرقی پاکستان کے مسئلے کو سیاسی طریقے سے حل کرنا چاہتی تھی جس کے لیے مذاکرات جاری تھے۔ (۲) مسلح افواج بیشک کٹمن حالات سے دوچار ہیں مگر وہ اب بھی پوری دلیری سے جنگ جاری رکھ سکتی ہیں مگر مزید خون خرابے اور بے جا جانی نقصان کو روکنے کے لیے میں مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتا ہوں تاکہ موجودہ کشمکش کو سیاسی طریقے سے ختم کیا جاسکے۔ (الف) میں صدر پاکستان کی طرف سے دیے گئے اختیار کے تحت مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کو ڈھاکہ میں پراسن مرتفع سے حکومت قائم کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ (ب) میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کی عزت نفس اس بات کا تقاضا کرے گی کہ بھارتی افواج بھی ان کی سرزمین سے مکمل جائیں (ج) لہذا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ پراسن انتقالی اقتدار کے لیے پانچ چیزوں کا اہتمام کریں (اول) فوری جنگ بندی (دوم) پاکستانی افواج کی آبرومندانہ منبرگی پاکستان کو واپسی (سوم) ان غیر جنگی کارپراسن انخلا جو مشرقی پاکستان مانا چاہتے ہیں (چہام) ان تمام لوگوں کا تحفظ جو ۱۹۴۷ء سے مشرقی پاکستان میں مقیم ہیں (پنجم) اس بات کی ضمانت کہ مشرقی پاکستان کے کسی فرد کے خلاف (فوج سے تعاون کے جرم میں) انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ یہ پیش کش کتنے وقت میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان تجاویز کا مقصد صرف پراسن طور پر اقتدار کی منتقلی ہے مسلح افواج کے ہتھیار ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مذکورہ تجاویز ناقابل قبول ہونے کی صورت میں جاری افواج آخری سپاہی تک لڑتی رہیں گی (مراسلہ ختم ہوا)۔ (۳) جنرل نیازی سے مشورہ کر لیا گیا ہے اور وہ آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہیں۔



مذکورہ بالا اسلحہ اقوام متحدہ کو پہنچنے ہی افشا ہو گیا۔ کئی غیر ملکی نشری اداروں نے اس کی موٹی موٹی باتیں نشر کر دیں۔ اقوام متحدہ میں اس وقت پاکستان کی نمائندگی نامزد نائب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے۔ انہوں نے بعض اطلاعات کے مطابق نیویارک سے راولپنڈی پیغام بھیجا کہ مذکورہ مسئلے سے ان کی پوزیشن کمزور ہو گئی ہے، درنہ وہ چین اور امریکہ کو مدد کرنے پر آمادہ کر رہے تھے، چنانچہ ۱۳ دسمبر کو راولپنڈی میں حکومت پاکستان کے ایک ترجمان نے ایک پریس کانفرنس میں جنگ بندی کی تجویز کی تردید کر دی۔ ترجمان نے زور دے کر کہا، میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی شخص ایسی کوئی دستاویز یا بیان مجھے دکھائے جس میں ہتھیار ڈالنے کا ہلکا سا اشارہ بھی کیا گیا ہو۔ اس تردید سے ڈھاکہ کو بھی مطلع کیا گیا، بلکہ بینہد کی گئی کہ آپ کو جو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اسے استعمال کرتے وقت متحدہ پاکستان کی سالمیت کا تو خیال رکھتے۔ آپ کو تجاویز دیتے ہوئے حدود سے آگے نکل گئے۔

عام طور پر اقوام متحدہ کو دیے گئے مذکورہ مسئلے کی فمرداری جنرل فرمان علی پڑالی جاتی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تاریخ رائیں گورنر مالک کا تھا اور ان تجاویز کا مقصد پاکستان کی سالمیت کو زک پہنچانا نہیں، صرف جنگ بندی کے سہانے وقت حاصل کرنا تھا تاکہ ہمارے کمانڈروں کو از سر نو نصف بندی کی مہلت مل جائے۔ اگر ہندوستان ہمارے اس اقدام کو جنگ بندی کی خلاف ورزی سمجھتا اور دوبارہ جنگ شروع کر دیتا، تو ہم اس وقفے میں اس کے لیے تیار ہو چکے ہوتے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جہاں تک اقتدار مشرقی پاکستان کے کمانڈوں کے حوالے کرنے کا تعلق ہے، ہمارے پیش نظر وہ نمائندے تھے جو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں منتخب ہوئے تھے اور وہ ابھی تک مشرقی پاکستان میں موجود تھے۔

ان تجاویز کی غرض وغایت سے قطع نظر یہ امر واقعہ ہے کہ حکومت پاکستان کے ترجمان کی طرف سے ان کی پُر زور تردید کے بعد جنگ بندی کا چرچا ختم ہو گیا۔ کم از کم فوجی طور پر غالباً یہی خیال اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ مزید مہلت ملنے سے بھٹو کوئی سفارتی معرکہ انجام دے لیں گے۔

مزید مہلت کا مطلب یہ تھا کہ کسی طرح جنرل نیازی بھی اڑے رہیں اور قبل از وقت ہمت نہ ہاریٹھیں؛ چنانچہ ان کے مورال کو سہارا دینے کے لیے راولپنڈی نے بے انوکھی ترکیب نکالی کہ ڈھاکہ کو غیر سرکاری طور پر یہ اطلاع دی کہ بین الاقوامی سطح پر وسیع پیمانے پر عملی امداد حاصل کی جا رہی ہے۔ ہمارے زور و دوست "شمال سے اور سفید دوست" جنوب سے مداخلت کرنے والے ہیں۔ زور و دوستوں سے مراد وہی تھے جن کی سرحد شمالی جانب قریب تھی اور سفید دوستوں سے اشارہ امریکہ کی طرف تھا جس کا بحری بیڑہ بحر ہند کے مشرقی کنارے پر تھا۔ اس خوشخبری "کو مشرقی پاکستان کے مختلف سیکٹروں میں پھیلا دیا گیا تاکہ ہمارے دو گنا گتے ہوئے سپاہی سنبھل جائیں۔ بریگیڈ ۱۲ کا رور کا ۹۳ بریگیڈ جب مین سنگھ سے سپاہیوں کو ڈھاکہ کی طرف آ رہا تھا، تو اسے بھی ٹیکل کے قریب بھارتی حمایت برداروں کو دیکھ کر یہی خیال ہوا تھا کہ شاید واقعی ہمارے دوست ہماری مدد کو پہنچ گئے ہیں۔ انہی دنوں میں نے ایسٹرن کمانڈ کے ٹیک ہیڈ کوارٹر کے باہر ایک سپاہی کو دو بیٹھ کے سستے سے ٹرانسٹر سے کان لگائے دیکھا، اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی اور ٹوپی پچی ہوئی تھی۔ میں نے یونسی اس سے پوچھا، یہی کیا خبریں ہیں؟

وہ یاس میں دوڑے لیجے میں بولا، "سُر پچنی یا امریکی امداد کی کوئی خبر نہیں۔"

راولپنڈی کی طرف سے دی گئی اس مغل تسلی کا وقتی طور پر اثر ہوا کہ کیا افسر اور کیا جوان سب کبھی آسان کی طرف دیکھتے اور کبھی ہند کی طرف نگاہ رکھتے کہ "دیکھتے کب مدد پہنچتی ہے، مگر کوئی تباہی نہ پہنچا۔ ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر بھی اس مدد کے لیے بے چین تھا۔ اس نے راولپنڈی کو کئی ٹیلیفون مکالمے کرنا شروع کر دیے، کبھی جواب ملا کہ جلد۔ جب مزید ۲۸ گھنٹے گزر گئے اور دوستوں کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو ایک باہر راولپنڈی فون کیا گیا کہ تباہی کدہ کب آئے ہے؟ جواب ملا، میں جلد ہی۔ اس پر پاس کمرے ایک افسر نے جل کر کہا، "ان سے پوچھو کہ ان کا جلد" کتنی جلدی آئے والا ہے؟

اس خوشخبری کی تصدیق کے لیے ڈھاکہ میں قیام چین اور امریکہ کے نمائندوں کو الگ الگ بلا کر پوچھا گیا کہ تم ہی بتاؤ کب مدد پہنچنے والی ہے۔ دونوں نے کسی ایسی کارروائی سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ جھنڈا کر ریگیڈ ۱۲ باقر مندرجی نے ایک باہر راولپنڈی فون کیا اور پوچھا، ہمیں صاف صاف بتا دو کہ کب تک دوستوں کا انتظار کرتے رہیں؟ جواب ملا، بس صرف ۳۶ گھنٹے اور۔ یعنی ۱۳ دسمبر کی شام تک۔ اس عرصے میں جنگ کی صورت حال اور خراب ہو گئی تھی۔ ۹ ڈویژن میں ۱۰ بریگیڈ کھانا کے قریب پہنچ چکا تھا اور ۵ بریگیڈ ہانگ برج کے ذریعے دریائے گنگا پار کر کے ۱۶ ڈویژن کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا جہاں بریگیڈ ۱۲ نصاری والا بریگیڈ ۱۲ پور اور بریگیڈ ۱۲ پور بریگیڈ ۱۲ پور رہ گیا تھا۔ دشمن رنگ پور بورگہ روڈ پر آتے ہوئے بورگہ کے شمال میں آچکا تھا۔ مشرقی سرحد پر ۱۴ ڈویژن دریائے میگھنا سبور کے کسے بہر آب بازار میں قلعہ بند ہو چکا تھا۔ پچھلے ۳۶ گھنٹے ڈویژن ۱۲ پور سے ڈھاکہ آتے ہوئے تپٹ ہو چکا تھا اور ۱۴ ڈویژن جلد کا ہنگامی ڈویژن (۳۶) جہاں پور اور زمین سنگھ سے واپس آتا ہوا تتر بتر ہو چکا تھا۔ جہاں جہاں دشمن ہماری دفاعی لائن میں شکاف کر چکا تھا وہاں سے اس کے فوجی دستے اندر داخل ہو رہے تھے۔

اگر دشمن کی آمد کے غمنا سے ہٹ کر اصلی جنگی حالت کا ہانہ لیا جائے، تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دشمن ابھی تک ڈھاکہ کے گرد تین بڑے دریاؤں (جنا، میگھنا اور برہم پتر) کو پار نہیں کر پایا تھا۔ صرف پہلی کپڑوں کے ذریعے اس کی ایک کمپنی بہر آب بازار کے جنوب میں (رانے پور اور رنگدی) اتری تھی اور ایک چھاتہ بردار پلٹن ہوائی جہازوں کی مدد سے ٹیکل کے پاس وارد ہوئی تھی۔ اس کی باقی ساری فوج، ٹینک اور توپیں ابھی پیچھے تھیں۔ جو لغوی دریاؤں کے اس پار اتر چکی تھی وہ ڈھاکہ کو فوج کرنے کے لیے سراسر ناکافی تھی۔ ڈھاکہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے دشمن کو ابھی اپنے ڈویژن اور بھارتی ہتھیار ڈینک اور توپیں وغیرہ) آگے لانا تھے اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ دریاؤں پر عارضی پل نہ باندھ لیتا۔ اور اگر آپ مشرقی پاکستان کے ان مہیب دریاؤں کا خیال کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان پر پل باندھنا آسان کام نہ تھا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ دشمن کو موجودہ گھاٹوں یا نئے پلوں کے ذریعے دریا پار کرنے میں کم از کم ایک ہفتہ ضرور ملے گا۔ اس کے بعد وہ صحیح معنوں میں ڈھاکہ پر دستک دیتا، پھر ڈھاکہ پر ہتھیار ڈھاکہ اس کی ریزہ کی ہڈی کتنی مضبوط ہے۔ جہاں تک راشن اور ایندھن کا تعلق ہے، اس کی کوئی کمی نہ تھی، کم از کم ایک ماہ تک لڑائی آسانی لڑی جا سکتی تھی۔ اس کے باوجود ایسٹرن کمانڈ کے افسانہ نگار جگمگے۔ اس کی لکچری کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے پاس ڈھاکہ کے دفاع کے لیے پٹی فوج اور گولہ آرمی کی ایک پلٹن بھی موجود نہ تھی۔ اس کام کے لیے جو ۵۳ بریگیڈ رکھا گیا تھا وہ وسط مغرب میں فوجی منتقل کر کے میجر جنرل حیم کے سپرد کیا جا چکا تھا۔ اب جنرل نیازی کو لالے پڑے تو ان کے چیف آف اسٹاف بریگیڈ ۱۲ باقر مندرجی نے مختلف سیکٹر کمانڈروں سے کہنا شروع کیا کہ وہ ڈھاکہ کے دفاع میں ہاتھ نہ لائیں۔ انہوں نے کوئٹہ میں بریگیڈ ۱۲ باقر مندرجی نے مشرقی جانب دریائے میگھنا کے مغربی کنارے پر آکر پوزیشن شمال لیں۔ عاقلانہ اپنے دفاعی قلعے میں پڑے رہنا زیادہ مفید سمجھا ہے انہوں نے بڑی ہمت سے

تیار کیا تھا۔ پھر ۴ ڈویژن کے جی اسی میجر جنرل قاضی) سے لگایا کہ وہ بہر ہب بازار کو چھوڑیں اور ڈھاکہ واپس آجائیں مگر انہوں نے "کشیوں کی کٹی" کے باعث تعمیل ارشاد سے معذرت کر لی۔ میجر جنرل نذر حسین شاہ سے درخواست کی گئی کہ ۹ ڈویژن کا ۵۷ بریگیڈ (بریگیڈر منظور) جو ان کے علاقے میں پہنچ چکا ہے اسے ڈھاکہ روانہ کر دیں۔ انہوں نے بریگیڈ کے بجائے اس کی ایک ٹینک روانہ کر دی، مگر وہ دیرینے جنرل پارہ نہر کی۔

بلے ہی کے اس عالم میں میجر جنرل حبیب الرحمن کو مجبور کیا گیا کہ وہ بریگیڈر قائد والے بریگیڈ (۹۳) کو زمین سنگھ اور جمال پور سے واپس بلا کر ڈھاکہ کے شمال میں کلایا کیر کے قریب لگا دیں تاکہ ڈھاکہ کا ایک پہلو محفوظ رہے۔ بریگیڈر قائد نے بھی ان احکامات کو منسوخ کرانے کے لیے کئی بار جنرل حبیب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ مجبوراً انہیں پسپا ہونا پڑا۔ اس پسپائی میں ہی اس بریگیڈ کا شیرازہ بچ گیا جس کا احوال پچھلے باب میں آچکا ہے۔

اگرچہ جنگ کے تیور روز بروز بدل رہے تھے اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی مگر جنرل نیازی اب بھی اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ واقعی شمال سے زرد دوست اور جنوب سے سفید دوست مدد کو پہنچنے والے ہیں۔ وہ اُمید کی اسی کوئیں ارد گرد کوئی ایم ایچ ڈھاکہ گئے جہاں ان کے سامنے نصف درجن زمیں پیش کی گئیں جو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے جنرل صاحب سے درخواست کی کہ زمین بانی کے دندوں سے بچانے کی تدبیر کی جائے کیونکہ گزشتہ رات اپریل میں جو عورتیں ان کے ہتھے چڑھ گئی تھیں ان سے عزیز تنگ سلوک کیا گیا تھا۔ جنرل نیازی نے انہیں تسلی دی، گھر و زمینیں ملک آنے والی بنے کل شام تک انتظار کرو۔ اگر حالات خراب ہو گئے اور صورت حال بے قابو ہونے لگی، تو ہم آپ کو کئی باجی کے ہاتھوں میں جانے سے پہلے خود ہلاک کر دیں گے۔ ہسپتال سے نکل کر وہ ہوائی اڈے پر تشریف لے گئے جہاں انہوں نے ہماری طیارہ شکن توپوں کی پوزیشنوں کا مطالعہ کیا اور جواز کو ہر وقت چکر مار رہنے کی ہدایت کی۔ وہ واپس چھاؤنی آنے لگے تو ہوائی اڈے کے باہر انہیں غیر ملکی مردوں اور عورتوں کا ایک غول نظر آیا۔ انہوں نے اسے اپنے فرار کی افواہوں کی تردید کرنے کا سنہری موقع سمجھا۔ وہ جھٹ جیپ سے اتر کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ اس غول میں بہت سے اخبار نویس بھی تھے جنہوں نے انہیں گھیر لیا اور طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ چند سوال و جواب یہ تھے:

سوال: جارت کا دعویٰ ہے کہ اس کی فوج ڈھاکہ کے دروازے پر پہنچ چکی ہے، آپ بتائے کہ وہ کتنی دور ہے؟

جواب: خود ہی جا کر دیکھ لو۔

سوال: آپ کے حرائم کیا ہیں؟

جواب: میں آخری سپاہی اور آخری گولی تک لڑوں گا۔

سوال: کیا بھارتی فوج کو ڈھاکہ سے دور رکھنے کے لیے آپ کے پاس کافی تعداد میں فوج موجود ہے؟

جواب: ڈھاکہ پہنچنے کے لیے میری لاشیں پر سے گزرتا ہوگا۔ انہیں پہلے یہاں سے (اپنی چھاتی ٹھونکنے ہوئے) اپنے ٹینک گزارنے ہوں گے۔

سوالات کی بوجھار جاری تھی اور جنرل نیازی جھلاہٹ میں کسی کا جواب دیتے اور کسی کو ٹال دیتے۔ پھر لگایا کہ وہ اس بوجھار سے نکل کر واپس اپنے زیر زمین ہیڈ کوارٹر میں آ گئے۔

۱۰ دسمبر سے ۱۳ دسمبر کا درمیانی عرصہ جنرل نیازی کے لیے پُر اُمید وقفے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس عرصے میں وہ مضطرب تو تھے مگر بالکل ہی شک نہ تھے (جو ۹ دسمبر تک حالت تھی)۔ اگرچہ اب بھی ان کی شگفتہ مزاجی مفقود تھی، مگر ان کی ہسکیاں اور آہ وزاری تھم چکی تھی۔ وہ اپنے اندرونی خلفشار کو اپنے سپرے پرنکس ہونے سے روکنے میں کافی حد تک کامیاب لگتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیرونی امداد کی غفلت تسلی نے انہیں عارضی طور پر سہارا دیا تھا۔

طبیعت کے اس اتار چڑھاؤ سے قطع نظر جنگ اپنے انداز پر حسب معمول جاری رہی۔ چڑتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر اب یوں معلوم ہوتا تھا کہ صرف ڈھاکہ کی جنگ باقی رہ گئی ہے جس کے لیے جنرل نیازی نے جنرل حبیب کو فوج داری سونپ دی۔ آپریشن روم کی مغربی دیوار پر جہاں جنگ کے آغاز میں مغربی پاکستان کا جنگی نقشہ لگا ہوا تھا وہاں اب ڈھاکہ شہر اور چھاؤنی کا نقشہ لگا دیا گیا۔ جنرل حبیب ڈھاکہ کے دفاع کے لیے اسی آپریشن روم میں کانفرنس منعقد کرنے لگے جہاں ۳۰ دسمبر کو جبر پور جنگ پھر نے پر جنرل نیازی نے ریشمی اسکاٹ پہن کر چیدہ چیدہ افسرں سے خطاب کیا تھا۔

میجر جنرل حبیب کے نائب بریگیڈر بیرتھ تھے۔ وہ ان فیصلوں کے مطابق نقشے پر ڈھاکہ کے ارد گرد گول گول دائرے لگاتے جاتے تھے جو مجوزہ دفاعی مورچوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ سرخ ٹیبل سے لگائے گئے یہ دائرے یوں لگتے تھے جیسے سانپ کڈلی لے لے بیٹھے ہیں اور جوئی انہیں کسی نے چھڑا دیا فوراً اسے دس لیں گے۔

اس کاغذی کارروائی کے مطابق ڈھاکہ کی دو دفاعی لائنیں تھیں۔ بیرونی دفاعی لائن شمال مغرب میں ماہک گنج، شمال میں کلایا کیر، شمال مشرق میں زراٹ گنج اور مشرق میں منشی گنج پر محیط تھی۔ توقع یہ تھی کہ زمین سنگھ سے ۹۳ بریگیڈ، بہر ہب بازار سے ۲۷ بریگیڈ، کوئلا سے ۱۱۷ بریگیڈ اور چاند پور سے ۳۹ بنگالی ڈویژن پسپا ہو کر ملے۔ تربت کلایا کیر، زنگی، داؤد کٹھی اور منشی گنج میں آجائیں گے۔

اندرونی دفاعی لائن میر پور کے پل، ٹونگی، ڈیمر اور زراٹ گنج کے ساتھ ساتھ قائم کی گئی تھی۔ خیال تھا کہ اگر دشمن بیرونی دفاعی لائن توڑ کر اندر آگیا، تو اس دفاعی لائن پر مغرب میں کرنل فضل حمید (کلایا کیر)، شمال میں بریگیڈر قاسم اور مشرق میں بریگیڈر منصور رائے روک لیں گے۔ خود ڈھاکہ شہر کی نگرانی بریگیڈر بیرتھ کے سپرد تھی۔

دفاعی لائنیں تو قائم کر دی گئیں، مگر ان کی حفاظت کے لیے سپاہی کہاں سے آئیں گے؟ جیسا کہ اوپر کیا گیا ہے ڈھاکہ کے دفاع کے لیے باقاعدہ ایک ملٹن بھی نہیں تھی، لہذا ایک کانفرنس بلائی گئی تاکہ تمام افسر اپنی عسکری اور نیم عسکری نفری کی نشاندہی کریں کہ وہ کتنی ہے اور اس کے پاس کیا کیا ہتھیار ہیں۔ اس کانفرنس میں باقاعدہ فوج کے زیادہ تر خدمت گزار عسکری آڈیٹس، سگنل، سپلائی انجینئرز اور ای ایم ای وغیرہ نے شرکت کی اور اس کی کل ۱۲ کمپنیوں کے برابر نفری (تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد) کی نشاندہی کی گئی۔ اس طرح رسول آرمڈ فورسز کے ۱۵۰۰ سپاہی پولیس کے ۱۸۰۰ سپاہی اور البند کے ۸۰۰ رضا کار دستیاب ہوئے۔ یوں کل نفری پانچ ساڑھے پانچ ہزار بن گئی۔

ان میں سے اکثر کے پاس تھری ناٹ تھری کی پرانی رائفلیں تھیں۔ ان کی دفاعی قوت میں اضافہ کرنے کے لیے ادھر ادھر سے مزید ہتھیاروں کا کھوج لگایا گیا جس کے نتیجے میں ۳۰ اینچ دھالے کی تین مارٹین پارٹینک شکن توپیں (آر۔ آر) اور چھ پونڈ وزنی گولہ پھینکنے والی دو توپیں اور چار ہائی ٹین گنیں مل گئیں۔ راج ۱۹۷۱ء میں استعمال ہونے والے ٹینک اس کے علاوہ تھے۔

اس نفری کو مذکورہ ہتھیاروں سمیت ڈھاکہ کے ارد گرد متعین کر دیا گیا۔ اس میں ابھی نفری اور جاری ہتھیار شمالی جانب رکھے گئے

# ..... اور ڈھاکہ ڈوب گیا

میر جنرل رحیم جو چاند پور سے آئے ہوئے ٹرائن گنج کے پاس زخمی ہو گئے تھے، سی ایم ایچ ڈھاکہ میں ابتدائی علاج کے بعد جنرل فرمان کے گھر آرام فرما رہے تھے۔ اس روز دسمبر کی ۱۲ تاریخ تھی۔ بھر پور جنگ شروع ہوئے نو دن ہو گئے تھے۔ جنرل فرمان اگرچہ جنرل رحیم کی خبر گیری کرنے ان کے کمرے میں گئے تھے، مگر حالات کے پیش نظر موضوع الاحوالہ جنگ کی طرف منتقل ہو گیا۔ جنرل رحیم نے حتی طور پر کہا کہ اب جنگ بندی کے بغیر چارہ نہیں۔ جنرل فرمان ان کے منہ سے یہ کلمات سن کر حیران ہوئے۔ کیونکہ جنرل رحیم ہمیشہ بھارت سے طویل جنگ کی بات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کو مزہ بھگا کر رہیں گے۔ جنرل فرمان نے کہا: بس ملے ملک گئے۔ اتنی جلدی! رحیم نے اپنی رائے پھر دہرائی اور کہا اس بارے میں بلاتاخیر قدم اٹھانا چاہیے۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ جنرل نیازی اور جنرل جمشید اس زخمی جنرل کی عیادت کے لیے تشریف لے آئے۔ جنرل رحیم نے جنرل نیازی سے بھی کہا کہ جنگ بندی کے لیے تاخیر ہو رہی ہے، مگر جنرل نیازی خاموش رہے (اُس وقت تک ابھی بیرونی اعداد کا شوشہ ختم نہیں ہوا تھا، جنرل فرمان انہیں وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد جنرل نیازی جنرل فرمان کے پاس آئے اور کہنے لگے: تو پھر راولپنڈی تاریخ دو نا! اس کا مطلب یہ تھا کہ جنرل نیازی نے حسب معمول جنرل رحیم کا مشورہ قبول کر لیا تھا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ جنگ بندی والی تجویز صدر پاکستان کو گورنر ہاؤس سے بھیجی جائے، جبکہ جنرل فرمان کا خیال تھا کہ اس موضوع پر سگنل ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے جانا چاہیے۔ جنرل نیازی نے امرار کہتے ہوئے کہا: راؤ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ سگنل یہاں سے جائے یا وہاں سے؟ میں دراصل ایک ضروری کام کے لیے کہیں جا رہا ہوں، سگنل تم یہیں سے بھجوا دینا! اس سے پیشتر کہ جنرل فرمان ہاں یا نہ کرتے چیف سیکریٹری مظفر حسن تشریف لے آئے۔ انہوں نے جنرل نیازی کا جملہ سنتے ہی کہا: آپ ٹھیک کہتے ہیں سگنل یہیں (گورنر ہاؤس) سے جاسکتا ہے۔ یوں یہ معاملہ فروغ گیا۔

جنرل فرمان جنگ بندی کی تجویز کی مخالفت نہیں کر رہے تھے۔ دراصل ان کا بنیادی اختلاف اس بات پر تھا کہ اس کا محرک کون بنے۔ وہ خود اس سلسلے میں پہل نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ ان کے پہلے سگنل پر راولپنڈی میں ناخوشگوار رد عمل ہوا تھا۔

جنرل نیازی ضروری کام کا بہانہ کر کے چلے گئے اور جنگ بندی سے متعلق تاریخی تارکا ڈرافٹ چیف سیکریٹری مظفر حسن نے تیار کیا۔ جنرل فرمان یہ مستودہ لے کر گورنر کے پاس گئے جنہوں نے اس کی منظوری دے دی۔ اسی شام (۱۲ دسمبر) یہ تاریخی خاں کو روانہ کر دیا گیا۔ اس تار میں انسانی جانوں کا بیجا ضیاع روکنے کے لیے ضروری اقدامات کرنے کی درخواست کی گئی۔

گورنر اور ان کے رفقا اس تار کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ اگلی رات اور اگلادون گزر گیا، لیکن راولپنڈی سے کوئی نامروپیام

کیونکہ پچا تر بار بجاری فوج کی خبر کے بعد یہی منظرہ تھا کہ سب سے پہلے یہی دستے ڈھاکہ پر حملہ آور ہوں گے۔ کاغذ پر یہ دفاعی انتظامات مقرر کئے تھے، مگر عمل زمین پر حالت بالکل مختلف تھی۔ سپاہیوں کے حوصلے پست تھے اور ہتیار زیادہ تر فزودہ اور بیکار۔ کسی کی نالی خراب تھی اور کسی کا نشانہ باندھنے والا حصہ غائب تھا، کہیں ہتھیار پہنچے تھے مگر ایمونیشن غائب تھا اور کہیں ایمونیشن تھا، لیکن ہتھیار نہ تھے۔ جنگی طور پر کھٹی کی گئی یہ نفی اور اس پر مبنی دفاعی انتظامات خاصے کمزور لگتے تھے۔ یوں ہم ہوتا تھا کہ بہت اہم سی مشورے گئے سے منہم ہو جائیں گے۔

میں نے اس حقیقت بندی کا اظہار کیا تو بریگیڈیئر قاسم جو چھاؤنی کی شمالی سرحد کے نگبان تھے، مجھے اپنے سیکٹر کے دفاعی انتظامات دیکھنے لے گئے۔ وہ جیپ چلا رہے تھے اور میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ راستے میں وہ ایک بلگر کے اور جیپ پر بیٹھے بیٹھے ٹی ہوئی سڑک کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے یہاں ہماری بارودی سرنگیں ہیں۔ تھوڑی دور آگے جا کر وہ ایک ٹینک کے کنارے کھڑے ہو گئے اور انکی کے اشارے سے فریٹ لگے کہ وہاں ہماری ٹینک شکن تو ہیں۔ اور ان سے اور آگے ہلے ٹینک ہیں۔ ایک بلگر جیپ سے اتر کر گن پوزیشن دیکھنے لگے تو وہاں ایک ٹینک شکن توپ دھری تھی، مگر اس کے قریب کوئی آدمی نہ تھا۔ آواز دینے پر ایک سپاہی نمودار ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس توپ کا ایمونیشن غلط آگیا تھا، پکٹان صاحب صحیح قسم کا ایمونیشن لینے ڈھاکہ گئے ہیں۔ یہ ۱۳ دسمبر کو توپ دوسرے کے آخر میں ہم ٹوکی سے ڈرا ادر کر میٹھلا ایر پورٹ کے قریب رکے جہاں بریگیڈیئر قاسم نے ایک میجر سے پوچھا: ”کون تم کیسے محسوس کرتے ہو؟“

”میں تو ٹینک محسوس کر رہا ہوں، مگر جوان سمجھتے ہیں کہ ایک مارٹر اور دو دشمن گنوں سے وہ دشمن کی میٹھا نہیں روک سکیں گے۔“  
”احتمالاً باتیں نہ کرو، انہیں حوصلہ دلاؤ۔ انہیں بتاؤ کہ جنگیں ہتھیاروں سے نہیں جیتی جاتیں۔“  
میجر خاموش رہا۔

ادھر ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر میں خیال آرائی ہونے لگی کہ ڈھاکہ شہر کے گلی کوچوں میں کس طرح لڑائی لڑی جائے۔ ایک صاحب نے کہا: ہمیں ڈھاکہ کو ہٹال گراؤ بنادینا چاہیے۔ دوسرے بولے: پاگل ہو گئے ہو، نشان لگاؤ اور ڈھاکہ کا کیا مقابلہ؟ یہاں مقامی آبادی ہمارے خلاف ہے۔ ایک طرف بھارت ہماری سرزنش کرے گا اور دوسری طرف کبھی باہمی ہمارا تعاقب کرے گی۔ ہم آوارہ کتوں کی طرح پھڑک پھڑک کر تباہ ہو جائیں گے۔  
گلی لگی لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

ڈاکا۔ شاید صدر پاکستان اپنی گونا گوں مصروفیات سے اس کاغذ کے پُرزے کے لیے وقت نہ نکال سکے، چنانچہ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو روز گورنمنٹ ہاؤس میں ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ سو اگیارہ بجے کے قریب اپنا ملک بھارت کے بمب ۲۱ میٹر سے گورنر ہاؤس پر نمودار ہوئے اور گولہ باری کر کے گڑ گڑ گئے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے مرکزی ایوان کی چھت اڑ گئی، بحری اور ایئر فورس کا بم پھینچے۔ آرمی ہال میں پڑا پناہ لینے والے ایک ڈیڑھ (CASE) چور چور ہو گیا اور اس میں تیرنے والی سرخ رنگ کی زیبائشی چھیلیاں گرم گرم طے پڑ پڑنے لگیں۔ گورنر مالک لپک کر پناہ گاہ کی طرف پلے گئے جہاں انہوں نے جلدی جلدی اپنا استسفی لکھا اور جیب میں ڈال دیا۔ گورنر ان کی کابینہ کے دروازے اور اعلیٰ سرکاری ملازمین (جو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے) پر ہل انڈیا ٹیلی ویژن منسلک ہو گئے جسے انٹر نیشنل ریڈیو اس نے "غیر جانبدار علاقہ" بنا رکھا تھا۔ ان پناہ گزینوں میں صوبے کے چیف سیکرٹری، انپکٹر جنرل پولیس، صوبائی سیکرٹری ڈھاکہ کے کسٹمز اور چند دوسرے افسر شامل تھے۔ غیر جانبدار علاقے میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے تفریری طور پر ریڈیو اس کو یقین دلایا کہ ہمارا مقارب ملکوں میں سے کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (اس کے بغیر وہ اس پناہ گاہ میں نہیں آسکتے تھے)۔

۱۴ دسمبر حکومت مشرقی پاکستان کا آخری دن تھا۔ اس روز گورنمنٹ ہاؤس کا لمبا کچرا بھرنا خود حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ بنگلہ دیش کی سپلائی ایک ایسے پتے کی ولادت تھی جسے مال کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا جو۔ بھارت یہ آپریشن کر رہا تھا۔ اب اس میں صرف یہ مرحلہ تھا کہ کب مر جائے جوئے جنرل نیازی اور کلائے جوئے پاکستانی دستوں سے ہتھیار ڈالائے جائیں۔ اور جنرل نیازی بھی اب غیر ملکی امداد سے نا اُمید ہو چکے تھے۔ انہوں نے اب حقائق کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے صدر مملکت کو۔ جو کمانڈر انچیف بھی تھے۔ پتلی پتلی رپورٹ بھیج کر دیات کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ۱۳ دسمبر اور ۱۴ دسمبر کی دینیات رات کو میرے سامنے جنرل حمید (چیف آف سٹاف آرمی) کو ٹیلیفون پر کما، تسر میں نے صدر کو کچھ تجاویز بھیجی ہیں مہربانی کر کے ان پر جلدی کارروائی کروادیں۔ انہوں نے کہا اچھا۔

اگلے دن جنرل یحییٰ خاں نے گورنر اور جنرل نیازی کو جنگ بندی اور لوگوں کے جانی تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کا حکم دیا۔ جنرل نیازی کے نام جنرل یحییٰ نے لکھا،

"گورنر کا پیغام مجھے مل گیا ہے۔ آپ نے نہایت کمشن حالات میں نہایت دلیرانہ جنگ لڑی ہے۔ قوم کو آپ پر فخر ہے۔ دنیا آپ کی تعریف کر رہی ہے۔ جہاں تک انسان کے بس میں ہے میں نے مسئلے کا قابل قبول حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اب آپ ایسے مرحلے میں ہیں جہاں مزید مزاحمت ممکن ہے اور نہ اس مزاحمت سے کوئی سودمند مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس سے مزید جان و مال کا نقصان ہوگا۔ آپ کو ان حالات میں متعلقہ افواج مغربی پاکستان کے رہنے والوں اور دوسرے وفادار لوگوں کی سلامتی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اس اثنا میں اقوام متحدہ سے درخواست کی ہے وہ ہندوستان سے مشرقی پاکستان میں جنگ بند کرنے کو کہے اور اس سے ہماری مسلح افواج کے علاوہ ان تمام لوگوں کے تحفظ کی ضمانت مانگے جو شہر پسندوں کی مسانداز سرگرمیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔"

مذکورہ بالا تار پاد لپٹی سے ۱۴ دسمبر کو ساٹھ تین بجے سپر ہیکلا اور مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق ساٹھ پانچ بجے شام ڈھاکہ پہنچا۔ صدر کے اس تار کا منشا کیا تھا؟ کیا یہ جنرل نیازی کے لیے ہتھیار ڈالنے کا حکم تھا یا اس تار کے باوجود وہ اگر چاہتے تو تفریق

جاری رکھ سکتے تھے؟ میں اپنی طرف سے اس کی تشریح کرنے کے بجائے قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں کہ وہ اس سے خود نتیجہ اخذ کریں۔ جنرل نیازی نے اسی شام جنگ بندی کے لیے اقدامات کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے پہلے روسی اور چینی سفارتی نمائندوں کے ذریعے بھارتی کمانڈر انچیف سے رابطہ قائم کرنے کا سوچا، مگر بالآخر ڈھاکہ میں قیام امریکی فوجی جنرل سٹریٹو (SPIVACK) سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے جنرل فرمان سے کہا کہ تم گورنمنٹ ہاؤس میں ہونے کی وجہ سے سفارتی نمائندوں سے ملتے جلتے ہو رہے ساتھ جولو۔ جنرل فرمان تھوڑی سی جھپکا ہٹ کے بعد ان کے ہمراہ ہو لیے۔ جب یہ دونوں اس کے پاس پہنچے تو جنرل فرمان انتظار گاہ میں بیٹھ گئے اور جنرل نیازی انڈر سٹریٹو کو رام کرنے لگے۔ جھٹ پٹ دوستی پیدا کرنے کے لیے جنرل نیازی جو ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے ان کی بازگشت باہر بھی نہانی دے رہی تھی۔ جب جنرل نیازی کو یقین ہو گیا کہ وہ امریکی فوجی جنرل سے دوستی یکتی کر چکے ہیں تو انہوں نے مطلب کی بات کہی جس کا جواب اس نے نہایت سرد کاروباری لہجے میں یہ دیا: میں آپ کی طرف سے جنگ بندی کے لیے بھارت سے مذاکرات نہیں کر سکتا۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کی طرف سے پیغام بھجوا سکتا ہوں۔

اب جنرل فرمان کو ٹپایا کہ وہ بھارتی فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل (بعد ازاں فیڈرل اسٹاف) مانک شا کے نام ایک پیغام لکھیں۔ ایک ایڈیٹری سیکرٹری کو لکھا کہ جنرل فرمان نے ایک صفحے کا نوٹ لکھوا دیا جس میں بعض تحقیقات کی شرط کے ساتھ جگہ جگہ کی پیش کش کی گئی تھی۔ شرائط تھیں (الف) مسلح افواج کا تحفظ (ب) ملکی باہمی کی انتظامی سرگرمیوں سے وفادار شہریوں کا تحفظ اور (ج) بیماروں اور زخمیوں کا تحفظ۔

مسودہ تیار ہو گیا، تو سٹریٹو کو یہ کہنا کہ یہ بیس منٹ میں پہنچ جائے گا۔ آپ جاسکتے ہیں۔ جنرل نیازی اپنے لمبے ڈی سی کیپٹن نیازی کو وہاں چھوڑ کر جنرل فرمان کے ساتھ واپس آ گئے۔ کیپٹن نیازی رات دس بجے تک وہاں بیٹھے رہے مگر کچھ نہ ہوا۔ انہوں نے پوچھنا چاہا، تو حکم ہوا کہ تم چلے جاؤ، رات کو سونے سے پہلے فون کر کے پوچھ لینا۔

درحقیقت سٹریٹو کو نے پیغام جنرل مانک شا کو بھیجنے کے بجائے اپنی حکومت کو ڈانگلٹن رواد کر دیا تھا جہاں امریکی حکومت کسی قسم کی کارروائی کرنے سے پہلے یحییٰ خاں سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ یحییٰ خاں اس رات اتنے مصروف تھے کہ امریکیوں کو ہاتھ نہ آ سکے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ۱۳ دسمبر ہی سے مشرقی پاکستان میں دلچسپی لینا بند کر دی تھی۔ انہوں نے دفتر آنا بھی ترک کر دیا تھا۔ جموں مان کا ملٹری سیکرٹری نقشے پر جنگ کی تازہ ترین صورت حال لگا کر ان کے پاس لے جاتا جس پر وہ کبھی کبھی نگاہ غلط انداز ڈال لیتے تھے۔ سنا ہے ایک دفعہ انہوں نے مشکل جنگی حالت دیکھ کر اٹھا کہا تھا: "میں مشرقی پاکستان کے لیے کبھی کیا سکتا ہوں؟" جنرل مانک شا کا جواب ۱۵ دسمبر کو ملا۔ انہوں نے جنگ بندی کی پیش کش قبول کر لی تھی اور مطلوبہ تحفظات کی بھی ضمانت دے دی تھی "سٹریٹو پاکستانی فوج ہتھیار ڈال دے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ریڈیائی لمروں کی نشاندہی بھی کر دی جن پر کلکتہ میں بھارتی ایئر فورس کمانڈر سید کوادر سے رابطہ قائم کیا جاسکتا تھا۔

مانک شا کا پیغام راولپنڈی پہنچ دیا گیا۔ وہاں سے شا حکم (۱۵ دسمبر) جواب آ گیا جس میں من جملہ دیگر باتوں کے یہ کہا گیا تھا، "میں مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان شرائط پر جنگ بندی قبول کر لیں کیونکہ یہ آپ کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں، البتہ یہ یاد رکھیں کہ اس بھڑکتے کی حیثیت دو مقامی کمانڈروں کے باہمی بندوبست کی سی ہوگی۔ اگر یہ بھڑکتا ان کوششوں سے متصادم ہو جائے تو اس سطح پر کر رہے ہیں تو اس کو کالعدم سمجھا جائے گا۔"

جنرل نیازی اور جنرل نامک شا کے درمیان یہ فیصلہ ہوا کہ جنگ بندی کی تفصیلات طے کرنے کے لیے عارضی طور پر ہارکوہر کے شام کو پانچ بجے سے لے کر اگلے روز ۹ بجے تک سیز فائر کیا جائے۔ بعد میں اس مدت کو ۱۶ دسمبر ۲ بجے سپریم کمانڈر بڑھا دیا گیا۔

جنرل حمید نے جنرل نیازی کو جنگ بندی کا مشورہ دیا تھا، موصوف نے اسے منظوری سمجھ لیا اور اپنے چھٹے کفٹ ٹائٹ بریگیڈ پر قبضہ لے کر مکمل فوج دیا کہ وہ تمام ماتحت جرنیلوں اور بریگیڈیروں کو جنگ بندی کی ہدایات دے دیں۔ تمام سیکڑ کمانڈروں کو ایک صفحے کا جو امر اسلحہ بھیجا اس میں ان کی شجاعت اور پامردی کی تعریف کرنے کے بعد کہا گیا کہ وہ لڑائی اب بند کر دیں اور اس سلسلے میں اپنے مد مقابل جہاد کی کمانڈر سے رابطہ قائم کریں۔ اس ہدایت نامے میں سرنڈر (SURRENDER) کا لفظ کہیں نہیں تھا صرف آخر میں ایک جملہ یہ تھا، بد قسمتی سے اس اہتمام میں ہتھیار ڈال دینا بھی شامل ہے۔

مذکورہ سگنل ۱۵ اور ۱۶ دسمبر کے درمیان نصف شب کے لگ بھگ جاری ہوا۔ اسے بھیجنے کے بعد آرمی ایوی ایشن کے کمانڈنگ آفیسر لیٹیننٹ کرنل لیاقت بخاری کو بلا کر مکمل دیا کہ وہ اپنے پہلی کاپٹر رات اکیلا (برہا) لے جانے کی تیاری کریں۔ ان پہلی کاپٹروں کو نصف درجن نرسوں (جو اوردسمبر کو جنرل نیازی سے سی ایم ایچ ڈھاکہ میں ملی تھیں) کے علاوہ ان ۲۸ فوجی کنبوں کو بھی لے جانا تھا جو اب تک ڈھاکہ میں پڑے تھے۔ کرنل بخاری نے یہ احکامات پڑے عقل سے سنے اور فوراً بجا آؤں گا وعدہ کیا۔ ان کے ہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ ان کو یوں نے آج بھی اتنا ہی حوصلہ مند پایا جتنا انہیں مارچ ۱۹۷۱ء کے جنگاؤں یا سیلاب کے دوران امدادی کاموں میں دیکھا تھا۔

یہ پہلی کاپٹر ایئرلن کمانڈ ہیڈ کوارٹر اور مختلف سیکڑوں کے درمیان دوران جنگ رابطے کا واحد ذریعہ تھے۔ انہوں نے نہایت نازک حالات میں مختلف علاقوں میں گولہ بارود، ہتھیار اور فوجی دستے پہنچائے تھے۔ ان کی دانشورانہ شجاعت رقم کرنے کے لیے ایک الگ دفتر چاہیے۔

دو پہلی کاپٹر بحری سے پہلے پہلے نکل گئے، مگر قیسر اس کی فنی خرابی کی وجہ سے اڑ نہ سکا۔ وہ اگلے روز دن چڑھے گیا۔ ان پہلی کاپٹروں میں فوجی کنبوں کے علاوہ جنرل رحیم بھی اہم سرکاری دستاویزات سمیت چلے گئے۔ مگر وہ بد قسمت نرسیں وہیں کی وہیں رہ گئیں۔ ان کو لانے کی ذمہ داری جن افسروں کو سونپی گئی تھی ان کا کہنا ہے کہ آخر وقت بھی وہ اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں نبھانے لگیں، کسی کو اپنا نیا جوتا نہیں مل رہا تھا اور کسی کو جراب ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ اس طرح کے "لاچ" میں انہیں دیر ہو گئی اور پہلی کاپٹر زیادہ دیر انتظار نہ کر سکے۔ اس کے برعکس یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ان افسروں کو خود جلدی تھی کہ وہ نرسوں کو لاتے لاتے پہلی کاپٹروں سے کہیں رہ نہ جائیں (وہ واقعی ان پہلی کاپٹروں میں برہا پہلے گئے)۔

جو لوگ ان پہلی کاپٹروں کے ذریعے ڈھاکہ سے نکل گئے، وہ برہا میں چند روز قیام کرنے کے بعد بخیر و عافیت کراچی پہنچ گئے۔ دوسرے ڈھاکہ میں تاریکی ساعت لمحہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ دشمن ٹیبل سے ہوتا ہوا فوجی کے قریب آ پہنچا جہاں ہمارے ٹیکوں نے اس پر فائر کر کے اسے روک دیا۔ اس فائر سے دشمن کو اندازہ ہو گیا کہ سیدھا ٹوٹی ڈھاکہ روڈ پر رکتے ہوئے چھاؤنی میں جا داخل ہونا مناسب نہیں۔ اس نے کئی بائیں کی مدد سے ایک اور راستہ تلاش کر لیا جو مغربی جانب ہوتا ہوا نامک گنج کے پاس سے ڈھاکہ شہر کو آتا تھا۔ اس طرف کمانڈر فیم والے کرنل فضل حمید اور ان کی نیم عسکری نفری لگی ہوئی تھی۔ جب انہیں پتہ چلا کہ دشمن کا رخ ان کی طرف ہے تو وہ ہل کر

واپس ڈھاکہ آ گئے۔ ان کے ہٹنے سے دشمن کا راستہ صاف ہو گیا اور وہ شہر کی طرف بڑھنے لگا۔

بریگیڈیئر بشیر کو جو ڈھاکہ شہر کے محافظ تھے اس کی اطلاع ۱۵ دسمبر کی شام کو ملی۔ انہوں نے سول آرڈر سڑکیں منقطع کر دیں اور فوجی جمع کرنے کے لیے جہازات کی سرکردگی میں شہر سے باہر میر پور پٹن پر پہنچ دی جو رات ہی کو اپنی پوزیشن پر پہنچ گئی۔ دشمن اب بھی کئی بائیں کی سائبر اطلاع پر تکیہ کیے بیٹھا تھا کہ میر پور پٹن خالی نہیں ہے، لہذا وہ بے دھڑک آگے بڑھ رہا تھا۔ اپنا کمانڈر میر سلامت کی نفری نے اس پر فائر کر دیا جس سے دشمن چند جہازیں قربان کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی دو جہازیں ہمارے ہاتھ آئیں۔

آگے آگے آتے ہوئے جو جہازیں دستہ چوٹ کھا رہا تھا وہ اس جہاز بردار پٹن کا حصہ تھا جو چند روز پہلے ٹیکل کے قریب تازی گئی تھی۔ اس کے پیچھے میر جنرل ناگرا رہا تھا جو اب بھارت کے COMMUNICATION ZONE کی کمان کر رہا تھا۔ وہ میر پور پٹن کے پاس آ کر رک گیا۔ وہاں سے اس نے لیٹیننٹ جنرل نیازی کو ایک مختصر خط لکھا جس میں درج تھا:

پیارے عبداللہ!

"میں میر پور پٹن پر ہوں اپنا نمونہ بھیج دو"

جنرل نیازی کو یہ رقمہ کوئی ۹ بجے صبح (۱۶ دسمبر) ملا جبکہ میر جنرل حبیبہ میر جنرل فرمان اور ریڈیٹرل شریف ان کے پاس تھے۔ جنرل فرمان اب بھی اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ ہم نے جنگ بندی کے مذاکرات کے لیے کلکتہ پیغام بھیجا ہوا ہے وہاں سے ان کا کوئی نمونہ آ کر ہم سے بات کرے گا۔ جنرل نیازی نے جب انہیں جنرل ناگرا کی چٹ دکھائی تو انہوں نے کہا: کیا وہ جہاز کی ایک ٹکڑی مذاکراتی نم ہے؟ جنرل نیازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ دراصل اب ان ٹوشنگافوں کا وقت نہیں تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ ڈھاکہ کی دہلیز پر آ بیٹھا ہے تو اسے خوش آمدید کہنا ہے یا مدافعت کرنا ہے؟ جواب کا اختصار اس بات پر تھا کہ مدافعت کی سکت باقی ہے بھی یا نہیں؟ چنانچہ جنرل فرمان نے پوچھا: کیا کچھ بزرگ فوج باقی ہے؟ جنرل نیازی خاموش رہے۔ ریڈیٹرل شریف نے اس انگریزی سوال کا پنجابی میں ترجمہ کرتے ہوئے کہا: کچھ پلے ہے؟ جنرل نیازی نے ڈھاکہ کے محافظ جنرل حبیبہ کی طرف دیکھا جنہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس پر جنرل فرمان اور ایڈمرل شریف یک زبان ہو کر بولے: اگر یہ کیفیت ہے تو جاؤ اور جو وہ کہتا ہے کرو۔

جنرل نیازی نے میر جنرل ناگرا کے استقبال کے لیے میر جنرل حبیبہ کو بھیج دیا۔ وہ سیدھے میر پور پٹن پر پہنچے۔ انہوں نے سب سے پہلے میر سلامت سے کہا کہ سیز فائر کے آداب کا خیال رکھو، لہذا میر سلامت اور ان کے سپاہیوں نے ہلپی سے اپنی انگلیاں ہٹا لیں اور میر جنرل ناگرا ایک گولی فائر کیے بغیر ڈھاکہ میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ منقطع بھارتی فوج اور ڈھیر ساری فائنڈر سخت تھی۔ عملیہ ڈھاکہ کا انتقام تھا۔ اگرچہ اسے دفن کرنے کی رسوم ابھی باقی تھیں۔ ڈھاکہ یوں چپ چاپ سو گیا جیسے اچانک حرکت قلب بند ہو گئی ہو۔ وہاں کوئی ہاؤس ہونے کوئی مارکائی نہ ہوئی۔ سنگاپور پیرس یا برلن کے سقوط کی کوئی کمانی نہ ڈھرائی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھاکہ غلامی میں ڈوب گیا۔

اسی شام میں ایئرلن کمانڈ کے ٹیک ہیڈ کوارٹر کو سمیٹ لیا گیا۔ دیواروں پر سے جنگی نقشے اتار لیے گئے۔ وہاں پڑے ہوئے ٹیلیفونوں کی ریح تھیں کرنل گئی۔ جہازیں فائنڈر کا استقبال کرنے کے لیے ایئرلن کمانڈ کے پڑنے ہیڈ کوارٹر کو جہازوں پر لگایا گیا، لیکن بریگیڈر باقر صدیقی کے بقول وہاں ہمارا فریئر غمزدہ تھا۔ طحہ آفیسر زمیں میں ممانوں کے لیے بچنے کا اہتمام کیا گیا۔ ان سب انتظامات کے

زور رواں بریگیڈز مندرقی تھے جو انتہائی امور میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

سپر کوریجڈ بریگیڈز باقر مندرقی اپنے بھارتی مقابل (یعنی بھارتی ایئرٹن کمانڈ کے چیف آف اسٹاف) میجر جنرل جیکب کو لینے ایئر پورٹ تشریف لے گئے۔ اس اثنا میں جنرل نیازی اپنے نھان "میجر جنرل ناگرا کی تواضع لطیفوں سے کرتے رہے۔ میں ان لطیفوں کو دہرا کر اس المناک کامیابی کو غلط نہیں کرنا چاہتا۔

میجر جنرل جیکب اپنے ساتھ ایک دستاویز لائے جسے سقوط کی دستاویز (INSTRUMENT OF SURRENDER) کہا جاتا ہے۔ جنرل نیازی اسے جنگ بندی کا مسودہ کھانا پند کرتے تھے۔

جیکب نے یہ کاغذات باقر مندرقی کو دیے جنوں نے جنرل فرمان کے سامنے رکھ دیے۔ جنرل فرمان نے کہا: یہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان کیا چیز ہے ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اس پر میجر جنرل جیکب نے کہا: یہ دستاویز ایسے ہی تیار شدہ دہلی سے آئی ہے۔ (یعنی مجھے اس میں ردوبدل کا اختیار نہیں) انڈین فوجی انٹیلی جنس کے کرنل کھرا پاس ہی کھڑے تھے انہوں نے فقرہ دیا: یہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ ہے۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے آپ صرف انڈین آرمی کے سامنے ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ جنرل فرمان نے یہ کاغذات جنرل نیازی کے سامنے سرکادیے اور کہا: یہ کمانڈر پر منحصر ہے کہ وہ اسے منظور یا نامظور کرے۔ جنرل نیازی خاموش رہے۔ اس خاموشی کو مکمل رضا سمجھا گیا۔

تھوڑی دیر بعد لیفٹیننٹ جنرل نیازی بھارتی ایئرٹن کمانڈ کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جگمیت سنگھ ارورہ کو لینے ڈھاکہ ایئر پورٹ گئے۔ بھارتی کمانڈر اپنی فوج کی خوشی میں اپنی شریعتی کبھی ساتھ لایا تھا۔ جوئی یہ میاں بیوی ہیلی کاپٹر سے اترے۔ بنگالی مردوں اور عورتوں نے اس منجبت دہندہ اور اس کی بیوی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو پھولوں کے ہار پہنائے، انہیں گلے لگایا، بوسے دیے اور تشکر جبرے جذبات سے انہیں خوش آمدید کہا۔ جنرل نیازی نے بڑھ کر فوجی انداز میں سیلوٹ کیا، پھر ہاتھ ملایا۔ یہ نہایت دلہندہ منظر تھا۔ فوج اور متوجہ بنگالیوں کی موجودگی میں ایک دوسرے کے آگے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے دلوں میں ایک کے لیے انتہائی نفرت اور انتقام کے جذبات تھے اور دوسرے کے لیے احسانندی اور تشکر کے۔ ان جذبات کو پڑنے کے لیے کسی چشم بینا کی ضرورت نہ تھی۔ بنگالیوں کا ایک الگ یہی عبادا دے رہا تھا۔

جنرل نیازی اور جنرل ارورہ وہاں سے سیدھے رنارہیں گراؤنڈ (جسے سرور دی گراؤنڈ بھی کہتے ہیں) گئے جہاں سرمام جنرل نیازی سے ہتھیار ڈولانے کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ۷ مارچ کو میس الزحمن نے بنگلہ دیش کا ایک طرف اعلان آزادی کرنا تھا مگر آخری وقت وہ ایسا نہ کر پائے تھے۔ آج یہاں دوسری طرح کا اعلان آزادی ہونے والا تھا جس کا نظارہ کرنے کے لیے لاکھوں بنگالی موجود تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جنرل نیازی کی تذلیم کا منظر دیکھنے کے لیے سارا شہر آؤد آیا ہے۔

جمع کو بھارتی سپاہیوں نے روک رکھا تھا۔ تقریب کے لیے تھوڑی سی جگہ خالی تھی جہاں ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھ کر لاکھوں بنگالیوں کے سامنے جنرل نیازی نے سقوط بھارتی پاکستان کی دستاویز پر دستخط کیے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا رول اور نکال کر ارورہ کو پیش کر دیا۔ ان یوں سقوط ڈھاکہ پر آخری مہر ثبت کر دی۔ اس موقع پر جنرل ارورہ نے پاکستانی سپاہیوں کی ایک گارڈ آف آؤر کا معاینہ کیا جو اس بات کی علامت تھا کہ اب وہی گارڈ "یہیں اور وہی آؤر" کے مستحق!

اس تقریب کے بعد ہم قانونی طور پر جنگی قیدی بن کر جنرل ارورہ کے زیر کمان آگئے، مگر ڈھاکہ میں ابھی بھارتی فوج اتنی ناکافی

تھی کہ قیدیوں کو کوئی باجی کی انتقامی کارروائیوں سے بچانہیں سکتی تھی، چنانچہ بھارت نے اجازت دے دی کہ پاکستانی قیدیوں کو کمانڈر نیازی اپنے چھوٹے ہتھیار ڈالنے تحفظ کے لیے اپنے پاس رکھیں۔ یہ ہتھیار ۱۹ دسمبر تک ہمارے پاس رہے۔ متعلقہ تعداد میں بھارتی سپاہیوں کے سپینے کے بعد ڈھاکہ گیریزن کے جوانوں سے ہتھیار لیے گئے۔ افسروں سے ہتھیار ڈولانے کے لیے ڈھاکہ چاؤنی کے گاہ کو رس میں ۱۹ دسمبر کو اسی صبح ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں جنرل فرمان ریڈیٹر مل شریف اور جنرل جشید سمیت سب افسروں نے ہتھیار ڈالے۔ میں بھی اس جمع نہامت میں شامل تھا۔

ڈھاکہ سے باہر باقی مقامات پر کمانڈروں نے اپنے ہتھیار ڈالنے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۹ سے ۲۰ دسمبر کے درمیان ہتھیار ڈالے۔

آل انڈیا ریڈیو نے ۱۴ دسمبر ہی سے ہماری شکست کی خبریں نشر کرنی شروع کر دی تھیں جس کی وجہ سے ڈھاکہ اور دوسرے مقامات پر بغیر بنگالیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر چھاؤنیوں کا رخ کر لیا تھا۔ انہوں نے اب بھی اپنے مقتدر کو پاکستانی فوج کے مقتدر سے وابستہ کرنے کو ترجیح دی۔ ان میں سے ہزار ہا لوگوں کو کوئی باجی نے راستے ہی میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں نے اس سلسلے میں کوئی باجی کے مظالم کے ایسے ایسے واقعات سنے ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعات اتنے کثیر اور گہرے ہیں کہ ان کا یہاں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

ہندوستانیوں کے پاس ان بے چاروں کی نگہداشت کے لیے کوئی وقت نہ تھا۔ ان کی نگاہ مال غنیمت پر تھی جسے وہ دھڑا کر ٹوکوں، بسوں اور ریل گاڑیوں کے ذریعے بھارت لے جا رہے تھے۔ اس میں ہمارا جنگی ساز و سامان، خوراک کے ذخائر، صنعتی مصنوعات، مشینری، جیٹ کھربہ استعمال کی چیزیں مثلاً فوج، قالین اور ٹیلی وژن سیٹ وغیرہ شامل تھے۔ نوموڑ بنگلہ دیش کا اتنا خون چوسا گیا کہ جب وہ آزادی کا سانس لینے کے قابل ہوا، تو وہ محض ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ اس کا احساس بنگالیوں کو ایک سال بعد ہوا۔

جب بھارت کو مال غنیمت سے فرصت ملی تو اس نے جنگی قیدیوں کو ہندوستان بھیجنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ دسمبر ۱۹۷۱ء سے جنوری ۱۹۷۲ء تک جاری رہا۔ جنگی قیدیوں میں اہم شخصیتیں (دی آئی پی) جنرل نیازی، جنرل فرمان، جنرل جشید، ریڈیٹر مل شریف اور ایئر کورڈر انعام الحق تھے جنہیں ایک بار بار دارطیاسے کے ذریعے ۲۰ دسمبر کو کلکتہ بھیج دیا گیا۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔

ڈھاکہ ایئر پورٹ کوئیں نے آخری بار ۲۰ دسمبر کو دیکھا۔ اب یہ اس ایئر پورٹ سے قطعاً مختلف تھی جس پر میں نے جنوری ۱۹۷۰ء کو پہلی بار قدم رکھا تھا۔ ایک واضح تبدیلی یہ تھی کہ اب یہاں خاکی وردی کے بجائے سبز وردی نظر آرہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان دوسالوں میں بنگالیوں نے صرف آقا بدلے ہیں۔ بنگالی مرد اور لڑکے اب بھی بھوانی آؤسے کی بیرونی دیوار پر بیٹھے تھے جنہیں بھارتی سپاہی کتوں کی طرح ڈھکھا رہے تھے۔ میں جب پہلی مرتبہ یہاں پہنچا تھا، تو سوج چمک رہا تھا۔ اب ایک ایسی رات پڑنے کو تھی جس کی عمر کم از کم مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈھاکہ ڈوب چکا ہے۔ آخری بار!

بھارتی طیارہ ہمیں کلکتہ لے آیا جہاں ہمیں ایک تاریخی عمارت فورٹ ولیم میں رکھا گیا۔ یہاں ہم انیسے تھے اور ایک دوسرے سے مل بیٹے تھے۔ فرصت کے ان ایام میں میں نے جنرل نیازی سے انٹرویو کیا تاکہ سقوط ڈھاکہ کے متعلق ان کے تاثرات حاصل کر سکوں۔ ان دنوں ابھی زخم تازہ تھے۔ محمود الزحمن کمیشن کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جنرل نیازی نے اپنا دفاع پیش کرنے کے لیے

# منظر: ریب واقعات

ضمیمہ : ۱

۱۲ اگست ۱۹۴۷ء

برصغیر ہندوستان تقسیم ہوا۔ دو خود مختار ریاستیں (ہندو) انڈیا اور (مسلم) پاکستان کے نام سے معرض وجود میں آئیں۔ نیا ملک پاکستان "مسلم اکثریت کے دو علاقوں پر مشتمل تھا۔ اس کا ایک حصہ ہندوستان کے شمال مغرب میں اور دوسرا شمال مشرق میں واقع تھا۔ شمال مغربی علاقے کو مشرقی بنگال کہتے تھے، جبکہ شمال مغربی حصے میں سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور صوبہ پنجاب کا کچھ حصہ شامل تھا۔ غیر تقسیم ہندوستان میں اپنی اکثریت کی وجہ سے ہندوستان سمجھتے تھے کہ برطانوی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد ہندوستان میں سیاسی اقتدار کے وہی حقدار ہیں۔ اس لیے پاکستان کا قیام انہیں ناپسند تھا۔ اس کے ایک ممتاز لیڈر گاندھی نے ہندوستان کی تقسیم کو "مقدس گائے کو دو ٹکڑے کرنے کا عمل" قرار دیا تھا اور ہندو مہاسا کا کہنا تھا کہ "ہندوستان ناقابل تقسیم ہے۔ اس کو جب تک دوبارہ اکٹھا نہیں کیا جائے گا، یہاں امن وامان قائم نہیں ہو سکتا۔"

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء

ہندوستان نے ریاست جموں و کشمیر پر جبری تسلط قائم کرنے کے لیے مسلم اکثریت کی اس ریاست پر فوج کشی کر دی۔ کشمیریوں نے قبائلیوں کی اعانت سے حملہ آوروں کی مزاحمت کی۔ پاکستان کی فوج بھی جو اس وقت ابھی تنظیم کے ابتدائی مراحل میں تھی، مئی ۱۹۴۸ء میں اس جنگ میں شامل ہو گئی۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو اقوام متحدہ (سکوریٹی کونسل) کی طرف سے جنگ بندی کا نفاذ اس شرط پر عمل میں آیا کہ کشمیر لوہ کی رائے معلوم کرنے کے لیے تصدو اب رائے کرایا جائے گا۔ یہ وعدہ بھی پورا نہ ہوا اور مسئلہ کشمیر آج تک ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کی راہ میں حائل چلا آ رہا ہے۔ مشرقی پاکستان جو کشمیر سے ۱۶۰۰ کلومیٹر دور واقع تھا، پاکستان کے مغربی بازو کی سی جذباتی شدت کے ساتھ مسئلہ کشمیر سے کبھی وابستہ نہ ہو سکا۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے جو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بھی تھے، مشرقی پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے ڈھاکہ میں اعلان کیا کہ پاکستان کی سرکاری زبان صرف اردو ہوگی۔ بنگالی نوجوانوں نے اس کو اپنی حق تلفی سمجھا اور اس بیان کے خلاف شدید احتجاج کیا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے بنگلہ زبان دب جائے گی جو ملک کی ۵۴ فیصد آبادی کی مادری زبان تھی۔ شیخ مجیب الرحمن جو اس وقت یونیورسٹی میں طالب علم تھے، مظاہرہ کرنے والے ان نوجوانوں میں شامل تھے۔ مجیب سمیت کئی طلباء کو گرفتار کر لیا گیا مگر آئندہ کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ زبان کی حمایت میں مظاہرہ کرنے والے طلبہ کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء

قائد اعظم کا انتقال ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے بنگالی وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ سربراہیت علی خان جو

ابھی تھانے کو توڑنا موڑنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ وہ مجھ سے آزادانہ گفتگو کرتے رہے۔ ان کے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو سائے ایسے سے بڑی الذمہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سقوط مشرقی پاکستان کا ذمہ دار جنرل یحییٰ خاں ہے۔ اس تاریخی انٹرویو کے موٹے موٹے سوال و جواب یہ تھے:

سوال : کیا آپ نے جنرل یحییٰ یا جنرل حمید کو کبھی صاف صاف بتایا تھا کہ آپ کو جو مسائل دیے گئے ہیں وہ مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے ناکافی ہیں؟

جواب : کیا وہ سولین ہیں؟ کیا انہیں نہیں معلوم کہ اندرونی اور بیرونی خطرات سے مشرقی پاکستان کو بچانے کے لیے تین انفنٹری ڈویژن ناکافی ہیں؟

سوال : مگر یہ الزام تو ہمیشہ آپ ہی پر رہے گا کہ آپ مشرقی پاکستان کا دفاع نہ کر سکے۔ اگر کم وسائل کے سبب آپ کے خیال میں دفاعی قلموں والی استریٹجی بہترین حکمت عملی تھی تو کیا وجہ ہے کہ آپ نے ڈھاکہ کو دفاعی قلعہ نہ بنایا جہاں فوج کی ایک کمپنی بھی نہ تھی؟

جواب : یہ سب راولپنڈی والوں کا قصور ہے۔ انہوں نے مجھے نومبر کے وسط میں آٹھ پٹین بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، مگر صرف پانچ بھیجیں۔ میں باقی تین کا انتظار کرتا رہا کہ وہ آئیں تو انہیں ڈھاکہ کے دفاع کے لیے استعمال کر دوں گا۔

سوال : لیکن ۳ دسمبر کو جب آپ پر واضح ہو گیا کہ اب مزید فوجی آئی نہیں ہے تو آپ نے کیوں زاپستے وسائل میں سے کچھ معیت ڈھاکہ کے لیے مخصوص کر لی؟

جواب : دراصل اس وقت حالات ایسے ہو گئے تھے کہ کسی عمارت سے ایک کمپنی بھی نکالنا مشکل تھا۔

سوال : جو تھوڑے بہت وسائل آپ کے پاس ڈھاکہ میں موجود تھے، اگر آپ ان کو بھی صحیح طور پر استعمال کرتے تو جنگ کچھ دن اور جارتی رہ سکتی تھی۔

جواب : مگر اس کا کیا فائدہ ہوتا؟ ڈھاکہ کی اینٹ سے اینٹ بچ جاتی، گلیوں میں لاشوں کے انبار لگ جاتے، نالیاں اُڑ جاتیں، شہری زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی۔ لاشوں کے گلے سڑنے سے طاعون اور دوسری بیماریاں پھوٹ پڑیں۔ اس کے باوجود انجام وہی ہوتا، میں تو بے ہزار ہواؤں اور لاکھوں تپوں کا نشانہ کرنے کے بجائے تو بے ہزار قیدی واپس لے جانا بہتر سمجھتا ہوں۔

سوال : اگرچہ انجام وہی ہوتا، مگر تاریخ غفلت ہوتی۔ اس سے پاکستان کی عسکری تاریخ میں ایک سناں بابل لکھا جاتا۔ آئندہ دشمن کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔

جنرل نیازی خاموش رہے!



قائد اعظم کے دست راست تھے اس سوگوار ملک کی وزارت عظمیٰ پر بدستور قائم رہے۔

**مارچ - اپریل ۱۹۴۹ء**

ممتاز بنگالی لیڈر مولانا عبدالحیہ خان بھاشانی نے نرائن گنج (ڈھاکہ) میں عوامی مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اس کے تین اسٹنٹ جنرل سیکریٹریوں میں سے ایک مجیب الرحمن تھے۔ اس جماعت کو پرجوش بنگالی نوجوانوں کے علاوہ ان پرانے سیاستدانوں کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی جن کو آزادی کے بعد اقتدار میں کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ ستمبر کے مہینے میں پیرائی شریف نے شمال مغربی سرحد کا صوبے میں بھی اس نام کی ایک اور جماعت قائم کر لی۔ فروری ۱۹۵۰ء میں دونوں عوامی لیگوں "کوہ علم کروا گیا" اور نئی متحدہ جماعت کی قیادت بنگالی لیڈر حسین شہید سہروردی کے سپرد ہوئی۔ نئی جماعت کو آل پاکستان عوامی مسلم لیگ کا نام دیا گیا۔

**۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء**

مسٹر یاقوت علی خان راولپنڈی میں ایک جلسہ عام میں خطاب کرتے ہوئے قتل کر دیے گئے خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل کا عمدہ چھوڑ کر وزیر اعظم بن گئے اور مسٹر غلام محمد جو پیشے کے لحاظ سے سرکاری ملازم تھے جو ٹوٹ کر کے گورنر جنرل کے منصب پر فائز ہو گئے۔

**۲۶ جنوری ۱۹۵۲ء**

آئین کے بنیادی رہنما اصول مرتب کرنے کی غرض سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے جو کمیٹی قائم کی تھی اس نے اپنی سفارشات کا اعلان کر دیا۔ ایک سفارش یہ تھی کہ اردو پاکستان کی واحد سرکاری زبان ہوگی۔ اس پر مشرقی پاکستان میں غم و غصہ کی ایک شدید لہر چل پڑی۔

**۳۰ جنوری ۱۹۵۲ء**

بنگالیوں نے مذکورہ سفارش کو اکثریتی صوبے پر لسانی اور ثقافتی یکساں کی تازہ ترین قراردادیتے ہوئے ڈھاکہ میں اجتماعی جلسے منعقد کیے۔ عوامی مسلم لیگ کے صوبائی صدر مولانا بھاشانی نے بھی ان جلسوں سے خطاب کیا۔ ۲۱ فروری کو جب صوبائی اسمبلی کا بجٹ اجلاس منعقد ہونا تھا، عام ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

**۲۱ فروری ۱۹۵۲ء**

وزیر اعلیٰ نورالامین نے اگرچہ جلسے جلسوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی، مگر ۲۱ فروری کو اجتماعی جلسے منعقد ہوئے، جلسوں نکالے گئے۔ پراور پولیس میں تصادم ہوا۔ تین طالب علم اور کئی اور لوگ ہلاک ہوئے۔ ان کی قربانی کی یادگار کے طور پر شہید مینار تعمیر کیے گئے۔ بعد میں یہ مینار بنگالیوں کی اجتماعی سرگرمیوں کی علامت بن گئے اور گورنر اور سفارتی نمائندے ہدیہ اراوت پیش کرنے کے لیے ان یادگاروں پر جاتے گئے۔

**۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء**

گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو پارلیمنٹ سے اعتماد و ریاعدم اعتماد کا ووٹ لیے بغیر موقوف کر دیا۔ اس سے بنگالی اور زیادہ ناراض ہو گئے۔ انہوں نے اس اقدام کو بنگالیوں کے خلاف ایک سازش سے تعبیر کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے مسٹر محمد علی بوگرہ کو جو اس وقت واشنگٹن میں پاکستان کے غیر متعین مبعوث طلبہ کے وزارت عظمیٰ کی گڈی پر بٹا دیا۔ مسٹر بوگرہ کو مشرقی پاکستان میں کوئی سیاسی اثر و رسوخ حاصل نہ تھا، لہذا وہ اپنے پنجابی سرپرست غلام محمد کے ہاتھ میں کھپتی بن کر رہ گئے۔

**اپریل ۱۹۵۳ء**

عوامی لیگ نے اپنی اصل لادینی خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لیے "مسلم" کا لفظ اپنے نام سے خارج کر دیا اور اپنا نام صرف عوامی لیگ رکھ لیا۔ اس سے پرانے مسلم لیگی سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے استغفہ دے دیا۔ ان کی جگہ سرمایہ دار ہندو عوامی لیگ میں داخل ہو کر اس کی حکمت عملی میں ذخیل ہو گئے۔

**ستمبر ۱۹۵۳ء**

شیر بنگال مولوی فضل حق نے جنہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان پیش کی تھی، ڈھاکہ میں اپنی عظیم جماعت قائم کر لی جو کرشنک سربراہک (مزدور کسان)، پارٹی کمانڈی، عوامی لیگ اور کرشنک سربراہک پارٹیوں کی تائیس اور ترقی جہاں حکمران جماعت مسلم لیگ سے بڑھتی ہوئی بیزاری کی علامت تھی وہاں صوبائی سیاست میں لادینی نظریے کے بڑھتے ہوئے رجحان کی نشاندہی بھی کرتی تھی۔

**۸ تا ۱۱ مارچ ۱۹۵۴ء**

مشرقی پاکستان میں مجلس قانون ساز کے انتخابات عمل میں آئے یہ آزادی طے کے بعد پہلے انتخابات تھے۔ عوامی لیگ کرشنک سربراہک اور مشرقی بنگال کی دوسری پارٹیوں نے مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لیے متحدہ حماز دھمکتو فرٹ، قائم کر لیا۔ "حماد" کے ۲۱ مقامی منشور میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ بنگلہ زبان کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے گا۔ ایک اور اہم نکتہ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ تھا۔ اس انتخابی معرکے میں حکمران مسلم لیگ صرف نوشتیں جیت سکی۔ وزیر اعلیٰ نورالامین "حماد" کے نامزد کردہ ایک طالب علم کے مقابلے میں ہار گئے۔

**۳۰ مارچ ۱۹۵۴ء**

"متحدہ حماد" کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی تین دن بعد نئی حکومت نے صحت اٹھا لیا۔ شیخ مجیب الرحمن اس کا بنیہ میں ایک وزیر بنے۔

**۳۰ مئی ۱۹۵۴ء**

گورنر جنرل نے "متحدہ حماد" کی حکومت کو برطرف کر دیا کیونکہ وزیر اعلیٰ فضل الحق نے چند روز قبل گلگت ایرپورٹ پر مبینہ طور پر ایک بیانیہ بیان دیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمن نظر بند کر لیے گئے صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ "متحدہ حماد" کا شیرازہ بکھر گیا۔ مرکز نے اپنی اغراض کے تحت "عوامی لیگ" اور "کرشنک سربراہک" پر الگ الگ ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔

**۲۲ اکتوبر ۱۹۵۴ء**

گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی ٹوڑی محمد علی بوگرہ نے پارلیمنٹ کے بغیر نئی حکومت قائم کی تو اس میں فوج کے کمانڈر بحیثیت جنرل محمد ایوب خان کو وزیر دفاع کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔

**۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء**

۴۰ ارکان مشتمل ایک نئی مجلس دستور ساز کی تشکیل عمل میں لائی گئی جس کے ارکان صوبوں کی مجالس قانون ساز سے لیے گئے عوامی لیگ اور کرشنک سربراہک نے اپنے اپنے نمائندے بھیجے اور یوں قومی سیاست میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا۔

**جون ۱۹۵۵ء**

مشرقی پاکستان سے گورنر راج ختم کر دیا گیا۔ کرشنک سربراہک پارٹی نے جواب مرکز میں مسلم لیگ سے تعاون کر رہی تھی ڈھاکہ میں حکومت قائم کر لی۔ عوامی لیگ حزب مخالف میں جا بیٹھی۔



۶ اگست ۱۹۵۵ء

مشرعہ محمد — وہ علیل سازشی — بالآخر پاکستان کی سیاست سے نکل گیا۔ سات ستمبر کو اسکندر مرزا نے گورنر جنرل کے منصب کا حلف اٹھایا۔ اسکندر مرزا ایک غیر سیاسی شخصیت تھے مگر نہایت پختہ فرائض ادا کرنے والے تھے۔ انہوں نے وزارت عظمیٰ کا قلمدان چودھری محمد علی کے سپرد کر دیا جن کو مسلم لیگ نے نامزد کیا تھا، حالانکہ عوامی لیگ کے قائد کی حیثیت سے مشرانہ مجلس سرور دی جھٹے تھے کہ وزارت سازی کا حق انہیں پہنچتا ہے۔ بنگالیوں نے اس دلائل کو بھی بنگالیوں کے سیاسی اقتدار سے محروم رکھنے کا ایک اقدام سمجھا۔

۶ ستمبر ۱۹۵۵ء

عوامی لیگ کے مشرعیات ارحمن نے مشرقی بنگال کی مجلس قانون ساز میں کہا: — ”مسلم لیگ کا حکمران ٹولہ مشرقی بنگال اس کی ثقافت اس کی زبان اس کے لٹریچر غرضیکہ اس کی ہر چیز کی طرف امانت اور تحقیر کا رویہ رکھتا ہے۔ جناب والا! میں عرض کر رہا ہوں کہ ہمیں برابر کا شریک گردانا تو درکنار مسلم لیگ کے لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے ہم محکوم قوم سے اور وہ فاتح اور حکمران قوم سے تعلق رکھتے ہیں“

۱۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء

مغربی بازو میں واقع تمام مقبوضوں یعنی پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ بلوچستان اور سندھ کو مدغم کر کے ”ون یونٹ“ بنا دیا گیا اور اسے مغربی پاکستان کا نام دیا گیا۔ ون یونٹ بل جو دو ہفتے پہلے منظور کیا گیا اس بات کی ضمانت دیتا تھا کہ ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان برابری کی سطح پر باہمی تعلقات استوار کیے جائیں گے مگر بنگالیوں نے یہ سمجھا کہ یہ بنگالیوں کو جو ایک اکثریتی صوبے سے تعلق رکھتے ہیں اپنے جائز حقوق سے محروم رکھنے کی ایک اور چال ہے۔

۲۹ فروری ۱۹۵۶ء

چودھری محمد علی کی ان تھک کوششوں سے دستور ساز اسمبلی نے ملک کا پہلا آئین منظور کر لیا اور تین ہفتے بعد یعنی ۲۳ مارچ کو اسے نافذ کر دیا گیا۔ اس آئین میں بریٹری (PARITY) کے اصول پر پارلیمنٹ میں دونوں صوبوں کو برابر برابری کا حق دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان اب ایک ”جمہوریہ“ بنا اور اس کا گورنر جنرل صدر کھلانے لگا۔ اردو کے علاوہ ہنگامہ کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا گیا۔

۲۰ اگست ۱۹۵۶ء

مشرقی پاکستان میں ”ایس پی ٹی“ کی حکومت کو جو گزشتہ چودہ مہینوں سے اسمبلی کا سامنا کیے بغیر برسرِ اقتدار چلی آ رہی تھی، مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کی جگہ عوامی لیگ نے ایک ہندو پسند جمعی کے داس اور ان کی پارٹی کی اعانت سے حکومت قائم کر لی۔ مشرعیات ارحمن اس کے وزیر اعلیٰ بنے۔

۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء

مرکز میں چودھری محمد علی کی جگہ جنہوں نے ستمبر کو استعفیٰ دے دیا تھا، حسین شہید سہروردی نے حکومت بنگال لی۔ ان کو ”ری پبلکن پارٹی“ کی حمایت حاصل تھی جو اسکندر مرزا کے ایماء پر قائم کی گئی تھی۔

۳۰ جون ۱۹۵۷ء

عوامی لیگ کے صوبائی سربراہ مولانا بھاشانی نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ مشرعیات ارحمن نے اس کے خلاف ان کا الزام یہ تھا کہ وہ

مشرقی پاکستان سے ترجیحی سلوک کرتے ہیں اور انہوں نے نرسوز کے مسئلہ میں جماعتی منشور کے خلاف ”سامراجیوں“ کی حمایت کی ہے۔

۲۲ جولائی ۱۹۵۷ء

مولانا بھاشانی نے ”چیمپین“ کی طرف واضح ذہنی جھکاؤ رکھتے تھے، ”نیشنل عوامی پارٹی“ کے نام سے اپنی علمی جماعت قائم کر لی۔ یہ جماعت ”لاڈینی سیاست“ (SECULAR) میں اعتقاد رکھتی تھی مگر ”عوامی لیگ“ کے برعکس اس کو زیادہ ترجیحیت نہیں بازو کے عناصر سے حاصل تھی۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۵۷ء

”ری پبلکن پارٹی“ کی حمایت سے محروم ہونے پر حسین شہید سہروردی مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ مشرعیات ارحمن نے چند دیگر وزیر عظم بننے کے ارکان کو بھی دو ماہ کے اندر اندر مستعفی ہونا پڑا اور دسمبر میں ملک فیروز خان نون وزارت عظمیٰ بن گئے۔

۱۸ جون ۱۹۵۸ء

عوامی لیگ کی مخلوط حکومت مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں شکست کھا گئی۔ مشرعیات ارحمن مستعفی ہو گئے۔ دو دن بعد کے ایس پی نے وزارت بنائی جو جنرل تین روز چل سکی۔ صوبے میں ایک مرتبہ ”گورنر راج“ نافذ کر دیا گیا۔

۲۶ اگست ۱۹۵۸ء

”گورنر راج“ ختم کر دیا گیا۔ عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں پھر حکومت قائم کر لی۔

۲۱ ستمبر ۱۹۵۸ء

مشرقی پاکستان کی اسمبلی کے اجلاس میں ”اسپیکر“ کی جانبداری کے مسئلے پر ہنگامہ ہو گیا۔ کئی ارکان شدید زخمی ہوئے۔ ڈپٹی اسپیکر مشرعیات ارحمن جان سے مارے گئے۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء

جنرل محمد ایوب خان کی حمایت سے صدر اسکندر مرزا نے آئین معطل کر دیا۔ اسمبلی توڑ دی اور ملک میں ”باشل لاء“ نافذ کر دیا۔ جنرل ایوب خان کو ”چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر“ مقرر کیا گیا۔ اس انقلاب نے بنگالیوں کی سیاسی حق طلبی کی آہنگ پر ”مطر“ لگا دی۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء

جنرل ایوب خان نے اسکندر مرزا کو برطرف کر کے لندن بھیج دیا اور خود ”فیڈل مارشل“ کا رینگ اختیار کر کے تمام اختیار سنبھال لیے۔ مشرقی پاکستان پر وہ اپنی مرضی کے گورنروں کے ذریعے حکومت کرنے لگے۔ مسلح افواج میں چونکہ بنگالیوں کی نمائندگی بہت کم تھی اس لیے وہ محسوس کرنے لگے کہ فوجی انقلاب آنے سے وہ ہمیشہ کے لیے سیاسی اقتدار سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس احساس سے ان کے اندر محدودی یاس اور نفرت کے جذبات بھنگنے لگے۔ مارشل لاء کی سختی نے انہیں کچلنے کی کوشش کی تو اس سے صوبائیت کے جذبے کو اور بڑھانے لگی۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۵۹ء

ایوب خان نے ”بنیادی جمہوریتوں“ کا نظام نافذ کر دیا۔ یہ نظم و نسق کی اعانت کے لیے مقامی اداروں پر مشتمل ایک نیا نظام تھا۔ ملک کے صدر اور اسمبلی کے ارکان کو منتخب کرنے کا اختیار بھی بہت جلد انہی بنیادی اداروں کے اسی ہزار ارکان کو تفویض کر دیا گیا۔ بنگالیوں

نے سمجھا کہ اس بار ایک پروسے میں دراصل ایک فرد و احد کی حکومت کو مستقل کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے مغربی پاکستان کے لوگوں کی بھاری اکثریت نے بھی اسے ناپسند کیا۔

۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء

ایوب خان نے "نیادی جمہوریوں" کے اسی ہزار ارکان سے اعتماد کا ووٹ طلب کیا تو ان میں سے پچتر ہزار ووٹ اس کی رائے نے صدارت کے منصب کے لیے ان کی توثیق کر دی اور دوز بعد فیڈ مارشل ایوب خان نے پاکستان کے پہلے "منتخب" صدر کی حیثیت سے اپنے منصب کا حلف اٹھایا۔

اپریل ۱۹۶۰ء

یونیٹڈ جنرل عظم خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے بنگالیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت سے کام کیا مگر اس پر وہ خود ایوب خان کی حمایت سے محروم ہو گئے اور ان کو استعفیٰ دینا پڑا۔

۸ جون ۱۹۶۲ء

ایوب خان نے اپنی طرف سے ایک آئین ملک میں نافذ کر دیا جس میں صدارتی طرز حکومت کو بھی اپنایا گیا۔ صدر کے لیے انتخاب کی بنیاد "نیادی جمہوریت" کے ارکان تھے۔ اس دستور میں بھی ۱۹۵۹ء والے آئین کی طرح دونوں صوبوں کے درمیان برابری (PARITY) کا اصول رکھا گیا۔ یہ آئین مجموعی طور پر قبول عام حاصل نہ کر سکا۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء

بنگلہ کے رہنے والے مشرعوں نے مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا جو ایوب خان کے زوال (۱۹۶۹ء) تک اس منصب پر فائز رہے۔ ایوب خان سے ان کی انتہائی وفاداری کی وجہ سے وہ بنگالیوں میں غیر مقبول ہو گئے۔ کفر بنگالی انہیں "بجائیوں" کہتے تھے۔ یونیٹڈ کے طلبہ نے ان کے ہاتھ سے اساتذہ سے لے کر انکار کر دیا تھا۔

۲۹ مئی ۱۹۶۳ء

فیصل اسمبلی کے ایک بنگالی رکن نے ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کی قیمت پر ترقی دی جا رہی ہے۔ پچھلے پندرہ برسوں میں کم درآمدات اور زیادہ برآمدات کی صورت میں مشرقی پاکستان کو اس کے گڑھے پسینے کے ایک سو کروڑ روپیہ سے محروم کیا گیا اور جناب والا اس کو صرف کر کے مغربی پاکستان کو ترقی دی گئی اور اس کی زرعی اراضی میں کئی لاکھ ایکڑ کا اضافہ کیا گیا۔ اب یہ بڑے لوگ بڑی اونچی باتیں کرتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کو اس کے حال پر رہنے دو۔ ہم اپنا گزارہ خود کر سکتے ہیں۔ اب بولیوں سال جا رہا ہے۔ مغربی پاکستان کی تعمیر کے لیے ہمیں دیوالیہ کر دیا گیا ہے۔۔۔۔۔ ہم سے کہا جاتا ہے۔ چھو کرو مکمل جاؤ ہمارے پاس تمہارے واسطے کچھ نہیں ہے۔ ہمیں تنہا ہی ضرورت نہیں ہے۔"

۲ جنوری ۱۹۶۴ء

صدارتی انتخابات منعقد ہوئے۔ قائد اعظم کی ہمشیرہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کا مقابلہ کیا۔ حزب مخالف کی تمام جماعتوں نے ان کی حمایت کی۔ بنگالیوں نے بھی ان کی حمایت میں غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ ان کے خیال میں ایک ڈکٹیٹر کو بھاری سیاسی حقوق بحال کرنے کا یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اگرچہ اس الیکشن میں ایوب خان نے "نیادی جمہوریت" کے اسی ہزار ارکان کی اکثریت کے ووٹ حاصل کر لیے مگر ڈھاکہ میں جو مشرقی پاکستان کی سیاست کا مرکز سمجھا جاتا تھا وہ اس جناح سے ہار گئے۔

۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

ہندوستان اور پاکستان کے مابین ایک سربمچھڑک شیعہ ریجنگ چھڑکئی یہ معاملہ جہاں مغربی پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا وہاں مشرقی پاکستان میں اس کو عوامی طور پر دروازہ کا مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ بھاری قضائے کے حیثیت پر اسے جب کبھی ڈھاکہ پر منڈلانے آ جاتے تو بنگالیوں کے دلوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھ جاتا۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے معقول تعداد میں فوج "ایر فورس اور نیوی" نہیں رکھی گئی تھی۔ یہی ڈھنڈورا پیٹا جاتا رہا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا۔

۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء

ایوب خان نے اعلان تاشقند پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدے میں دونوں ملکوں کی افواج کی مقبوضہ علاقوں سے واپسی بھی شامل تھی۔ مغربی پاکستان کے لوگ جو یہ سمجھتے تھے کہ جنگ میں ہماری جیت ہوئی ہے اس پر سخت برہم ہوئے۔ انہوں نے اس معاہدے کو قومی وقار کی سوا بازی پر محمول کیا۔ اس سے ایوب خان کی ساکھ کو شدید دھچکا لگا۔

۶ فروری ۱۹۶۶ء

شیخ مجیب الرحمن نے لاہور میں اپنے شعور چھڑکات کا اعلان کیا۔ چھڑکات میں بنیادی طور پر ایک ایسے سیاسی بندوبست کی وکالت کی گئی تھی جس میں مرکزی حکومت محصولات کے بغیر امور خارجہ اور امور دفاع کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ مجیب نے اپنے پروگرام کو "صوبائی خود مختاری" کے حوالے سے پیش کیا، جبکہ مغربی پاکستان کے لوگوں نے اسے علمدگی کی تحریک سمجھا۔

۲۶ اپریل ۱۹۶۶ء

فیملہ مارشل ایوب خان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے استعفیٰ دے دیا۔ اگلے دسمبر میں انہوں نے "پاکستان پیپلز پارٹی" کے نام سے اپنی سیاسی پارٹی قائم کر لی۔

۲۰ جنوری ۱۹۶۸ء

"اگر تہذیب سازش کا انکشاف کیا گیا اس سازش میں شیخ مجیب الرحمن کے علاوہ ۲۲ دوسرے بنگالیوں کو بھی اس الزام میں ماخوذ کیا گیا کہ وہ ہندوستان کی ملی شجکت سے مشرقی پاکستان کی حلقہ کی اور ایک "آزاد بنگال" کے قیام کی کوشش کر رہے تھے۔ جولائی ۱۹۶۸ء میں جب ڈھاکہ میں مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو بنگالیوں کا رد عمل قطعاً مختلف تھا۔ مذہبی، مجیب کو غدار کے رنگ میں پیش کر رہے تھے مگر بنگالی اسے ہیرو کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ اس مقدمے کے طفیل مجیب کی مقبولیت کو (دوبلے) چار چاند لگ گئے۔ ایسی مقبولیت وہ شاید کبھی کسی اور ذہین سے حاصل کر سکتے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء

ایوب خان شدید علیل ہو گئے۔ سیاسی طور پر وہ معاہدہ تاشقند سے کمزور ہو چکے تھے۔ اب عدالت نے ان کو جسمانی طور پر بھی کھوکھلا کر دیا۔ جانشینی کے عوامل بھی سیاسی اور فوجی دونوں حلقوں میں، قتال ہوئے گئے۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۸ء

۱۹۵۸ء کے انقلاب کی دہائیوں ساگرہ کی تقریبات جو سال بھر سے منائی جا رہی تھیں اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئیں۔ جس بھدے انداز سے حکومت کے کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹا گیا اور جس عسائیہ طریقے سے اقتصادی ترقی کی تشریح کی گئی اس سے لوگوں میں اپنی اقتصاد کی مشکلات کا احساس کچھ اور بڑھ گیا۔ لوگوں کے دلوں میں ایوب خان کے خلاف سیوا ہوا۔ بڑے جاگ پڑا۔ اس کے علاوہ ان کے متعلق یہ تاثر عام تھا کہ ان کے اہل خاندان نے ان کے دور اقتدار میں ناجائز ذرائع سے بے شمار دولت جمع کر لی تھی۔

# چھ نکات

چھ نکاتی فارمولے کا متن اور ترمیمات بمطابق منشور عوامی لیگ

## پہلا نکتہ

**اصل**  
دستور میں قرار دیا ہوا کہ بنیاد پر پارلیمانی طرز حکومت کے مطابق پاکستان کا ایک ایسا وفاق قائم کیا جائے جس میں بالغ راتے دہی کے اصول پر براہ راست منتخب شدہ مجلس قانون ساز کو بالاکرستی حاصل ہو۔

## ترمیم شدہ

طرز حکومت وفاق اور پارلیمانی ہوگا۔ وفاق کی مجلس قانون ساز اور وفاق میں شامل "یونٹوں" کی مجلس قانون ساز کو عام بالغ حق رائے دہی کے اصول پر براہ راست منتخب کیا جائے گا۔ وفاق کی مجلس قانون ساز میں نمائندگی کا تناسب زبان کی بنیاد پر ہوگا۔

## دوسرا نکتہ

**اصل**  
وفاق حکومت صرف دفاع اور امور خارجہ کے شعبوں کا انتظام کرے گی، باقی تمام شعبے وفاق میں شامل ریاستوں کے تحت ہوں گے۔

## ترمیم شدہ

وفاق حکومت صرف دفاع اور امور خارجہ کے شعبوں کی ذمہ دار ہوگی۔ اس کے علاوہ درج ذیل (نکتہ سوئم) کی شرائط کے ساتھ کرنی بھی اس کے سپرد ہوگی۔

## تیسرا نکتہ

(۱) دونوں بازوؤں میں کرنسی کا الگ الگ نظام رائج کیا جائے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دونوں بازوؤں میں اس کے آزادانہ تبادلے کا اہتمام ہوگا۔

## یا

(۲) پورے ملک کے لیے کرنسی کا ایک ہی نظام رہنے دیا جائے مگر اس صورت میں ایسے آئینی تحفظات کا بندوبست کیا جائے جن کے تحت مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو سرمایہ کی آزادانہ منتقلی کو روکا جاسکے بہرہ صوبہ علیحدہ علیحدہ بینک سرمایہ محفوظ رکھ کے اور مشرقی پاکستان کے لیے الگ بجٹ اور الگ مالیاتی نظام اختیار کیا جائے۔

۶ نومبر ۱۹۶۸ء

راولپنڈی میں ایک طالب علم پولیس کی گولی سے ہلاک ہو گیا۔ اس سانحے نے فیڈرل رائل ایوب خان کے خلاف مظاہروں کے سلسلے میں جتنی پرتیل کا کام کیا۔ طلبہ کو اپنے مطالبات کی کاربراری کے لیے مشرذوالفقار علی بھٹو کی ذات میں ایک قائد مل گیا جو تحریک کو بالآخر اس نکتے تک لے گیا کہ ایوب خان کے لیے اقتدار بحال رکھنا مشکل ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے ایوب خان کے خلاف محاذ آرائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ بھتے بھتے کے آمر کے زوال سے ان کی سیاسی منزل کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔

۱۵ جنوری ۱۹۶۹ء

"اگر تدارک نہیں کیں" کے ایک مضمون سارجنٹ ظہورالحی کو جب وہ ڈھاکہ چھاؤنی میں فوج کے زیر حراست تھا گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جنگالیوں نے اس واقعہ کو اپنے ایک "ہیرہ وکے" کے ذریعہ نقل کا رنگ دیا اور حکومت نے اسے بھاگنے کی ناکام کوشش کا نتیجہ ٹھہرایا۔ اس واقعے سے نہ صرف ایوب خان بلکہ مغربی پاکستان کے خلاف بھی غم و غصے کا طوفان اُٹھ آیا۔

۱۵ مارچ ۱۹۶۹ء

فیڈرل رائل ایوب خان نے لیڈروں سے مذاکرات کے لیے راولپنڈی میں ایک "گول میز کانفرنس" بلوائی مقصود یہ تھا کہ مخالفت جماعتوں کے بڑے بڑے مطالبات مان لینے سے گلی کوچوں میں پھیرے ہوئے لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے۔ مغربی پاکستان کے بعض رہنماؤں نے اس بات پر اصرار کیا کہ عجیب کو رہا کیا جائے، تاکہ وہ جیل سے نکل کر ان مذاکرات میں شریک ہو سکے۔ اس سیاسی دباؤ کے پیش نظر "اگر تدارک سازش" کا مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ عجیب نے ۱۰ مارچ کو ڈھاکہ میں لوگوں کے ایک عظیم ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ دونوں صوبوں میں مساوات (PARITY) کا اصول اب مشرقی پاکستان کے لیے ناقابل قبول ہے۔ اب مشرقی پاکستان کو آبادی (۴۵ فیصد) کے لحاظ سے نمائندگی ملنی چاہیے۔ عجیب الرحمان ڈھاکہ میں یہ اعلان کر کے راولپنڈی آئے اور کانفرنس میں شریک ہوئے، مگر یہ تحریر کارآمد ثابت نہ ہوا۔

۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء

فیڈرل رائل ایوب خان نے حکومت کی باگ ڈور فوج کے سربراہ جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے سپرد کر دی۔ یحییٰ خان نے ملک میں رائل نافذ کر دیا۔ ۲۲ گھنٹوں کے اندر اندر گلی کوچوں کا بیجان ختم ہو گیا۔ سکون لوٹ آیا۔

۲۶ مارچ ۱۹۶۹ء

چیت مارشل لا لایڈنر طرز جنرل یحییٰ خان نے قوم کے نام اپنے پٹری لٹری خطاب میں جمہوریت بحال کرنے اور اقتدار لوگوں کے منتخب نمائندوں کو منتقل کرنے کا وعدہ کیا۔

۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء

جنرل یحییٰ خان نے "ایک آدمی ایک ووٹ" کے اصول کو تسلیم کر لیا۔ یہ اقدام عجیب کے حق میں تھا، مگر اس پر مغربی پاکستان کے لوگ ناخوش تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ اس صورت میں جنگالیوں کو غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ جنرل یحییٰ خان نے ون یونٹ کو بھی توڑ کر پرانے چاروں صوبوں کو بحال کر دیا۔

یکم جنوری ۱۹۷۰ء

پہلے عام انتخابات کی تیاری کے لیے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی۔ انتخابات سال کے آخری حصے میں منعقد ہونا تھے۔

## ترمیم شدہ

دو علمدہ علمدہ "کرنیاں" رائج کی جائیں گی جن کا ہریاز و اور ہریجن میں آزادانہ تبادلہ ممکن ہوگا یا متبادل صورت میں "کرنسی" کا ایک ہی نظام رہنے دیا جائے لیکن اس کے لیے پیر "وفاقی محفوظات" کا ایک ایسا دستور العمل نافذ کیا جائے جس کے تحت "علاقائی فیڈرل ریزرو بینک" (REGIONAL FEDERAL RESERVE BANKS) قائم کیے جاسکیں جو ایک "ریجن" سے دوسرے "ریجن" میں وسائل اور سرمایہ کی آزادانہ منتقلی کی روک تھام کے اقدامات کرنے کے مجاز ہوں۔

## اصل

### چوتھا نکتہ

محصولات کے نفاذ اور وصولی کا اختیار "وفاقی یونٹوں" کے پاس ہوگا اور "وفاقی مرکز" کو اس قسم کا کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا۔ اخراجات کے لیے "وفاقی گورنریاست کے محصولات کا ایک حصہ دیا جائے گا۔" "وفاقی کے مجموعی فنڈ" کی رقم ریاست کے مختلف محصولات میں سے ایک خاص شرح کے مطابق وضع کر کے مینا کی جائے گی۔

## ترمیم شدہ

مالیاتی حکمت عملی "وفاقی یونٹوں کے تحت ہوگی۔" "وفاقی" کو دفاع اور امور خارجہ کے اخراجات کے لیے حصول سرمایہ کے ضروری وسائل مینا کیے جائیں گے۔ "وفاقی حکومت" ان وسائل کے تصرف و استعمال کے طریقہ کار اور تناسب وغیرہ کے ضمن میں ان ضوابط کو ملحوظ رکھے گی جن کی صراحت آئین میں کر دی جائے گی۔

## اصل

### پانچواں نکتہ

- (۱) دونوں بازوؤں کے لیے زرمبادلہ کا حساب رکھنے کے لیے علمدہ علمدہ کھاتے رکھے جائیں گے۔
- (۲) مشرقی پاکستان کی آمدنی مشرقی پاکستان کی حکومت کے اختیار میں ہوگی اور مغربی پاکستان کی آمدنی مغربی پاکستان کی حکومت کے اختیار میں ہوگی۔
- (۳) "وفاقی کے زرمبادلہ کی ضروریات" دونوں بازو پوری کریں گے۔ مساوی طور پر یا کسی طے شدہ تناسب کے مطابق۔
- (۴) مقامی مصنوعات کو ایک بازو سے دوسرے بازو میں لانے پر کوئی محصول نہیں لگایا جائے گا۔
- (۵) آئین کی رو سے یونٹوں کی حکومتیں اس امر کی مجاز ہوں گی کہ وہ بیرونی ممالک سے اپنے تجارتی روابط اور ان میں اپنے تجارتی ترش قائم کر سکیں اور ان سے معاہدے کر سکیں۔

## ترمیم شدہ

آئین میں ہر وفاقی یونٹ کو اپنے زرمبادلہ کی آمدنی کا علمدہ حساب کتاب رکھنے اور اس کو اپنے تصرف میں رکھنے کا اختیار دیا جائے گا۔ "وفاقی کے زرمبادلہ کی ضروریات" "وفاقی یونٹوں" کی حکومتیں اس تناسب اور اس طریقہ کار کے مطابق مینا کریں گی جس کی صراحت آئین میں موجود ہوگی۔ علاقائی حکومتوں کو تجارت اور امداد کے لیے بیرونی ممالک سے مذاکرات کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس میں ان کو بہر حال ملک کی خارجہ پالیسی کے دائرے میں رہنا ہوگا جس کا تعلق کرنا وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔

## چھٹا نکتہ

## اصل

مشرق پاکستان کے لیے ایک نیم عسکری تنظیم کا قیام (میشیا)

## ترمیم شدہ

"وفاقی یونٹوں کی حکومتوں کو قومی سلامتی میں موثر کردار ادا کرنے کی غرض سے "میشیا" یا نیم عسکری طرز کی تنظیمات قائم کرنے کا اختیار ہوگا۔

# آپریشن مسیح لائٹ

## منصوبہ بندی کی اساس

- (۱) عوامی لیگ کی سرگرمیوں اور زور عمل کو بندوق سمجھا جائے اور ان کے مددگار عناصر کو نیز ان کو گول کو جو مائشل لاء کی خلاف ورزی کریں "مخالفت عناصر" تصور کیا جائے۔
- (۲) فوج میں مشرقی پاکستان کے عناصر کے اندر عوامی لیگ کی وسیع حمایت پائی جاتی ہے، لہذا کارروائی انتہائی ہوشیاری کے ساتھ اچانک اور خفیہ طریقے سے کی جائے اور دہشت انگیزی کے عناصر کو ملحوظ رکھا جائے۔

## کامیابی کی بنیادی شرائط

- (۳) تمام منصوبے میں بیک وقت کارروائی کی جائے۔
- (۴) سیاسی قائدین اور اسٹوڈنٹ لیڈروں نیز اساتذہ اور ثقافتی تنظیموں کے انتہا پسند عناصر کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں گرفتار کیا جائے، ابتدائی مرحلے میں چوٹی کے سیاسی قائدین اور اسٹوڈنٹ لیڈروں کو لازماً پکڑ لیا جائے۔
- (۵) ڈھاکہ میں فوجی کارروائی کی مکمل کامیابی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی کو اپنے قابو میں لے کر اس کی پوری پوری تلاشی لینا ہوگی۔
- (۶) چھاننیوں کی حفاظت کا پورا پورا بندوبست کیا جائے جو لوگ چھاؤنیوں پر حملہ کرنے کی جرات کریں، ان پر گولیوں کی شدید بارش کی جائے۔
- (۷) تمام اندرونی اور بین الاقوامی ذرائع مواصلات کاٹ دیے جائیں۔ بیرونی تفضل خاؤں کے ٹیلیفون ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی پرنٹر سرورس اور ٹرانسمیٹر وغیرہ کے رابطے منقطع کر دیے جائیں۔
- (۸) بارود کے ذخیروں اور اسلحہ گھروں پر مغربی پاکستان کے فوجیوں کا پہرہ لگا کر مشرقی پاکستان کی نفری کو غیر موثر بنا دیا جائے۔
- (۹) "پاکستان ایئر فورس" "سیٹ پاکستان رائفلز" کے بارے میں بھی ہی طرز عمل اختیار کیا جائے۔



## ناگمانیت اور فریب

(۹) بالائی سطح پر

صدر سے درخواست کی جائے کہ وہ مذاکرات کو جاری رکھیں اور بے شک مجیب کو دھوکا دینے کے لیے ہی یہ تازہ دہن کو سرٹیفکیٹ مائیں دینا نہ مائیں وہ ۲۵ مارچ کو عوامی لیگ کے مطالبات کی منظوری کا اعلان کر دیں گے۔  
(۱۰) تدبیراتی سطح

(الف) اخلاقی اہمیت کے پیش نظر ابتدائی مرحلے میں اس منصوبے کے ضمن میں مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کے لیے فوج کی ذہنی تفریح استعمال کی جائے جو پہلے سے شہر میں موجود ہے۔  
(ب) مجیب کے گھر میں داخل ہو کر گھر میں موجود سب افراد کو گرفتار کیا جائے۔ یاد رہے مکان پر کڑا سپرہ رہتا ہے اور سخت دفاعی انتظامات کیے گئے ہیں۔  
(ج) یونیورسٹی کے اہم ہوشوں کا محاصرہ۔ مثلاً اقبال ہال (ڈاکٹر یونیورسٹی) اور لیاقت ہال (انجینئرنگ یونیورسٹی)۔  
(د) ٹیل فون ایجنسین بند۔  
(۱۲) جن گھروں میں اسلحہ وغیرہ کے ذخیروں کی اطلاعات ملی ہیں ان کے بیرونی رابطے منقطع۔

(ج) چھوٹی میں فوج کی نقل و حرکت ٹیلیفون رابطے تمام ہونے کے بعد شروع کی جائے گی، پہلے نہیں۔  
(چ) رات کے دس بجے کے بعد کسی شخص کو چھوٹی کے باہر نہ جانے دیا جائے۔  
(ث) کسی نہ کسی بہانے شہر کے مندرجہ ذیل مقامات کے فوج میں اضافہ کیا جائے؛  
ایوان صدر، گورنر ہاؤس، ایم این اے ہوسٹل، ریڈیو اسٹیشن، ٹیلی ویژن اسٹیشن اور ٹیلیفون ایجنسین۔  
(ج) مجیب کے گھر پر کارروائی کرنے کے سلسلے میں سولین گاڑیاں استعمال کی جائیں۔

## ترتیب اقدامات

(الف) آغاز کار : ایک بجے شب۔  
(ب) فوجی نقل و حرکت کے اوقات :  
(۱) کمانڈو کی ایک پلاٹون۔ مجیب کے گھر۔ ایک بجے شب۔  
(۲) ٹیلیفون کے ”مرکز مواصلات“ کا انقطاع۔ رات بارہ بجکر ۵۵ منٹ پر۔  
(۳) یونیورسٹی کا محاصرہ کرنے والی فوجی۔ رات ایک بجکر ۵ منٹ پر۔  
(۴) پولیس تحفہ راجہ رابع کے ہیڈ کوارٹر اور دوسرے تحفوں کی طرف روانگی۔ رات کے تقریباً ایک بجکر ۵ منٹ پر۔  
(۵) رات کے ایک بجکر ۵ منٹ پر مندرجہ ذیل مقامات کا محاصرہ کر لیا جائے گا؛  
مسماۃ انوار، بیگم کا گھر۔ مکان نمبر ۱۴، سڑک نمبر ۲۹

(۶) کر فیو کا نفاذ۔ رات کے ایک بجکر ۵ منٹ سے ”سائرن“ اور ”لاؤڈ اسپیکر“ کے ذریعے ابتدائی معاہداتیں گھنٹے۔ ابتدائی مرحلے میں ”راہ داری“ کے لیے پروانے (پاس) جاری نہیں کیے جائیں گے البتہ جنگی اور انتظامی قلعہ کے سنگین حملے کے واقعات پر مناسب طور کیا جائے گا متعلقین کی درخواست پر پولیس کی نقل و حرکت کا انتظام فوج کرے گی۔ یہ اعلان بھی کر دیا جائے گا تاکہ شہر کی کوئی اخبار شائع نہیں ہوگا۔  
(۷) جن فوجی دستوں کو مخصوص مشن تفویض کیے گئے ہیں وہ ایک بجکر ۵ منٹ پر اپنے اپنے سیکٹر کی طرف نکل پڑیں گے۔ (نفری کو چوس کرنے کا لاٹھ مار لیا جائے، ہوشوں پر قبضہ کر کے ان کی تلاشی لی جائے۔)  
(۸) یونیورسٹی کے علاقہ کی طرف روانگی۔ صبح کے پانچ بجے۔  
(۹) زمینی اور آبی رکاوٹیں رات کے دو بجے قائم کر دی جائیں گی۔

## دن کے وقت اقدامات

(۱) دھان منڈی کے علاقہ کے مشتبہ مکانات کی خانہ بہ خانہ تلاشی پُرانے شہر کے اندر ہندوؤں کے گھروں کی بھی تلاشی (ضروری معلومات انٹیلی جنس کا شعبہ جمع کرے گا)  
(۲) تمام چھاپے خانے بند کر دیے جائیں گے۔ یونیورسٹی کالوں ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے محکمہ فزیکل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ اور میکینیکل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ۔ ان تمام مقامات کی سائیکلو ٹائل مشینیں ضبط کر لی جائیں گی۔  
(۳) کر فیو کی بندش سخت کر دی جائے گی۔  
(۴) دوسرے لیڈروں کو بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔

## فرائض اور وسائل

(۱۲) تفصیلات بریگیڈ بریگاڈر کے گارڈن کا ذکر آگے آئے گا، لیکن مندرجہ ذیل اقدامات لازماً کیے جائیں گے؛  
(الف) (مشرقی، بنگالی یونٹوں) جن میں گنل اور دوسرے انتظامی یونٹ بھی شامل ہوں گے، کے اسلحہ خازنوں پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ اسلحہ صرف مغربی پاکستان کی فوجی کو دیا جائے گا۔

## وضاحت

ہم مشرقی پاکستان کے سپاہیوں کو کوئی ایسا فرض نہیں سونپنا چاہتے تھے جس پر عمل کرنا ان کو ناگوار گزرتا۔  
(ب) پولیس کے تحفوں سے اسلحہ لے لیا جائے گا۔  
(چ) ایسٹ پاکستان رائفلز کے ڈائریکٹر جنرل اسلحہ خازن کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔  
(د) ”انصار“ کی رائفلیں جمع کر لی جائیں گی۔

## مطلوبہ معلومات

(الف) مندرجہ ذیل افراد کا اتہ پتہ :

شیخ محیب: نذر الاسلام، تاج الدین، عثمانی، سراج الاسلام، عثمان، عطاء الرحمن، پروفیسر مظفر علی احمد، بیگم موتیا چوہدری، پریٹر نوڈ فیض الحق، بغیل، این اے صدیقی، رؤف، یحیٰ (اور دوسرے طالب علم لیڈر)

(ب) تمام تھانوں اور "رائفلز" کا محل وقوع۔

(پ) شہر کے ایسے تمام مقامات کا محل وقوع جہاں اسلحہ ذخیرہ کیا گیا ہو یا جن کو عسکری لحاظ سے مستحکم کیا گیا ہو۔

(ج) تربیتی کیمپوں اور تربیتی علاقوں کا محل وقوع۔

(ج) ان ثقافتی مراکز کا محل وقوع جن کو فوجی تربیت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

(ح) ان سابق فوجی اضداد کے نام جو باغیانہ سرگرمیوں کی اعانت کر رہے ہوں۔

### قیادت اور نظامت

(۱۴)

(الف) علاقہ ڈھاکہ

کمانڈر : میجر جنرل فرمان  
ٹاٹ : ایسٹرن کمانڈر کاٹاٹ یا مارشل لاء ہیڈ کوارٹر کاٹاٹ  
جمعیت : ڈھاکہ میں موجود نفزی

(ب) بقیہ صوبہ

کمانڈر : میجر جنرل خادم حسین راجہ  
ٹاٹ : ہیڈ کوارٹر ۱۴ ڈویژن  
جمعیت : ڈھاکہ کے سوا باقی نفزی

### چھاؤنی کا تحفظ

(۱۵)

پہلا مرحلہ - تمام اسلحہ پاکستان ایئر فورس سمیت، جمع کر لیا جائے۔

### مواصلات

(۱۶)

(الف) حفاظت (ب) ترتیب و تنظیم

### تقسیم وسائل و تقسیم کار

میجر جنرل فرمان مارشل لاء ہیڈ کوارٹر "بی" کے کمانڈ کنٹرول میں ہوں گے۔  
"ٹروپس":

۵۶ بریگیڈ (ڈھاکہ میں تین نفزی)، ۸۰ پنجاب - ۲۲ پنجاب، جنرل ٹاٹ آفیسر گریڈ I (نیشنل جنس)، لیفٹیننٹ کرنل تاج کو

کمانڈنگ آفیسر بنایا جائے۔ ۲۲ بلوچ - ۱۳ فرنٹیئر فورس - ۳۱ فیلڈ رجمنٹ (توپ خانہ) - ۱۳ لائٹ ایک ایک رجمنٹ (توپ خانے کا ٹیپارہ مارغصہ) - نمبر ۳ کمانڈوز کی ایک کپنی (کونیلا سے)

### فرائض

(۱) ایسٹ پاکستان رائفلز کے ہیڈ کوارٹر، ایسٹ بنگال رجمنٹ کی دوسری اور دسویں بٹالین (۲۵۰۰) اور راجہ باغ میں پولیس ریزرو (۱۰۰۰۰) سے ہتھیار لے کر ان کو غیر موثر بنانا۔

(۲) ٹیلیفون آپریشن اور ٹرانسمیٹر ریڈیو ٹیلیوژن، سیٹنگ بنک کا تحفظ۔

(۳) عوامی لیگ کے لیڈروں کی گرفتاری - مفصل فہرست اور پتے۔

(۴) یونیورسٹی کے ہاسٹل - اقبال ہال، بگن ناتھ ہال، لیاقت ہال (انجینئرنگ یونیورسٹی)

(۵) شہر کی ناکہ بندی - سڑک، ریل اور دریا - دیاؤں میں گشت۔

(۶) آرڈی منس ٹیڈی غازی پور اور ایمونیشن ڈپو راجندرہ پور کی حفاظت۔

صوبائی دارالحکومت (ڈھاکہ) کے علاوہ باقی سارا علاقہ میجر جنرل کے ایجنٹ راجہ اور ہیڈ کوارٹر نمبر ۱۴ ڈویژن کے تحت ہوگا۔

### جیسور

نفزی:

ہیڈ کوارٹر ۱۰۶ بریگیڈ یعنی ۲۵ بلوچ - ۲۶ بلوچ - ۲۴ فیلڈ رجمنٹ کے اجزاء اور ۵۵ فیلڈ رجمنٹ۔

### فرائض

(۱) ایسٹ بنگال اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے "سیکٹر ہیڈ کوارٹر"، "ریزرو پولس" اور "انصار" کو غیر متلج کرنا۔

(۲) جیسور شہر کا تحفظ - عوامی لیگ کے لیڈروں اور طالب علم رہنماؤں کی گرفتاری۔

(۳) ٹیلیفون آپریشن اور اس کے نظم کا تحفظ۔

(۴) چھاؤنی کے گرد اگر دخلاتی حاشیہ جیسور قصبہ اور ہیڈ کمان روڈ - جیسور کا ہوائی اڈہ۔

(۵) کشتی کے ٹیلیفون آپریشن کو ناکارہ کرنا۔

(۶) اگر ضرورت ہو تو کھن کو کھن دینا۔

### کھن

نفزی

۲۲ فرنٹیئر فورس

### فرائض

(۱) قصبہ کی حفاظت۔

(۲) ٹیلیفون آپریشن اور ریڈیو اسٹیشن کی حفاظت۔

(۳) "ایسٹ پاکستان رائفلز" کے "ویگ ہیڈ کوارٹر"، "ریزرو کپنیوں" اور "ریزرو پولس" کو غیر متلج کرنا۔

(۴) عوامی لیگ کے طالب علم لیڈروں اور اشتراکی لیڈروں کی گرفتاری۔

نفری

ہیڈ کوارٹر ۲۲ بریگیڈ - ۲۹ کیوری (رسالہ) ۲۶ فرٹیس فورس - ۲۳ فیلڈ جنٹ (ٹوپ خانہ)

منہ انض

- ۱۔ زنک پور اور سید پور کی حفاظت۔
- ۲۔ سید پور میں ۳ ایسٹ بنگال کو غیر مسلح کرنا۔
- ۳۔ اگر ممکن ہو تو دیناج پور میں سیکٹر ہیڈ کوارٹر اور ریزرو کمپنی کو غیر مسلح کرنا۔ بصورت دیگر سرحدی چوکیوں کو محکمہ ناکر ریزرو کمپنی کو غیر مسلح کرنا۔
- ۴۔ زنک پور کا ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلیفون ایجنسی کی حفاظت۔
- ۵۔ زنک پور میں عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔
- ۶۔ بوگرہ ایجنیشن کے ذخیرے کی حفاظت۔

راج شاہی

نفری

۲۵ پنجاب

منہ انض

- (۱) کمانڈنگ آفیسر شہادت بلوچ کو روانہ کر دو۔
- (۲) راج شاہی میں ٹیلیفون ایجنسی اور ریڈیو اسٹیشن کی حفاظت۔
- (۳) ریزرو پولیس اور ایسٹ پاکستان رائل فلو کے سیکٹر ہیڈ کوارٹر کو غیر مسلح کرنا۔
- (۴) راج شاہی یونیورسٹی اور بالخصوص میڈیکل کالج کا خیال رکھنا۔
- (۵) عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔

کومیلہ

نفری

۵۳ فیلڈ جنٹ (ٹوپ خانہ) ڈیڑھ ماٹر میٹری (ٹوپ خانہ) کومیلہ میں موجود نفری - تیسری کانڈوٹالین (ایک کمپنی کم)

منہ انض

- (۱) ایسٹ پاکستان رائل فلو کے ڈیڑھ ماٹر کوارٹر ۴ ایسٹ بنگال اور ضلع کی ریزرو پولیس کو غیر مسلح کرنا۔
- (۲) شہر کی حفاظت اور رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔
- (۳) ٹیلیفون کا مواصلاتی مرکز محفوظ رکھنا۔

نفری

۳۱ پنجاب (ایک کمپنی کم)

منہ انض

- (۱) ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلی فون ایجنسی کی حفاظت۔
- (۲) دربارے سرما پر "کینوٹیل" کی نگرانی۔
- (۳) فضائی مستقر۔
- (۴) عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔ سکندر سے رابطہ پیدا کرنا۔

چٹاگانگ

نفری

۲۰ بلوچ (ہراول دستے کے سوا) اور ۳۱ پنجاب کی ایک کمپنی (سلسلہ سے) بریگیڈیئر اقبال شفیق کے میلا سے بذریعہ شہر ایک دستہ لے کر رات ایک بجے تک چٹاگانگ پہنچ جائیں۔

متحرک دستہ

بریگیڈیئر اقبال شفیق - ٹیک ہیڈ کوارٹر اور مواصلاتی اجزاء کے ساتھ نمبر ۲۲ فرٹیس فورس - ۱۲۰ ملی میٹر مارٹر کا ایک ٹروپ ہمارا توپیں، انجینئروں کی ایک فیلڈ کمپنی۔ ہراول کمپنی۔ فوجی کارروائی کے مقررہ وقت پر فینی "میں۔

منہ انض

- (۱) ایسٹ بنگال جنٹیل سٹریٹ نمبر ۵ ایسٹ بنگال ایسٹ پاکستان رائل فلو کے سیکٹر ہیڈ کوارٹر اور ریزرو پولیس کو غیر مسلح کرنا۔
- (۲) پولیس کے مرکزی اسکوائر کے پرقبضہ (میں ہزار)۔
- (۳) ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلیفون ایجنسی کی حفاظت۔
- (۴) پاکستانیوں سے رابطہ (کوڈ ورمات)۔

- (۵) شنگری اور خوجہ (کمانڈنگ آفیسر ایسٹ بنگال) سے رابطہ اقبال شفیق کے پہنچنے تک وہ آپ سے احکام لیں گے۔
- (۶) لیکن اگر شنگری اور خوجہ کو اپنی نفری پر اعتماد ہو تو بنگالی عناصر سے بیگ ہتھیار لیں۔ اس صورت میں شہر اور بچاؤ کی شہر پر دفاعی پوزیشن میں ایک کمپنی رکھ کر کاوٹ ڈان کا کافی ہوگا، تاکہ اگر بعد میں ایسٹ بنگال جنٹیل سٹریٹ اور ۵ ایسٹ بنگال کی حفاظت میں خلل آئے تو ان کا دستہ باب کیا جاسکے۔
- (۷) بریگیڈیئر معیار کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ ایسٹ بنگال جنٹیل سٹریٹ کے چھٹے انٹرکٹر جو دھری کو کارروائی کی رات کو ہی گرفتار کیا جائے۔
- (۸) مذکورہ بالا کارروائی مکمل کرنے کے بعد عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کو گرفتار کر لیا جائے۔



# دستاویز سقوط

پاکستان ایٹرن کمان نے مشرقی محاذ پر ہندوستان اور بنگلہ دیش کی فوجوں کے جنرل آفیسر کمانڈنگ ایچفٹ لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوڑہ کے سامنے ہتھیار ڈالنا منظور کر لیا ہے۔ اس سپر انڈیا کا اطلاق بنگلہ دیش میں موجود پاکستان کی تمام مسلح افواج پر ہو گا جن میں پاکستان کی بڑی فضائی اور بحری افواج، نیم عسکری تنظیمات اور رسول آرڈ فورسز شامل ہیں۔ افواج کی جو نفری جس مقام پر موجود ہے اسی مقام پر لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوڑہ کی زیر کمان باقاعدہ انڈین آرمی کے قریب ترین دستوں کے سامنے ہتھیار ڈالے گی۔ اس دستاویز پر دستخط ثبت ہونے کے فوراً بعد پاکستان کی ایٹرن کمان لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوڑہ کے احکام کے تحت آجائے گی۔ دستاویز سقوط کی دفعات کے معانی یا ترجمہات میں کوئی شبہ پیدا ہونے کی صورت میں لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوڑہ کا فیصلہ آخری ہوگا۔

لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوڑہ یہ ضمانت دیتے ہیں کہ جو باہمی ہتھیار ڈالیں گے ان سے عزت و احترام کا وہی سلوک کیا جائے گا جس کے وہ جنیوا کنونشن کی دفعات کی رو سے مستحق ہیں۔ نیز پاکستان کی جو فوجی اور نیم فوجی نفری ہتھیار ڈالے گی ان کی سلامتی اور یہود کی ضمانت بھی دی جاتی ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوڑہ کی ماتحت فوج، غیر ملکی باشندوں، نسلی اقلیتوں اور مغربی پاکستان کے باشندوں کی حفاظت کریں گی۔

(دستخط)

جگجیت سنگھ اردوڑہ

لیفٹیننٹ جنرل

جنرل آفیسر کمانڈنگ ایچفٹ افواج ہندوستان

وبنگلہ دیش مشرقی محاذ میں

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء

(دستخط)

امیر عبداللہ خان نیازی

لیفٹیننٹ جنرل

مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز زون بی

اور کمانڈر ایٹرن کمانڈ پاکستان

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء